ISSN - 2582 - 3612

سہ ماہی

ساغرِ ادب

مظفرپور

پیئر ریویوڈ اُردو جرنل

مُدیر (اعزازی)

ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر

ساغرِ ادب

Vol. 2, Issue 04, Jan. to March 2020

مدیر: ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر

RNI No. BIH URD / 2019 / 78036
ISSN - 2582 - 3612

Vol. : 2 , Issue : 04
Jan. to March 2020

Quarterly

SAGHAR E ADAB

Muzaffarpur

Peer - Reviewed Urdu Journal

Editor (Honorary)

Dr. Syed Alay Zafar

ASSOCIATE PROFESSOR
UNIVERSITY Deptt. OF URDU
B.R.A. BIHAR UNIVERSITY
MUZAFFARPUR - 842 001
BIHAR (INDIA)

Edited, Printed, Published and Owned by **Kahkashan Yasmin**,
Printed at : Indian Arts offset, Basement of State Bank of India, Mahendru
Ashok Raj Path, Patna : 800 006 (Bihar) & **Published From** Husaina House,
Zakaria Colony, Mohalla - Sadpura, P.O. Ramna, Muzaffarpur - 842002 (Bihar)
Editor (Hon.) : Dr. Syed Alay Zafar   Mob. : 94300 84261

ISSN. 2582 - 3612

سہ ماہی

ساغرِ ادب مظفر پور

(پیئر ریویوڈ اُردو جرنل)

مُدیر (اعزازی)

ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر

ایسوسی ایٹ پروفیسر

پوسٹ گریجوئیٹ شعبہ اُردو

بی۔آر۔اے۔ بہار یونیورسٹی، مظفر پور

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

Quarterly

SAGHAR E ADAB Muzaffarpur

(Peer-Reviewed Urdu Journal)

جلد : ۲ شمارہ : ۴ جنوری تا مارچ ۲۰۲۰ء

مُدیر (اعزازی) : ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر مدیر : کہکشاں یاسمین

زرِ تعاون

فی شمارہ : 200 روپے ، سالانہ 800 روپے (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک)، تاحیات 10,000 روپے، دیگر ممالک 60 ڈالر

صفحات : ۲۰۸

تعداد اشاعت : ۵۰۰

سرِ ورق : سیّد آلِ محتشم ، سیّد آلِ حاشر و فائزہ ظفر

کمپوزنگ : محمد امام الدین امامؔ ، مظفر پور۔ 62061 43783

Bank Details

SAGHAR E ADAB, SB. A/c No. 3751050251

IFSC : CBIN 0284935

Central Bank of India, L.S. College Branch, Muzaffarpur (Bihar)

اس شمارے کے قلم کاروں کی آراء سے ''ساغرِ ادبُ'' کے مُدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ کسی بھی قابلِ اعتراض تحریر یا دیگر متنازعہ معاملات کی قانونی چارہ جوئی صرف مظفر پور عدالت ہی میں ہوگی۔

ترسیلِ زر، خط وکتابت و ملنے کا پتہ

The Editor

SAGHAR E ADAB

Husaina House, Zakaria Colony, Mohalla - Sadpura

P.O. - Ramna, Muzaffarpur - 842 002 (Bihar)INDIA

Mob. 94300 84261, 90062 53903

مجلسِ اِدارت

پروفیسر ابوذر عثمانی (رانچی) — پروفیسر نجم الہدیٰ (مظفرپور)

پروفیسر علیم اللہ حالی (پٹنہ) — پروفیسر فاروق احمد صدیقی (مظفرپور)

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی (بھاگلپور) — پروفیسر رئیس انور (دربھنگہ)

پروفیسر حمید سہروردی (گلبرگہ) — پروفیسر قاضی حبیب احمد (چنئی)

ڈاکٹر عامر مصطفیٰ صدیقی (ہزاری باغ) — ڈاکٹر منظر حسین (رانچی)

مجلسِ مشاورت

ڈاکٹر سیّد شاہد اقبال (گیا) — ڈاکٹر غضنفر اقبال (گلبرگہ) — ڈاکٹر جلال اصغر فریدی (مظفرپور)

ڈاکٹر محمد بہلول (دھلی) — ڈاکٹر سیّد محمد حبان الحق (مظفرپور) — ڈاکٹر احمد معراج (کولکاتا)

اس دائرے میں سُرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدّت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ اگر اگلے سال کا زرسالانہ آپ سے موصول نہیں ہوا تو یہ سمجھا جائے گا کہ آپ آگے خریدار بنے رہنا نہیں چاہتے ہیں۔

(ایڈیٹر)

ویب سائٹ

www.saghareadab.in

ای میل

saghareadab@gmail.com

syedalayzafar@gmail.com

پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر لیس **کہکشاں یاسمین** نے انڈین آرٹس آفسیٹ، بیسمنٹ آف اسٹیٹ بینک آف انڈیا، مہندرو، پٹنہ میں چھپوا کر دفتر ''ساغرِ اَدب''، حُسینا ہاؤس، زکریا کالونی محلّہ۔ سعد پورہ، پوسٹ۔ رَمنہ، مظفرپور۔842002 (بہار) انڈیا، سے شائع کیا۔

مُدیر (اعزازی) : **ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر**

ترتیب

نمبر شمار	رشحاتِ قلم	اربابِ قلم	صفحہ
	اِداریہ	ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر	۶
۱	حمد	پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی	۸
۲	نعت پاک	پروفیسر عظیم الرحمٰن	۱۰
۳	سورۂ کہف کا اعجاز	پروفیسر عبدالواسع	۱۱
۴	اُردو کے غیر مُسلم افسانہ نگار اور عورت کا تصور	پروفیسر قمر جہاں	۱۳
۵	لطیف الرحمٰن کی نسّاخ شناسی پر اِک نظر	پروفیسر نبی احمد	۲۵
۶	علیم اللہ حالی کی نظم ''ہوا سے ایک گفتگو'' کا تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر ممتاز احمد خان	۲۹
۷	اجتبیٰ رضوی	ڈاکٹر جمال اُویسی	۳۵
۸	''ساقی نامہ'' کی فنی وفکری خوبی	ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر	۴۲
۹	اَماوس میں خواب: معاصر ہندوستان کا استعارہ	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	۴۶
۱۰	عوامی ادب اور ابن صفی	ڈاکٹر مظہر کبریا	۵۹
۱۱	اُردو شاعری میں ذکر گورو ہر گوبند جی کی عظمت	ڈاکٹر ریحان حسن	۶۵
۱۲	عصر حاضر میں سرسیّد کی تحریک کی معنویت	اَستوتی اگروال	۷۳
۱۳	ساحر کی نظم ''تاج محل'' کا تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر عبدالوحید	۷۹
۱۴	غیاث احمد گدّی کی افسانہ نگاری پر طائرانہ نظر	محمد ضیاء الحق	۸۳
۱۵	اقبال کی شاعری میں منظر نگاری: ایک عمومی جائزہ	ڈاکٹر سمیع حسن	۸۷
۱۶	مولانا ابوالکلام آزاد: عبدالمنّان طرزی کے منظوم مقالے کے تناظر میں	ڈاکٹر شاہ ظل اللہ فاتح	۹۱
۱۷	اُردو فکشن اور انتظار حسین	ڈاکٹر محمد فضل الرحمٰن	۹۷
۱۸	اردو کی ادبی نثر میں اقبال کا مقام	ڈاکٹر ذاکر حسین	۱۰۰
۱۹	ظہیر غازی پوری کا انتقادی شعور ''غزل اور فن غزل'' کے حوالے سے	ڈاکٹر سیّد محمد حبان الحق	۱۰۵
۲۰	فیضؔ کی نظم ''ہم دیکھیں گے'' : ایک مطالعہ	ڈاکٹر تحسین فاطمہ	۱۰۹
۲۱	اُردو مثنوی میں نسوانی کردار کا عمومی جائزہ	ڈاکٹر دستگیر احمد	۱۱۳
۲۲	اُردو افسانے کی معتبر نسوانی آواز	ڈاکٹر تسنیم فاطمہ	۱۱۹

۲۳	عبدالغفور شہبازؔ کی رُباعیوں کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر محمد نثار عالم	۱۲۳
۲۴	فیضؔ ایک عالمی آواز	ڈاکٹر مرزا صبا عالم بیگ	۱۲۷
۲۵	اقبالؔ کے نعتیہ اشعار کی معنویت	ڈاکٹر مہ جبیں خاتون	۱۳۰
۲۶	افتخار راغبؔ کی غزل گوئی	ڈاکٹر اصغری بیگم	۱۳۳
۲۷	رشید احمد صدیقی کی تمدنی تنقید میں رعایت لفظی کا عروج	ڈاکٹر محمد عثمان انصاری	۱۳۸
۲۸	اختر اورینوی کی تنقید نگاری	ڈاکٹر محمد رضوان	۱۴۴
۲۹	کلیم الدین احمد اور عبدالمغنی (اقبالیات کے تناظر میں)۔ایک جائزہ	ڈاکٹر عابدہ ناز	۱۴۹
۳۰	مولانا ابوالکلام آزاد بحیثیت صحافی	ڈاکٹر ریحان احمد قادری	۱۵۴
۳۱	شکیلہ اختر کی افسانہ نگاری	ڈاکٹر راشدہ صدیقہ	۱۵۸

گوشۂ ریسرچ اسکالرس

۳۲	مناظر عاشق ہرگانوی کے تجربے، مشاہدے کا عصری عکس	شبنم مرزا	۱۶۲
۳۳	ادب اطفال اور روایت کی کچھ جھلکیاں	عبدالقادر	۱۶۵
۳۴	حنیف ترین کی نظم نگاری: اجمالی جائزہ	محمد شبیر عالم	۱۶۸
۳۵	عبدالمنّان طرزیؔ بحیثیت تاریخ نویس	کوثر ناز	۱۷۲
۳۶	حکیم مومن خاں مومنؔ: ایک منفرد قصیدہ نگار شاعر	محمد حنظله	۱۷۶
۳۷	مہجور شمسی کی نظم نگاری : ایک جائزہ	فیاض احمد	۱۸۰
۳۸	رضا نقوی واہی کی مزاح نگاری: اجمالی جائزہ	حنا شبنم	۱۸۴
۳۹	قومی یک جہتی اور اُردو	محمد ارشد حسین	۱۸۸
۴۰	اُردو صحافت پر ایک طائرانہ نظر	غلام مصطفےٰ	۱۹۲
۴۱	اُردو میں خط کی معنویت	بی۔ اِلہام فاطمہ	۱۹۵
۴۲	جمیل اختر شفیق کی شاعری : ایک مطالعہ	محمد امام الدین امام	۱۹۸
۴۳	''ساغرِ اَدبؔ'' کا تیسرا شمارہ، آپ کی نظر میں		۲۰۳

اِداریہ

کہئے کیسا لگا ''ساغرِ ادبؔ'' کا تیسرا شمارہ؟ یہ تنوع، یہ رنگا رنگی اور اگر آپ، خودستائی پر محمول نہ کریں اور اجازت دیں تو ہم کہیں کہ یہ بانکپن کسی ادبی مُجلّے میں بہ یک وقت یکجا نہیں ملیں گے اگر اسے غُلو قرار دیا جائے تو اتنا ضرور کہا جائے گا کہ نایاب نہیں، کمیاب ہیں۔ موضوعات فکر سے اسالیب بیان تک اہل قلم اور دانشوران ادب کی جولانیِ طبع قارئین ادب کی ضیافت طبع کے لئے پیش نظر ہے مگر ذرا توقّف کیجئے، یہ صیغۂ حال بھی صیغۂ ماضی میں بدل چکا ہے۔ بات تو تیسرے شمارے کی تھی جو آپ ملاحظہ فرما چکے اور آپ کے بیش بہا تاثرات اس چوتھے شمارے میں آپ کے پیشِ نظر ہیں۔

گردشِ صبح و شام کا تسلسل وقت کے کارواں کو آگے بڑھائے جاتا ہے۔ تیسرے شمارے کے بعد ٹھٹھک کر سوچنا کیا، وہ جیسا بھی تھا آپ حضرات کو پسند آیا اِس کے لئے ہم آپ کے بے حد ممنون ہیں۔ اب یہ چوتھا شمارہ آپ کی خدمت میں پہنچ رہا ہے۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ ہم رُکیں نہیں، آگے بڑھتے ہی رہیں۔ بقولِ مولانا خواجہ الطاف حسین حالؔی ع

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

اس نصب العین کے ساتھ ہم اُس وقت تک آپ کے متنوع ذوقِ ادب کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتے رہیں گے جب تک آپ کا ہر طرح کا تعاون حاصل رہے گا۔ کسی ادبی رسالے کی بقا کا انحصار جن باتوں پر ہے، اُن کا ذکر تیسرے شمارے کے اداریہ میں کیا جا چکا ہے۔ مالی اور قلمی تعاون کے علاوہ اس کی ترویج اور دائرہ اشاعت کی توسیع کا بار بھی آپ

ISSN. 2582 - 3612

حضرات کے مبارک شانوں پر ہونا چاہئے۔ہم نے عرض کیا تھا کہ اپنی بیش قیمت مصروفیات سے چند لمحات نکال کر ''ساغرِ ادبؔ'' کو عطا کر دیں تو اس میں دو آتشہ کا لطف آ جائے گا۔ایک بار پھر بتایئے کہ اپنے قیمتی وقت کی قربانی آپ ''ساغرِ ادبؔ'' کی نذر کر سکیں گے؟ اور ایک بار پھر اظہار خیال فرمایئے کہ ''ساغرِ اَدبؔ'' کے اِس چوتھے شمارے کی مئے دو آتشہ کا جلوۂ صد رنگ آپ کو کیسا لگا؟

اہلِ قلم کے تعاون اور تاثرات کی کثرت سے بدیہی طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ آپ کے اِس محبوب رسالے کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوا جاتا ہے۔بعض نئے جیّد لکھنے والے بھی شریکِ اشاعت ہو رہے ہیں۔اور جو پہلے سے ہماری بزم میں شامل ہیں، وہ تو ہیں ہی، تخلیق وتنقید اور تحقیق وتدریس کے مسائل وغوامض پر لوگ لکھ رہے ہیں۔دانشوروں کی خالی ہوتی ہوئی صفوں سے اُن کی جگہ لینے والے بزرگوں تک سب ہمارے قلمی معاونین میں شامل ہیں اور نئی نسل سے ذوقِ ادب کا تازہ ظہور لے کر نکلنے والے ہجوم در ہجوم ہماری محفل میں آ رہے ہیں اور آتے جا رہے ہیں۔ہم اِدارے کی جانب سے ان سارے بزرگوں اور نوجوانوں کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

۵؍فروری ۲۰۲۰ء   **ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر**

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

حمد

بے شبہ، بے شک، بے گماں   ہے تو ہی ربّ دو جہاں
تو نے ہی پیدا بھی کئے   بے شک زمین و آسماں
یہ چاند، سورج، بحر و بر   ہیں تیری خلقت کے نشاں
یہ سبزہ زارِ خوشنما   تو آبشار و گلستاں
یہ برگ و بار اور پھول پھل   تو شاخ ، کونپل ، ٹہنیاں
بھر علم و عقل و فہم بھی   تو حکمت و دانائیاں
سب ہیں عطائیں آپ کی
بے شک خدائے مہرباں
یہ گنجہائے سیم و زر   اور سیپ میں جو ہیں گہر
گر مہرباں ماں باپ تھے   استاذ اپنے ذی نظر
دی جو بصارت بھی ہمیں   تو دی بصیرت معتبر
پھر ایک سچّا دین بھی   بیشک رسول با خبر
بازو اگر طاقت بھرے   تو پنجۂ فتح و ظفر
ہم پہ ہے کتنا مہرباں   تو اے خدائے خشک و تر
پا کر ترا ہی آستاں   ہم دہر میں ہیں مفتخر
ہم چارہ جوئے ناتواں   اور تو ہے قادر چارہ گر
جائیں کہاں کس کی طرف
ہم تیرے در کو چھوڑ کر
تو نے ہمیں پیدا کیا   تو خالق ارض و سما
یارب اگر ہم پہ نہیں   کس پہ کرم ہوگا ترا

ISSN. 2582 - 3612

مجبور بندے ہم ترے — ہم سب کا تو حاجت روا
ہم کس سے رکھیں آس کچھ — تو ہی ہمارا آسرا
تو ہی ازل ، تو ہی ابد — تو ابتداء، تو انتہا
رب دوسرا کوئی نہیں — ثانی نہیں کوئی ترا
ہے مثل و بے ہمتا ہے تو — خلاّق تو دارین کا

کی جو مناظرؔ نے ثنا
کر لے قبول اس کو خدا

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

پروفیسر عظیم الرحمٰن

نعت شریف

'یا صاحب الجمال و یا سیّد البشر'
محشر میں آپؐ مجھ پہ بھی کیجئے گا اِک نظر

تخلیق کائنات ہوئی آپ کے سبب
'مِنْ وَجْھِکَ الْمُنیر لَقَدْ نُوِّرَالْقَمَر'

ممکن نہیں کہ آپؐ کی توصیف ہو سکے
کس کو مقامِ شافعِ محشر کی ہے خبر؟

کھولی زباں کسی نے، اُٹھایا اگر قلم
شمشیر تیز سے گزرے گا وہ بشر

بلوایا رب نے آپؐ کو اتنا قریب تر
جس جا پہ جبرئیلؑ کے جلتے ہیں بال و پر

'قُلْ اِنّما اَنَا بَشَرٌ مِثْلُکُمْ' کا حکم
ایماں وَما مُحمّدٌ اِلّا رَسُوْل' پر

جب ناطقہ ہو سر بہ گریباں تو کہہ عظیمؔ
'بعد از خدا بزرگ توئی، قصّہ مختصر'

ISSN. 2582 - 3612

پروفیسر عبدالواسع

سورۂ کہف کا اعجاز

''حملہ کے وقت'' کے عنوان سے پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے ایک مختصر سے مختصر کہانی بھیجی ہے اور فرمائش کی ہے کہ اس کا تجزیہ کردوں۔ ہفتوں بلکہ مہینوں میرے ذہن میں یہ کہانی کلبلاتی رہی مگر میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس پر کیا لکھوں اور کس طرح اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ اس درمیان موصوف سے جب بھی ٹیلیفون پر باتیں ہوئیں۔ موصوف نے اس کا ذکر کیا اور دھمکی دی کہ بہت سے لوگوں نے اظہار خیال کیا ہے اور انہیں جمع کر کے وہ کتابی صورت میں شائع کرنے جا رہے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ میرے یہ رشحات قلم ان کی کتاب میں شامل ہو پائیں گے۔ مگر میں نے وعدہ کیا تھا اس لئے اس کی ایفا میں چند الفاظ آپ حضرات کی سمع خراشی کے بطور پیش خدمات ہے　ع

گر قبول افتد زہے عز و شرف

''حملہ کے وقت'' میں ڈرائیور حبیب، دہشت گرد اور افسانہ نگار صرف تین کردار ہیں۔ ان میں فعال کردار حبیب اور دہشت گردوں کا ہے۔ افسانہ نگار فلائٹ سے کہیں جا رہا ہے مگر اس کی فلائٹ چار گھنٹہ لیٹ ہے۔ چنانچہ وہ ڈرائیور کو کسی خاص مقام کو جانے کے لئے کہتا ہے کہ دہشت گردانہ حملہ ہو جاتا ہے اور اس کی گاڑی میں گولیاں برسنے لگتی ہیں مگر ڈرائیور ہوشیار ہے اور گاڑی چلاتا رہتا ہے۔ کچھ وقفے کے بعد دوبارہ گولیاں چلنے لگتی ہیں۔ اس بار کے حملے میں ڈرائیور کے کندھے اور کہنی میں گولیاں لگتی ہیں مگر وہ گاڑی چلاتا رہتا ہے۔ رُکتا نہیں۔ چنانچہ دہشت گردانہ حملے کے سائے سے وہ لوگ باہر آتے ہیں تو افسانہ نگار کو کوئی زخم نہیں ہوتا اور وہ بالکل بھلا چنگا رہتا ہے۔ یہ بات اپنے میں تعجب خیز ہے۔ اس لئے افسانہ نگار جب اس واقعہ پر غور کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ سورہ کہف کا اعجاز ہے۔ کیونکہ وہ راستہ بھر اس سورۃ کی تلاوت کر رہا تھا۔

یہ ہے کہانی مگر غور کرنے والی بات یہ ہے کہ سورہ کہف مختصر آیت نہیں ہے قرآن کے عمومی صفحات میں یہ بارہ تیرہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ افسانہ نگار کو یہ سورہ بہ زبان تھی یا وہ قرآن لے کر چلا تھا اور اطمینان سے اس کی تلاوت کرتا رہا تھا۔ اس کو نہ تو کوئی بے چینی تھی اور نہ کسی قسم کا خوف اور اسی وجہ سے گولیوں کی بوچھار میں محفوظ و مامون رہا سورہ کہف میں اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کی دشمنوں سے حفاظت ضرور کی تھی مگر وہ حضرات سورہ کہف کی تلاوت نہیں کر رہے تھے کیونکہ یہ سورہ اس واقعہ کے بعد

نازل ہوا ہے اور اس کی بدولت اللہ نے اپنی شان ربوبیت کا اظہار کیا ہے۔ لیکن اس افسانے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی تلاوت کرنے والے کو اللہ تمام بلاؤں سے محفوظ و مامون رکھتا ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ سورہ کہف کا یہ اعجاز ہے۔

کہانی کے مطالعے کے بعد ذہن میں دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ واقعہ کہاں کا ہے۔ کیونکہ کسی جگہ یا مقام کا نام اس کہانی میں نہیں ہے۔ ویسے تو دہشت گردی ساری دنیا میں ہوتی ہے مگر زیادہ تر اسلامی ممالک میں ہوتی ہے۔ فلسطین، افغانستان، یمن، مصر، شام، عراق وغیرہ ممالک میں زیادہ تر دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس سے یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگار ان ممالک میں سے کسی ملک میں سفر کر رہا تھا اور اس وقت یہ واقعہ پیش آیا۔

اگرچہ یہ افسانہ مختصر ترین افسانوں میں ایک ہے مگر خیالات کے گھوڑے چہار طرف دوڑتے ہیں اور اس کو تحریر کرنے کے اسباب ڈھونڈنے ہیں مگر ناکامی ہاتھ لگتی ہے اور صرف یہ سوچ کر خاموشی اختیار کرنی پڑتی ہے کہ یہ سورہ کہف کا اعجاز ہے۔ لیکن یہ خیال بھی سر ابھارتا ہے کہ قرآن کی سینکڑوں سورتوں میں آخر اس سورہ کا انتخاب افسانہ نگار نے کیوں کیا تو محسوس ہوتا ہے کہ شاید یہ اس کا ذاتی تجربہ ہے یا اس نے کسی سے یہ بات سنی ہے۔ اگر ایسا ہے تو افسانہ نگار کو اس کا نام یا اس جگہ کا نام بتانا تھا مگر ایسا نہیں ہوا۔ آخر کیوں؟ اس کا جواب صرف افسانہ نگار دے سکتا ہے ہما شما نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نے سارے سوالوں کا جواب تلاشنے کا کام قاری پر چھوڑ دیا ہے تاکہ قاری قیاس کی قلابازیاں کھاتا رہے اور افسانہ نگار اس سے لطف اندوز ہوتا رہے۔ اگر یہ بات ہے تو ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ اس کو مسرت کے چند لمحے فراہم کرنے میں کامیاب ہوا۔ میرے لئے یہی کافی ہے۔ تمت بالخیر

Prof. Abdul Wasey
Karar ki Bari
Chandwara
Muzaffarpur - 842 001
Mob. : 94300 51490

پروفیسر قمر جہاں

اُردو کے غیر مُسلم افسانہ نگار اور عورت کا تصور

عورت دُنیا کی سب سے خوبصورت مخلوق ہو یا نہ ہو مگر ایک اہم مخلوق ضرور ہے اور شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ کے الفاظ میں ع

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

یہ بات سو فیصد سچ ہے کہ شاعر، ادیب اور فن کاروں نے وجودِ زن کے اس تصور کو اور بھی رنگین بنا کر پیش کیا ہے۔ استادِ محترم علامہ جمیلؔ مظہری نے فرمایا تھا ؂

تو ہے معصوم تری ساری اَدائیں معصوم
حد تو یہ ہے کہ ہوتی ہیں خطائیں معصوم

(عورت)

آج کے قومی سمینار کا بنیادی موضوع ہے ''اُردو کے غیر مُسلم افسانہ نگار''۔

جہاں تک ہم جانتے ہیں اُردو وہ زبان ہے جو ہندو مُسلم اتحاد اور قومی یکجہتی کے فروغ کی مشترکہ زبان ہے۔

ع ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یہ تصور بھی اُردو کے شاعر نے ہی دیا ہے —— اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اُردو کے غیر مسلم افسانہ نگاروں نے کن کن جہات سے اُردو افسانے کو فروغ دینے میں اپنا قیمتی تعاون پیش کیا ہے۔ یہ جہات قومی یکجہتی کا تصور بھی ہوسکتا ہے، دیہی ماحول کی پیش کش بھی ہوسکتی ہے، اس کے برعکس شہر کا ماحول بھی ہوسکتا ہے، عصری حسیت اور آج کی سیاست بھی —— دَلت یا مزدور طبقوں کی عکاسی بھی، غرض موضوع انیک ہیں مگر ایک عورت ہونے کی حیثیت سے میں نے موضوع کے انتخاب میں جانبداری برتی ہے۔ یعنی اردو کے غیر مُسلم افسانہ نگاروں کے یہاں عورت کے تصور کا انتخاب کیا ہے۔ اب دیکھئے اس نئے تقریباً untouched موضوع کے ساتھ میں کس حد تک انصاف کر پاتی ہوں۔

اُردو فکشن کے فروغ وارتقاء میں غیر مُسلم قلمکاروں کا شروع سے اہم رول رہا ہے۔ بلکہ اُردو افسانہ کا باوا آدم تو ہم منشی پریم چند ہی کو قرار دے چکے ہیں۔ بھلے ہی بعد کی تحقیق نے کئی ناموں کو اولیت دینے کی کوشش کی ہے۔ جیسے بہار کی سرزمین سے علی محمود اور شادؔ عظیم آبادی کا نام لیا جاتا ہے۔ کسی نے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

راشد الخیری کو پہلا افسانہ نگار قرار دینا چاہے ہے مگر متفقہ طور سے پریم چند کی کاوش کو ہی سراہتے ہوئے اولیت کا سہرا انہیں کے سر بندھتا ہے، وہ صرف اس فن کے بانی ہی نہیں —— اسے ایک خاص منزل تک پہچانے کا بھی شرف رکھتے ہیں۔ لہذا اردو افسانے میں عورت کے تصور کی بات آتی ہے تو سب سے پہلے ہماری نگاہ منشی پریم چند پر ہی جا ٹھہرتی ہے۔ منشی پریم چند کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے عورت کے تقریباً تمام روپ یعنی بیوی، محبوبہ، طوائف، ماں، بہن، بہو، بیٹی، ساس، نانی، دادی، ملازمہ، استانی، مالکن غرض بڑے بھرپور انداز میں اپنے افسانوں میں عورت کی شبیہہ دکھائی ہے۔ ہندوستانی تہذیب و کلچر سے مزیّن عورت، جو صرف اپنے حُسن کی وجہ سے قاری کی توجہ کا مرکز نہیں بنتی بلکہ اُس کی سیرت، اس کا سوبھاؤ ہندوستانی عورت کا اصلی روپ ہے —— افسانہ ''شکوہ وشکایت'' میں بیوی کی سیرت جس نے افسانہ کے اختتام میں یہ ثابت کردیا کہ مرد اور عورت کا رشتہ گاڑی کے دو پہیہ یا مشین کے ضروری پرزہ کی طرح ہے جسے ہٹا دیا جائے تو مشین کی کارکردگی ختم ہوجائے گی۔ ''بدنصیب ماں''، ''قاتل کی ماں''، ''مالکن''، ''شانتی''، ''ستی''، ''بڑے گھر کی بیٹی''، ''بوڑھی کاکی''، ''آخری تحفہ'' کے نسائی کردار—— غرض جہاں کہیں انہوں نے نسائی سیرتوں کو پیش کیا ہے اس میں ہندوستانی عورت کی وہ خصوصیات بھر دی ہیں جس پر ایک عالم کو ناز ہے۔ ایک بات جو توجہ طلب ہے کہ منشی پریم چند نے اپنے عہد کے سماجی، معاشرتی اور مذہبی ماحول کو پیش کرتے ہوئے عورت کی جو تصویریں کھینچی ہیں ان میں عام طور سے ''شر'' کے مقابلے میں ''خیر'' یعنی عورت کی سیرت کے اچھے پہلو پر روشنی ڈالی گئی۔ مثال کے لیے افسانہ ''ستی'' کو لیجئے یا ''گنگو برہمن'' کی محبوبہ کو دیکھئے یا افسانہ ''مالکن'' کی بیوہ کا کردار ملاحظہ فرمائیے —— سماج کے ظلم وستم سے ستائی ہوئی یہ عورتیں اندر سے ہمیشہ صاف سُتھری ہیں۔ حالات کے ہاتھوں یہ تماشا ضرور بنتی ہیں مگر اُن کی اچھی سیرت ہمیشہ ایک اچھے وفادار ساتھی کی متلاشی رہی ہے اور جب مرد گنگو کی شکل میں انہیں مل جاتا ہے تو وہ ایک وفادار بیوی بن کر خود بھی خوش ہوتی ہیں اور اپنے شریکِ سفر کو بھی مطمئن کر دیتی ہیں۔ اُن کے بیشتر افسانوں میں عورت کا وہ کردار ملتا ہے جو مرد کی طاقت بن کر اُس کو جینے کا سلیقہ سکھانے میں کامیاب ہے۔ افسانہ ''گنگو برہمن'' اور ''مالکن'' سامنے کی مثال ہیں جہاں ایک جاہل اور کاہل مرد بھی عورت کی محبت سے بااہل ہوجاتا ہے۔ لیکن جہاں کہیں مرد نے اُس کے ساتھ بے وفائی کا کھیل کھیلا ہے اور اسے لائقِ اعتنا نہیں سمجھا تو وہ شانتی کی طرح جاں برحق ہوجانے کو ہی افضل جانتی ہے —— اُس خاص دور میں عورتوں میں تعلیم کی کمی کی وجہ سے زندگی کے دُکھ درد سے نجات کا واحد ذریعہ موت یا پھر طوائف بن جانا تھا ؂

غمِ ہستی کا اسدؔ! کس سے ہو جُز مرگِ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک (غالب)

ISSN. 2582 - 3612

ایک خاص طرزِ معاشرت میں بیشتر افسانہ نگاروں نے عورت کو مثلِ شمع کے گھُلتے ہوئے دکھایا ہے یا پھر خودکشی کر کے غمِ زندگی سے نجات حاصل کرتے ہوئے۔ منشی پریم چند عورت کے لیے طوائف بننے سے بہتر مر جانا تصور کرتے ہیں۔ جب کہ عورت کے معاملے میں اپنے زمانے کے لحاظ سے ان کا اندازِ نظر کافی ترقی پسندانہ ہے اور دیگر ترقی پسند افسانہ نگاروں کی طرح عورت کے انہوں نے انگنت روپ اپنے افسانوں میں پیش کئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پہلی بار انہوں نے ایک مکمل عورت کو پورے سماجی پسِ منظر میں پردۂ فن پر اُجاگر کیا ہے۔

اس خاص باب میں پریم چند کے بعد کرشن چندر کا نام لیا جاتا ہے۔ غیر مسلم افسانہ نگاروں میں وہ Asia fame writer کا درجہ رکھتے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں بھی عورت مرکزِ توجہ رہی ہے۔ لیکن اُن کا اندازِ نظر عورت کے متعلق عام طور سے رومانی رہا ہے۔ عورت، حُسن اور رُومان ان کے افسانوں کے امتیاز بھی ہیں اور نُقص بھی۔ وادئ کشمیر کے فطری مناظر میں، یا عروس البلاد بمبئ کی بھاگم بھاگ زندگی یا پنجاب کے قصباتی ماحول میں نسائی سیرتیں —— کس طرح عالمِ فطرت کا سب سے مظلوم طبقہ ثابت ہوئی ہیں۔ جنسی استحصال کے ہاتھوں اُن کی زندگی واقعی کھلونا بن گئی تھی۔ کرشن چندر کے اکثر ہا افسانوں میں کرب کی یہ صورتیں بڑی واضح صورت میں سامنے آئی ہیں۔ ’’پورے چاند کی رات‘‘ کرشن چندر کا ایک خوبصورت مشہور افسانہ ہے۔ یہاں کشمیر اپنے تمام جنت نشاں نظارے کے ساتھ موجود ہے۔ اس رومانی ماحول میں ایک غریب نوعمر لڑکی کی روئیدادِ حیات پیش کی گئی ہے۔ دو دھڑکتے دلوں کی معصومیت، الھڑپن، جسم و جاں کی فطری تڑپ ...... غرض ہیرو، ہیروئن دونوں یادگار کردار بن جاتے ہیں اور ’’پورے چاند کی رات‘‘ کی معنویت قاری پر روشن ہو جاتی ہے۔ افسانہ خاصا طویل ہے مگر موضوع کے البیلے پن اور اندازِ پیش کش کی ساحرانہ کیفیت سے ایک ذرا اکتاہٹ پیدا نہیں ہوتی۔ عورت اپنی تمام تر معصومیت، پاکیزگی کے باوجود محبت کا درد جھیلتی ہے اس لیے کہ جھیلنا شاید اُس کا مقدر ہی نہیں فطرت بھی ہے۔ افسانے کے انجام پر مرد نادم تو ہوتا ہے مگر وقت تو گزر ہی جاتا ہے۔

اگر میں یہ کہوں کہ کرشن چندر ترقی پسند تحریک کے بہت اہم رہنما ہونے کے باوجود عورت کے معاملے میں عموماً رُومانیت پسند ہی نظر آتے ہیں تو شاید مبالغہ نہیں ہوگا ---- ’’مہالکشمی کا پُل ہو‘‘ یا علامتی افسانہ ’’غالیچہ‘‘، ’’دو فرلانگ لمبی سڑک پر چہل قدمی کیجئے یا زندگی کے موڑ پر‘‘ (جو کرشن چندر کا سب سے پسندیدہ افسانہ ہے)، ’’گھونگھٹ میں گوری چلے‘‘ کا دیدنی منظر ہو یا ’’ہم وحشی ہیں‘‘ کا نظارہ، ’’بالکونی‘‘ پر نظر لے جایئے یا افسانہ ’’یرقان‘‘ کی کیمسٹری کا مطالعہ کیجئے۔ کرشن چندر کے افسانوں میں نسوانی کردار کی مختلف صورتیں ملتی ہیں۔ کرشن چندر کے یہاں عام زندگی سے متعلق موضوعات کی کثرت ہے لیکن ان سب کے پسِ منظر میں

’’عورت‘‘ کا جلوہ بھی بہت بے باک ہے۔ ’’جنس‘‘ ان کا ایک محبوب موضوع ہے۔ چاہے یہ استحصال کی صورت میں سامنے آیا ہو یا ایک جذبۂ بے اختیار شوق کا نمونہ بن کر ---- کرشن چندر کے افسانوی طرزِ اظہار نے اس نوعیت کے افسانوں کو ایک خاص رنگ میں رنگ دیا ہے جس پر رومانیت یا ترقی پسندی کی مہر بھی ثبت کی جاتی ہے۔ لیکن میرا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کی تمام تر توجہ افسانہ کی داخلی ساخت اور اُس کے تخلیقی پیرایۂ اظہار پر مرکوز رہتی ہے۔ مثال کے لیے مشہور افسانہ ’’مہالکشمی کا پل‘‘ دیکھئے۔ اس میں پُل کے جنگلے پر ٹنگی ہوئی چھے عدد مختلف رنگوں کی ساڑیاں، مختلف رنگوں کی نسائی سیرتوں سے ہمارا تعارف کراتی ہیں۔ افسانے کا درج ذیل اقتباس ان مزدور طبقہ نسائی سیرتوں کی تفہیم میں آپ کی توجہ چاہتا ہے :

> ’’...... یہ ان چھوٹے چھوٹے لاکھوں کروڑوں گھروں کو بنانے والی عورتوں کی ساڑھیاں ہیں جنہیں ہم ہندوستان کہتے ہیں۔ یہ عورتیں ہماری پانچ ہزار سالہ تہذیب کا سب سے اونچا نشان ہیں...... وزیر اعظم صاحب! یہ ہوا میں جھولتی ہوئی ساڑھیاں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہیں، کچھ مانگتیں ہیں...... کوئی بڑا ملک، بڑا عہدہ، بڑی موٹر کار، ٹھیکا یا پروپرٹی نہیں...... یہ تو زندگی کی بہت ہی چھوٹی چھوٹی چیزیں مانگتی ہیں۔ دیکھئے! یہ شانتا بائی ہے جو اپنے بچپن کی کھوئی ہوئی دھنک تم سے مانگتی ہے، یہ ساوتری...... جس کے پاس اپنے بچوں کے اسکول کے لیے فیس نہیں ہے، یہ بڑی بھنگن کی لال ساڑھی ہے جو بندوق کی گولی کو ہل کی پھالی میں تبدیل کرنا چاہتی ہے تا کہ دھرتی سے انسان کا لہو پھُول بن کر کھِل اٹھے اور گندم کے سنہرے خوشے ہنس کر لہرانے لگے......۔‘‘
>
> (ماخوذ از : افسانہ ’’مہالکشمی کا پُل‘‘)

یہاں گندم کے سُنہرے خوشے اور بھنگن کی لال ساڑھی کی علامتیں ترقی پسندوں کے نمایاں symbol ضرور رہے ہیں اور اس میں کرشن چندر کے ازم کی نمائندگی ضرور ہو رہی ہے مگر سب سے بڑھ کر محنت کش کمزور اور مظلوم طبقہ جس کا ایک اہم حصہ عورت بھی ہے۔ کرشن چندر کا محبوب موضوع ہے —— فکشن کے نقاد پروفیسر قدوس جاوید کے اس خیال سے اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ :

> ’’...... کرشن چندر کے افسانے مرکز جُو (centripetal) نہیں، مرکز گُریز (centrifugal) ہوتے ہیں۔‘‘

شاید یہی وہ خوبی ہے کہ اُن کے افسانوں میں پیش کردہ عورتیں بھی بسا اوقات حاشیے پر کھڑی نظر آتی ہیں اور قاری کی تمام تر توجہ افسانہ نگار کی تخلیقی زُبان اور منفرد اندازِ اظہا کی لذّتوں میں

ISSN. 2582 - 3612

ڈوب جاتی ہے۔ الفاظ جو بظاہر معمولی الفاظ ہیں مگر افسانے کے تناظر میں معنویت کی کئی پرتیں کھولتے ہیں مثلاً :

''ایسی خوبانیاں میں نے کبھی نہیں کھائیں''

''ہش! کشتی ڈوب جائے گی......'' عورت کی گھبراہٹ، مرد کا پُرسکون لہجہ ''ڈوب جانے دو!

فطرت اور عورت دونوں کا استقبال کرشن چندر نے پُرجوش انداز میں کیا ہے۔ اُن کے یہاں عورت کے مختلف رُوپ اور پُوز دیکھتے ہیں۔ کبھی معصوم بھولی بھالی نسائی کردار (پورے چاند کی رات) کہیں کال گرل ہے، کہیں طوائف، کسی افسانے میں بیوہ، کسی میں طلاق شدہ بے درد سماج کی ٹھکرائی ہوئی مخلوق، کہیں روزگار کی تلاش میں دُھوپ کی شدّت میں تانبا ہوتا بدن ----غرض خود کرشن چندر کے ہی الفاظ ہیں :

''میرے خیال میں مردوں سے زیادہ عورت کے دل میں محبت کا شعور ہوتا ہے۔ عورت تو ہے ہی سراپا محبت، اس کی زندگی محبت سے شروع ہوتی ہے اور محبت پر ختم ہو جاتی ہے......ظاہر ہے کہ ہمارے سماج میں مرد کی دُنیا بہت بڑی ہے......''

(کرشن چندر نمبر، (عالمی اردو ادب)-نومبر ۲۰۱۴ء صفحہ ۱۳۳)

مرد کی اس وسیع کائنات میں عورت کا وُجود واقعی پنڈولم جیسا لگتا ہے جو وقت کے گزرنے کا الارم بھی سناتا ہے۔ کرشن چندر کے یہاں عام طور سے رُومان، حُسن اور حقیقت کی تثلیث پیش کی گئی ہے کیونکہ زندگی بھی اسی تثلیث کا نام ہے۔

اب ہم کرشن چندر سے آگے بڑھتے ہیں اور اُردو افسانے کا ایک اہم نام یعنی راجندر سنگھ بیدؔی کے یہاں عورت کے تصور کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ رومان کی فرحت بخش چھاؤں سے تلخ حقیقت پسندی کی کانٹوں دار سرزمین پر جب ہم قدم رکھتے ہیں تو نظریاتی اعتبار سے بھی عورت کے تصور اور تصویر میں نمایاں فرق محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بیدؔی کی عورت خواب وخیال کی رانی نہیں وہ گھر کی بہورانی ہے، جو سارے دن گھریلو کام کاج میں اُلجھی رہتی ہے اور گئی رات نڈھال ہو کر جب بستر پر گرتی ہے تو اُسے یہ خبر بھی نہیں رہتی کہ کوئی (پتی) اُس کے انتظار میں کروٹیں بدل رہا ہے۔ ''اپنے دُکھ مجھے دیدو'' کی اندؔو کو دیکھئے افسانہ ''گرہن'' کی ہولؔی کو پڑھیے جو ازدواجی زندگی کے عذاب صورت لمحوں سے نجات کے لیے چند روز کے لیے میکہ چلی جانا چاہتی ہے اور اسٹیمر پر جب گاؤں کا منہ بولا بھائی ملتا ہے تو پہچان کی پہلی نظر میں ہی وہ فریب کی شکار ہو جاتی ہے اور گھر پہنچنے کی بجائے آشرم پہنچا دی جاتی ہے۔ گویا مرد اس اس معاشرے میں عورت کے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

لیے ہر طرف خطرہ ہی خطرہ ہے۔ اگر جائے پناہ کہیں ہے تو وہ اپنے خاوند کا ہی گھر —— (چاہے وہاں کتنی ہی صعوبتیں کیوں نہ برداشت کرنی پڑیں) بیدی عورت کی بائیولوجی اور سائیکلوجی سے زیادہ اُس کی سوشیولوجی کو اہمیت دیتے ہیں۔ سماجی تناظر میں ہی عورت دیوی کا دوسرا روپ ہے —— ''لاجونتی'' کی لاؔجو کو دیکھئے، افسانہ ''میتھن'' کی ہیروئن کا جائزہ لیجئے۔ ''گرم کوٹ'' اور ''چھوکری کی لوٹ'' کو ادھیڑیے۔ بقول وارث علوی :

''وہ محبت کو ازدواج کا جزو بناتے ہیں اور ازدواج کا اپنا رُومان پیدا کرتے ہیں......اس سوچ میں تہذیبی رویے انسانی سائکی کا ایسا جزو بن گئے ہیں کہ لگتا ہے جنس کی نفسیاتی تسکین کلچر کے بنائے ہوئے ازدواجی پیرایوں میں ہی ممکن ہے کہ صرف اسی صورت میں جبلت کا انسانی روپ برقرار رہ سکتا ہے۔''

مضمون 'ایک چادر میلی سی' از وارث علوی- استعارہ نئی دہلی، جولائی اگست سمتبر ۲۰۰۰ء ص ۴۷

افسانہ ''دس منٹ بارش میں'' یا ''ببل'' کی کم سن سیؔتا —— جو بن باپ کی لڑکی ہے اور اُس کی بوڑھی ماں کی بیچارگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُس کے کرایہ دار لڑکے ہی اس کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں۔ ''گرم کوٹ'' میں شمؔی (بیوی/ ماں) کا کردار ہو یا بیٹی پشپامنی کا —— ہر جگہ بیدی نے عورت کو مرد پر فوقیت دی ہے اور اُس کی وفا شعاری، معصومیت مظلومیت اور بے بسی کو بہ نگاہِ ہمدردانہ دیکھا ہے۔

''کوکھ جلی'' میں عورت ماں کی سیرت میں پیش کی گئی ہے اور بیدی کی فکر کا یہ انداز بھی ملاحظہ فرمایئے :

''......دُنیا میں کوئی عورت ماں کے سوا نہیں، بیوی بھی کبھی ماں ہوتی ہے اور بیٹی بھی ماں......تو دُنیا میں ماں اور بیٹے کے سوا کچھ نہیں، عورت ماں اور مرد بیٹا۔ ماں خالق اور بیٹا تخلیق......''

مختصر یہ کہ بیدی نے عورت کے انیک روپ اپنے افسانوں میں پیش کیے ہیں اور مذہبی گرنتھوں کے حوالے سے عورت کو تخلیق کا وہ سرچشمہ تصور کیا ہے جو واقعی اپنی تخلیقی قوت ہی کی وجہ سے سرمایہ ناز ہے —— بیدی کا اسطوری اور علامتی اسلوب اُن کے افسانوں کی جان ہے اور اسی کے وسیلے سے انہوں نے عورت کے مختلف روپ کو ایک اکائی میں باندھا ہے جسے خود انہوں نے 'ماں' کا درجہ دیا ہے۔ اُن کا دھارمک اندازِ نظر عورت کو محض لذّتِ جسمانی نہیں بلکہ ہمارے قدرتی نظام کا ایک انمول حصہ قرار دیتا ہے۔

ہندوستانی شادی ایک social contract ہے اور اس contract کے بعد ہی عورت کا وقار بڑھتا ہے۔ اس کو فراموش کر دینے سے وہی سنکٹ کی گھڑی آ سکتی ہے جو ''نرناری'' میں انتظار حسین نے

ISSN. 2582 - 3612

دکھایا ہے۔ دھر جب تک ایک بندھن ہے مُسلّم ہے ورنہ ایک عجیب کشاکش، تذبذب اور پریشانی کا سبب بن جاتا ہے۔ چاہے وہ دھر غیر کا ہو یا اپنوں کا —— نصف ہوتے ہی اپنی پہچان کھو دیتا ہے۔

اُردو میں غیر مسلم افسانہ نگاروں کی ایک لمبی فہرست ہے، بہتر یہ ہوگا کہ اب چند ہم عصر لکھنے والوں کا حوالہ دیتے ہوئے انجام بخیر کہہ دوں۔ اوپندر ناتھ اشک، مہندر ناتھ، کشمیری لال ذاکر، رام لعل، گلزار، جوگیندر پال، ہرچرن چاؤلہ، بلراج ورما، سرلا دیوی، آشا پربھات، رتن سنگھ، م-م- راجندر، بشیشر پردیپ، گروبچن سنگھ، ریوتی سرن شرما، امرتا پریتم، سریندر پرکاش، بلراج مین را، دیپک بُدکی، کرشن کمار بے باک، بلراج بخشی، کملیشور، ہمت رائے شرما، ساوتری گوسوامی، دیوندر ستیارتھی، جتندر بلّو، کیول دھر، ست پال آنند وغیرہ ایسے قلم کار ہیں جنہوں نے اُردو افسانے کے فروغ میں نُمایاں کردار ادا کیا ہے۔ چند ایسے نام بھی ہیں جن کے افسانے ترجمے کے راستے اُردو میں داخل ہوئے ہیں مثلاً رابندر ناتھ ٹیگور، شانتی رنجن بھٹاچاریہ، رینو بہل، مردلا بہاری، لالی چودھری، منو بھنڈاری، راجیند ریادو وغیرہ۔ روشنی کے کاروبار میں، چراغ سے چراغ جلانے کی روایت خاصی پرانی ہے۔ اُردو ہی کیا، کسی زبان کے ادب پر نگاہ ڈالیے ترجمہ کا فن خیال وفکر کے ارتقاء میں خصوصی مددگار ثابت ہوا ہے۔ اس سے موضوعاتی جہاں میں وسعت و نیرنگی آتی ہے۔ فی الحال وقت کی کمی کے پیشِ نظر میں نے صرف اسم شماری کر لی ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ آئندہ سطور میں، میں چند ایسے افسانہ نگاروں کو زیرِ بحث لاؤں جو عصرِ حاضر کے غیر مسلم افسانہ نگاروں میں اپنی ایک امتیازی پہچان رکھتے ہیں۔

جدیدیت کے دور میں سریندر پرکاش، بلراج مین را، اور جوگیندر پال وغیرہ کا شمار اُردو فکشن کے معتبر ناموں میں ہوتا ہے۔ اکثر یہ بات سننے میں آتی ہے کہ جدیدیت نے اُردو فکشن سے قاری کو چھین لیا۔ ہمارے خیال میں یہ سچ آدھا ادھورا ہے۔ جدیدیت میں ایسے افسانے بھی لکھے گئے ہیں جو لازوال ہیں۔ جیسے سریندر پرکاش کا ''دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم''، ''رونے کی آواز''، ''بدوشک کی موت'' وغیرہ سریندر پرکاش کے ایسے افسانے ہیں جہاں علامتی طرزِ اسلوب میں بڑی بڑی بات کہی گئی ہے۔

فرد کی تنہائی کے موضوع پر ''دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم'' کبھی نہ بھولنے والا افسانہ ہے۔ اپنے ہی گھر آنگن کو دوسرے آدمی کی نذر کر دینا وقت کا وہ المیہ ہے جسے جس خوبصورتی اور تخلیقی حُسن کے ساتھ سریندر پرکاش نے پیش کیا ہے وہ ان کی فن کاری کا لاجواب نمونہ ہے۔ ان افسانوں میں جونسائی سیرتیں اُبھرتی ہیں ان کی شبیہہ بہت واضح نہیں ہے، یہاں ایک ایسا دھندلکا ہے جہاں اشارے اور کنایے کی مدد سے قاری ادھوری باتوں کو معنی ومفہوم دے کر کہانی سے لُطف لیتا ہے۔ مثلاً ''رونے کی آواز'' میں سرسوتی اور لچھمی دونسائی سیرتیں علامتی انداز میں افسانے کی ساخت میں داخل ہوئی ہیں۔ وقت نے کس طرح سرسوتی کی

وقعت گھٹا کر لکشمی کو آگے کر دیا ہے اس اَلمیہ سے متاثر ہو کر سرسوتی فلیٹ کے زینہ پر بیٹھ کر رات بھر روتی رہتی ہے اور اُس کے رونے کی آواز لوگوں کو مضمحل کرتی ہے یعنی مالدار عورتیں جاہ وحشمت کے سہارے سماج میں اونچا مقام حاصل کر لیتی ہیں اور صاحبِ علم وہُنر کو کوئی پوچھتا ہی نہیں ہے۔ ''دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم'' میں مرکزی کردار جو خود اپنے ڈرائنگ روم میں مہمان بنا بیٹھا ہے اور مستقل گزرتے ہوئے وقت کی چاپ سُن رہا ہے۔ بیوی اور بچے کو کارنس پر رکھے فریم میں بہ حسرت و یاس دیکھ رہا ہے۔ جب کہ اندر کوئی ہے، کیونکہ سانپ (جنس) رینگتا ہوا وہاں تک پہنچنا چاہتا ہے ---- وقت نے کس طرح وطن سے خیر باد ہوئے فرد کا استقبال کیا ہے۔ یہ تمام وقوعے احساس کے مختلف patches کی صورت سامنے آ رہے ہیں اور ایک واقعہ سے دوسرا واقعہ مربوط ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ذہن میں یادوں کے جگنو چمک رہے ہیں اور باہر وقت کی دستک ......عورت کا تصور ایک خوبصورت ''یاد'' کی صورت جھلملاتا ہے شاید اسی لیے افسانہ کا مرکزی کردار غمِ بے حاصلی اور احساسِ تنہائی کے کرب میں مبتلا ہے۔ سمندر کنارے کا یہ شہر اسے درد کے ایک اتھاہ سمندر میں ڈبو دیتا ہے۔ افسانے کا قاری بھی اس کیفیت میں ڈوب جاتا ہے۔ حال میں بلراج بخشی کا مجموعہ ''ایک بوند زندگی'' ہمارے مطالعہ میں آیا ہے۔ افسانہ ''زچ'' ایک عجیب وغریب طویل افسانہ ہے۔ عورت کا کردار بھی عجیب وغریب ہے۔

کرشنا سوبتی کا افسانہ ''اے لڑکی'' جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے لڑکی ذات کی تحقیر پر مبنی ایک کامیاب افسانہ ہے۔ ''نوکر کی قمیص'' میں بھی بیوی اور ماں کی سیرتیں ذرا دیر کے لیے ہی سامنے آئی ہیں لیکن اثر رکھتی ہیں۔ اسی طرح رسالہ ''نگینہ'' انٹرنیشنل کے تازہ شمارے (ستمبر اکتوبر نومبر ۲۰۱۶ء) میں غیر مسلم افسانہ نگاروں کی تین عدد کہانیاں پڑھنے کو ملی ہیں۔ ڈاکٹر کرشن بھاؤک کا افسانہ ''سنسنی'' بہت خوبصورت ہے اور یونیورسٹی کے انتظامیہ محکمہ کی تصویر کشی کرتے ہوئے رجسٹرار کے حاکمانہ انداز پر گہرا طنز ہے۔ جن کی بوسیزم صرف کمزور طبقے پر اپنا اثر دکھاتی ہے۔ افسانہ کا مرکزی کردار تو رجسٹرار صاحب ہی ہیں لیکن کہانی کے اختتام پر ضمنی کردار کی صورت میں ایک عورت Receptionist کو کاؤنٹر پر اپنا فرض انجام دیتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ساتھ ہی لفٹ پر چڑھتی ہوئی وہ لڑکی جس کی تصویر مصنف کے الفاظ میں :

> ''......اس لڑکی کو رجسٹرار کپور صاحب نے صرف ایک نظر ہی میں دیکھا تھا اور اس کا حُلیہ اُن کے ذہن میں نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ اُس نے تنگ پائچوں کی پھول دار شلوار پہن رکھی تھی اور اُس زیب اندام حسینہ کی زلفیں باب کٹ تھیں......

اب اسی افسانے کے حوالے سے نسائی شخصیت کا دوسرا رنگ دیکھئے:

ISSN. 2582 - 3612

کپور صاحب مُڑ کر رسپشنسٹ والی میڈم پر بے تحاشہ برسنے لگے......''کون
......کون تھی وہ لڑکی؟ آخر کس کی اجازت سے اُسے اوپر جانے دیا؟''
بولتے وقت اُس کمزور عورت کی زبان لکنت کر رہی تھی۔ رجسٹرار صاحب
دہاڑتے ہیں :
''اوہ یُوفول......یُو ایڈیٹ! میری تو کوئی کزن وزن ہے ہی نہیں! کیا تمہیں پتہ
ہے کہ تم اپنی اس لغزش کی بنا پر اس دو ٹکے کی نوکری سے ڈسمس بھی کی جا سکتی ہو؟
یُوفول......؟

(افسانہ ''سنسنی'' صفحہ ۱۴۲ تا ۱۴۳ عالمی ادب نمبر نگینہ انٹرنیشنل)

یہاں ایک ملازم پیشہ عورت کی جس افسوسناک صورتحال کو پیش کیا گیا ہے وہ واقعی آج کی زندگی کا رنگ ہے۔ جہاں ملازم عورت گھر کی ملازمہ سے بھی زیادہ بدتر حال ہیں۔ کیونکہ باس (Boss) کا یہ اندازِ تخاطب خود اُن کی ذہنی نفسیات کی تسکین کا ایک سامان ہے۔ باس کی فرہنگ میں 'رحم' کا لفظ ندارد تھا، انہوں نے اُس کی التجا کا کوئی معقول جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور جا کر سیدھے لفٹ میں لوٹ پڑے...... :

''......کل کوئی شخص لڑکی کا حلیہ بنا کر اپنے تھیلے میں ٹائم بم تک بھی لے کر
اوپر جا سکتا ہے ...... ابھی اوپر سبھی برانچوں میں خطرے کی اناؤنسمنٹ
کروادو۔ سب سے کہہ دو کہ کسی بھی حالت میں کوئی بھی لڑکی کسی بھی برانچ
میں داخل نہ ہونے پائے ......اب یہاں کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو،
اُس نازنین کو زینوں وغیرہ میں تلاش کرو'
...... یہ کہتے ہوئے ان کو اپنے پورے جسم میں ایک سنسنی دوڑتی محسوس ہو رہی
تھی اور اُن کے ہونٹ بُد بُدا رہے تھے۔
''اب جا کر کچھ بات بنی! ایک ایک کی خبر لیتا ہوں۔ جسے دیکھو اس یونیورسٹی
کو اپنے باپ کا گھر ہی سمجھ رہا ہے......''

(افسانہ ''سنسنی'' صفحہ ۱۴۳ -عالمی ادب نمبر نگینہ انٹرنیشنل)

دیپک کنول کے ''بے غیرت'' میں بھی وُ جو دِزن کو زندگی میں رنگ بھرنے کے لیے ضروری سمجھا گیا ہے مگر عورت اپنا سب کچھ قربان کر کے بھی خاوند جانکی ناتھ پھٹکل جو پیشہ سے ڈرائیور ہے اور اپنے عادات واطوار میں بھی پکّا مرد ہے، ایک دن اُسی کے ہاتھوں زہریلے پیگ کا گھونٹ لے کر سارنگی (بیوی) لوٹن کبوتر کی طرح تڑپ کر منہ سے جھاگ اگلتے ہوئے منٹوں میں دم توڑ دیتی ہے اور اپنے مرد کے ساتھ مقابلہ کرنے

کی سزا اُسے فوراً مل جاتی ہے۔

تیسرا افسانہ جتیندر بلّو کی ''جولیا'' ہے۔ جولیا ایک نیک سیرت عورت ہے جو دو عاشقوں کے درمیان عجیب کشاکش میں ہے۔ عاشق جو اچھے دوست تھے، بچپن ایک ساتھ ہی گزارے تھے مگر جوانی میں عورت کی خاطر ایک دوسرے کے جانی دشمن بن کر نمودار ہوتے ہیں۔ ٹھیک اسی وقت جولیا نے بڑی دانشمندی کے ساتھ دونوں دوستوں کو ریوالور چلانے سے روک لیا اور فیصلہ کی اس گھڑی میں اپنی سچی محبت کا اظہار کرتے ہوئے ہونے والے بچہ کے باپ کو بڑے خوبصورت انداز میں یہ اشارہ کرتی ہے کہ :.

''تم سربیا (جہاں اب وہ قیام کرنے والی ہے) جب چاہو آ سکتے ہو، جتنی دیر
چاہو، وہاں رُک سکتے ہو، اپنے بچے کو ڈھیروں پیار دے سکتے ہو، مگر ایک
شرط ہے۔ کیا؟ اپنا گرم مزاج اور غصہ لندن میں چھوڑ کر آنا۔
مدن کی گردن شرم سے جھک گئی تھی۔ مگر اُس کے ہونٹ فخر سے
پھڑ پھڑا رہے تھے، اور وہ خوش تھا۔ بے پناہ خوش......''

(افسانہ ''جولیا''- ص ۱۳۰)

جولیا کے کردار میں جتیندر بلّو نے ایک ایسی عورت کو پیش کیا ہے جس کا اپنا چہرہ اُس عورت کا تھا جس پر زمانے کی گردش نے ان گنت نشان چھوڑ رکھے ہوں۔ اُس کا چہرہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ وہ اپنی زندگی کا نیا باب شروع کرنے کے لیے انگلینڈ آئی تھی مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہ حالات کے ہاتھوں دو مرد کی زندگی میں داخل ہو جاتی ہے مگر فیصلہ کی گھڑی میں سچی اور پکی نظر آتی ہے اور آنے والے بچہ کی بہتر زندگی کی خاطر اصلی باپ یعنی مدن کا ہاتھ پکڑتی ہے۔ عورت کے کردار کی یہ سچائی اور اصول پسندی جتیندر بلّو کے بیشتر افسانوں کا خوبصورت موضوع ہے۔ جتیندر بلّو کی زندگی کا بڑا حصہ لندن میں گذرا ہے۔ اپنے پہلے افسانوی مجموعہ ''جزیرہ'' کے دیباچے میں وہ رقم طراز ہیں :

''...... میرے اندر مشرق اور مغرب کی دو دنیائیں آباد ہو چکی تھی ......اُن کا
آپس میں ٹکرانا فطری امر تھا...... یہ کہانیاں اسی تصادم کی کوکھ سے جنمی ہیں۔''

افسانے ''سنگی ساتھی''، ''مونگرل''، ''ہم قدم''، ''فرار''، ''جولیا'' وغیرہ مطالعے کی روشنی میں اس حقیقت کا انکشاف کرتے ہیں کہ خواتین کے کردار کی پیش کش میں وہ خاصے کامیاب ہیں۔ اُن کے افسانے اکثر بیحد طویل ہیں۔ شاید اسی لیے اُن کے نسائی کردار بھی اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ پردۂ فن پر نمایاں ہوئے ہیں۔ ''ہم تم'' کی گریس ہو یا جولیا، یا ''فرار'' کی اسٹیلا —— یہ تمام خوبصورت جسم کے ساتھ خوبصورت ذہن بھی رکھتی ہیں۔ ازدواجی رشتے کو کامیاب دیکھنے کی خواہش مند ساتھ ہی اپنے بچے کی محبت

ISSN. 2582 - 3612

میں یہ کسی سے کم نہیں۔ نامساعد حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے یہ سرگرم سفر رہتی ہیں۔ مغرب ہو یا مشرق عورتیں اپنی بعض جبلتوں کے لحاظ سے قدرِ مشترک کی حامل ہیں۔ افسانہ ’’ہم تم‘‘ میں میاں بیوی کا ہم خیال ہونا اور رشتے کی اہمیت کو پہچاننا کس قدر ضروری ہے۔ گریس کا یہ مکالمہ عورت کی نفسیات کا بیحد باریک مطالعہ ہے :

’’......وہ میری ہم ذات ہے، لیکن ایک عورت دوسری کی آنکھوں سے جان لیتی ہے کہ وہ کیا چاہتی ہے...... یہ جبلّت ، یہ خوبی قدرت نے ہمیں دی ہے، تمہیں نہیں......

(افسانہ ’’ہم تم‘‘ (ہم عصر ادب نمبر) شاعر)

بلراج ورما کے افسانوی مجموعہ کا نام بڑا عجیب ہے ’’الیوژن‘‘۔ اُن کے افسانے ’’آہٹ‘‘، ’’مثلث‘‘، ’’پر کٹے پرندے‘‘، ’’ابھیشاپ‘‘ اور ’’الیوژن‘‘ وغیرہ اردو دنیا میں کافی مقبول ہوئے ہیں۔ جنسی جذبہ ان کے یہاں مختلف رنگ کے symbol بناتا ہے۔ افسانہ ’’پر کٹے پرندے‘‘ میں کئی نسائی کردار ہمارے سامنے آتے ہیں۔ بی بی رخسانہ جو ایک تیز اور ذہین لڑکی ہے۔ شیخ ابراہیم کی بیگم صاحبہ جو راجپوت نژاد کہلانے میں فخر محسوس کرتی ہیں۔ آہٹ اور مثلث کہانیوں میں بقول قمر رئیس :

’’......ان کی زیرِ لب سوچ فلسفیانہ جہت اختیار کرلیتی ہے اور ورما صاحب زیادہ بسیط حقیقتوں پر سوچتے نظر آتے ہیں......۔‘‘

(شاعر صفحہ ۴۸۰)

اُن کے افسانے قاری کو متحیر بھی کرتے ہیں اور ایک خاص نوعیت کی بصیرت سے بھی دوچار کرتے ہیں۔

جوگیندر پال اُردو افسانے کا ایک نمایاں نام ہے جن کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے مابین اَدبی پُل ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ ’’دھرتی کے لال‘‘ کے نام سے ۱۹۶۱ء میں منظرِ عام پر آیا تھا۔ پھر ’’رسائی‘‘، ’’مٹی کے ادراک‘‘، ’’بے محاورہ‘‘، ’’بے ارادہ‘‘، ’’لیکن‘‘، ’’کتھانگر‘‘ وغیرہ انگنت مجموعے اردو افسانوی ادب میں موجود ہیں۔ ان کا افسانہ ’’رامائن‘‘ نسائی کرداروں کے اعتبار سے خاصا دلچسپ اور معنویت سے لبریز ہے۔ پال نے اساطیر کو موضوع بناتے ہوئے اچھی کردارنگاری کی ہے۔

اوپندر ناتھ، رام لعل، کشمیری لال ذاکر، رتن سنگھ وغیرہ کے بھی کئی مجموعے منظرِ عام پر آ کر شہرت دوام حاصل کرچکے ہیں۔ فی الحال ان تمام افسانہ نگاروں کے یہاں عورت کے تصور کا جائزہ لینا تو ممکن نہیں ہے میں صرف اتنا عرض کرنا چاہوں گی کہ غیر مسلم افسانہ نگاروں نے عورت کی سیرت عام اُردو افسانہ

نگاروں سے قدرے مختلف پیش کی ہے۔ اُن کے یہاں اساطیر اور مذہبی ماحول میں عورت کا جو پیکر نمایاں ہوا ہے اُسی تناظر میں اپنی تصویروں میں رنگ بھرنے کی سعی دکھائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور سے عورت کے تصور میں پاکیزگی، وفا شعاری اور پتنی کی خصوصیات ان کے یہاں چھائی ہوئی ہیں۔ جب کہ اُردو افسانے میں عورت کی تخلیق آدم کی پسلی سے ہوئی ہے وہ دودھاری تلوار ہے، حُسن کا وہ آئینہ ہے جو اپنی بے قدری پر آنسو بہا رہی ہے۔ طلاق، جہیز، ظلم وزنا بالجبر وغیرہ جیسی روئداد اردو افسانے کے عام موضوعات بنتے جارہے ہیں۔ لیکن غیر مسلم افسانہ نگاروں نے ان موضوعات کو touch کرنے کی کوشش ذرا کم کی ہے۔ عورت کے تصور میں ان کے یہاں پاکیزگی اور طہارت کا لحاظ عام طور سے رکھا گیا ہے۔

Prof. (Mrs.) Quamar Jahan
3-Bhikanpur, Bhaglapur- 812 001
Mob.: 9431422270, 0641-2420112

پروفیسر نبی احمد

لطیف الرحمٰن کی نسّاخ شناسی پر اِک نظر

تحقیق ایک مشکل عمل ہے اور اس کے اقتضائے فن کو برتنا کارِ دشوار ہے۔ مواد کی صحّت عرق ریزی کے ساتھ ساتھ محقق کے ادراکِ تحقیق پر منحصر کرتی ہے۔ صحت مند مواد کی فراہمی کے بغیر اعلیٰ وعمدہ تنقید معرضِ وجود میں نہیں آسکتی۔ اگر نقاد محقق بھی ہو تو یہ انحصار قدرے کم ہو جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ہر نقاد ایک محقق بھی ہوتا ہے مگر اس کی یہ تحقیق متن سے زیادہ تعلق رکھتی ہے۔ مواد سے کم۔ جب کہ ہر محقق اعلیٰ پائے کا ناقد نہیں ہوتا ہے۔ البتہ تنقیدی شعور اس کا بھی بیدار ہوتا ہے۔ تاہم اس کی زبان و بیان میں تنقید کی ترشی یا سقّا کی نہیں ہوتی ہے اور نہ وہ تنقید کے مختلف دبستانوں سے وابستہ ہوتا ہے۔ اس کی نظر مواد و متن کی صحّت پر اس قدر مرکوز ہوتی ہے کہ وہ اصولِ نقد کی پاسداری کا متحمل نہیں ہو پاتا۔ بقول شخصے ؎

جس کی جو حد ہے، اسی حد میں رہے تو بہتر
نیم کے پیڑ سے انگور نہ مانگا جائے

بلا شبہ سرزمینِ بنگال اردو کے دبستان کی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس کے باوجود معیاری شعرا کا جمِ غفیر بنگال میں نظر آتا ہے وہ خوش آئند اور مسرت آمیز ہے۔ سید لطیف الرحمٰن نے بنگال کے اردو شعرا کے جو نمونے پیش کیے ہیں وہ سرزمینِ بنگالہ کو دبستان کا درجہ دلانے کے لیے کافی ہیں۔ ان شعراء پر دبستانِ دہلی کے اثرات گہرے طور سے مرتسم نظر آتے ہیں۔ تاہم دبستانِ لکھنؤ کے لسانی اور بدیعی خصائص کے بھی کئی شعرا مقلّد نظر آتے ہیں۔ بنگال کی سنگلاخ زمین میں اردو شعر وادب کی نشو ونما اور فروغ کے متعلق سید لطیف الرحمٰن نے حیرت کے ساتھ ساتھ توجیہہ بھی بیان کرتے ہوئے ''نسّاخ سے وحشت تک'' کے تیسرے ایڈیشن کے دیباچہ ''سخنہائے گفتنی'' (ترمیم شدہ) میں لکھا ہے :

''ہمارے اردو ادب کا بڑھتا ہوا سیلاب اپنے مرکزی مقامات سے نکل کر پورے غیر منقسم ہندوستان پر چھا گیا۔ اس نے بنگال کو بھی اپنے حلقۂ اثر میں لے لیا اور سرزمینِ بنگالہ کی ایسی آبیاری کی کہ بنجر زمین لہلہا اٹھی۔ بنگال صرف یہی نہیں کہ اردو کے مرکزی مقامات سے بہت دور واقع ہے بلکہ یہاں کے عوام وخواص کی مادری زبان یعنی بنگلہ کا مزاج، لب ولہجہ اور

اسالیبِ بیان اردو زبان سے اس قدر مختلف ہیں کہ بنگال میں اردو زبان کا بار پانا، پنپنا اور چند مقامات میں مقبولِ عوام اور محبوبِ خواص ہونا ناممکن سی بات تھی لیکن زبان اردو کی شعریت، غنائیت، لطافت، حلاوت، رنگینی اور عام فہمی کا جادو بنگال اور بنگال والوں پر ایسا چلا گیا کہ بنگال کے خالص بنگالی گھرانوں میں بھی اردو کے بڑے بڑے شاعر پیدا ہوئے......''

سید لطیف الرحمٰن کی مذکورہ دلیلیں اثر دار ہیں مگر دو توجیہات قابلِ گرفت ہیں۔ (۱) اول یہ کہ بنگال اردو کے مرکزی مقامات سے دور ہے اور (۲) دوم یہ کہ بنگلہ کا مزاج، لب ولہجہ اور اسالیبِ بیان جداگانہ ہیں۔ جنگِ پلاسی (۱۷۵۷) اور جنگِ بکسر (۱۷۶۴) کے بعد سے ہی کلکتہ کو انتظامی اور سیاسی مرکزیت حاصل ہوگئی تھی اور نواب واجد علی شاہ کی کلکتہ میں نظر بندی کے دوران ہی لکھنؤ کے شعرا وادبا کلکتہ کے مٹیا برج منتقل ہو گئے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب بہار، اڑیسہ، آسام سبھی غیر منقسم بنگال کا حصّہ تھے۔ آج کا بنگلہ دیش بھی اسی کا جزوِ لاینفک تھا۔ اسی دور میں دبستانِ عظیم آباد اپنے عروج پر تھا جو بنگال کے ہی ماتحت تھا۔ یہ دبستان شمالی ہند کے دو دبستانوں، دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کے مدمقابل رہ کر بھی ان کے متوازی اپنی علاحدہ مرکزیت واہمیت قائم کیے ہوئے تھا۔ اس طرح بنگال دبستانِ عظیم آباد کا سرپرست تھا۔ ایسی صورت میں بنگال کا اردو کے ادبی مرکز سے دور ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔

دوسرے یہ کہ موجودہ شمالی ہند کی اردو پٹی شمال میں پنجاب سے لے کر شمال مشرق میں بہار تک پھیلی ہوئی ہے اور جسے دوآبۂ گنگ وجمن بھی کہا جاتا ہے۔ اس لیے مغربی بنگال بھی اسی شمال مشرقی اردو پٹی سے متصل ہے۔ اگر مرکزی مقام سے زیادہ دور ہونے کا مطلب دہلی ولکھنؤ سے دور ہونا ہے، تو سید لطیف الرحمٰن حق بجانب ہیں۔

یقیناً ہر زبان کا اپنا مخصوص مزاج ومنہاج ہوتا ہے۔ البتہ دو زبانیں اگر ایک ہی خاندانِ السنہ کی زائدہ ہوں تو ان کے درمیان انفرادیت ویگانگت کے باوجود ایک طرح کی لسانی اجتماعیت اور مماثلت ہوتی ہے۔ چونکہ اردو اور بنگلہ زبانیں بھی ہند، یورپی خاندانِ السنہ کی ہند ایرانی شاخ کی ایک ذیلی شاخ ہیں۔ یہ انڈک کے نام سے بھی معروف ہیں۔ SIL Institute کی 2005 کی تحقیق کے مطابق ہند آریائی زبان میں ۲۰۹ر زبانیں شامل ہیں۔ ہندوستانی یعنی اردو و ہندی سب سے بڑی زبانیں ہیں۔ جس کے ۶۴ کروڑ بولنے والے ہیں۔ اس خاندان میں دوسرے نمبر پر آنے والی زبان بنگالی ہے جس کے بولنے والے ۲۶ کروڑ ہیں۔ اس تحقیق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اردو اور بنگلہ دونوں زبانیں ہند آریائی خاندانِ السنہ کی زائدہ ہیں جس کی وجہ سے دونوں میں یک گونہ غنائیت اور شیرینیت ہے۔

ISSN. 2582 - 3612

''نسّاخ سے وحشت تک'' ایک عظیم تحقیقی کارنامہ ہے اس میں بنگال میں اردو شعروادب کی تقریباً دوسوسالہ تاریخ تذکرے کی صورت میں مرتب کی گئی ہے۔ اردو ادب کی تاریخیں جواب تک جمیل جالبی، اعجاز حسین، وہاب اشرفی وغیرہ نے مرتب کی ہے، ان میں بنگال کے شعرا کو کوئی جگہ نہیں دی گئی۔ ان محققوں نے اردو کے اہم مرکزوں اور دبستانوں تک ہی خود کو محدود رکھا ہے۔ کسی نے بہت کوشش کی تو وحشتؔ وغیرہ کی نمائندگی کرادی۔ مگر سید لطیف الرحمٰن نے تقریباً تمام معیاری شعرا کو اپنے صیغۂ تذکرہ میں لادیا ہے اوران کے بھرپور نمونے بصورتِ انتخاب بھی پیش کردیے ہیں۔ یعنی موصوف نے محض تحقیق کی خانہ پُری نہیں کی ہے بلکہ کماحقہٗ تحقیق کے فرائض ادا کیے ہیں۔ اس مرحلے میں وہ ایک معیاری اور معتدل محقق، مؤلف، مرتب، تذکرہ نگار اور تنقید نگار نظر آتے ہیں۔ عام طور پر محققین متن کو صحت کے ساتھ پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں اور تذکرے کی صورت میں رائے زنی کرتے ہیں مگر سید لطیف الرحمٰن نے اپنی بھرپور تنقیدی آرا بھی پیش کی ہیں۔ نسّاخؔ کے متعلق موصوف کے چند منتخب تنقیدی نکات ملاحظہ فرمائیں:

(۱) ''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ناسخؔ لکھنوی کا کلام سراسر آورد ہے۔ یہی حال ان کے حریف کے کلام کا بھی ہے۔ نسّاخؔ کا مذاق سخن لکھنوی تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ بجائے آتشؔ کے ناسخؔ سے متاثر تھے۔ اس لیے وہ ناسخؔ ہی کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نسّاخؔ بھی بجائے دل کے دماغ سے شاعری کرتے تھے......''

(نسّاخؔ سے وحشت تک : ص۵۹)

(۲) ''......ظاہر ہے کہ جب صنائع لفظی، الفاظ کی بازی گری، سنگلاخ قافیہ ردیفیں کمالاتِ شاعری ٹھہریں تو شاعری نام ہوا کاوشِ دماغی کا اور قافیہ پیمائی شاعری کا سب سے بڑا عنصر قرار پائی۔ یہی وجہ ہے کہ نساخؔ کے کلام میں بجائے روحانی کیف اور قلبی تاثرات کے معشوق کے خارجی اوصاف، جمالِ جسمانی اور لوازماتِ آرائش بیش تر پائے جاتے ہیں......''　(ایضا : ص۶۰)

تنقید کا یہ بے باکانہ اور بے لاگ انداز موصوف کو محض تذکرہ نگار کی صف میں نہیں رہنے دیتا۔ انھوں نے کسی مرحلے میں نہ تو قصیدہ گوئی کو راہ دی ہے اور نہ ہجویہ رویّہ اپنایا ہے۔ کلیم الدین احمد جن تذکروں کو دیکھ کر یہ کہنے پر مجبور ہوئے تھے کہ اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے۔ یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر۔ میرے خیال سے اگر ''نسّاخؔ سے وحشت تک'' کا مطالعہ موصوف نے کیا ہوتا تو شاید اتنی سخت گیری سے کام نہیں لیتے۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے حق بہ جانب ہوکر کہا ہے کہ :

''آپ نے ایک نئے ڈھنگ سے بنگالی شعرائے اردو کا تذکرہ مرتب کیا

ہے اور بہت مفید خدمت انجام دی ہے۔ ہماری تاریخ کا یہ پہلو ابھی تک پردۂ خفا میں تھا۔ آپ نے بڑے سلیقے سے بنگال کے اکابر شعراء کو روشناس کرایا ہے اوران کے کارناموں کی صحیح قدرو قیمت متعین کی ہے''

(نسّاخؔ سے وحشت تک، ص۲۵۳)

مذکورہ اقتباس میں میں تین بے حد اہم باتیں ہیں جو سید لطیف الرحمٰن کو اعلیٰ درجے کا محقق اور بلند پائے کا نقاد ثابت کرتی ہیں :

(۱) یہ ایک نئے ڈھنگ کا تذکرہ ہے یعنی روایتی تذکرہ نہیں ہے۔

(۲) اگر یہ کتاب منظرِ عام پر نہ آتی تو اردو ادب کی تاریخ کا ایک اہم پہلو پردۂ خفا میں رہتا۔

(۳) سید لطیف الرحمٰن نے اکابر شعرائے بنگال کی صحیح قدرو قیمت کی تعین کی ہے۔

مذکورہ نکات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سید لطیف الرحمٰن تحقیق و تنقید کے امور واصول سے بدرجۂ احسن واقف ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ نسّاخؔ سے وحشت تک میں جن شعرا کا انتخاب پیش کیا گیا ہے، ان کا فرداً فرداً مطالعہ ومحاسبہ کیا جائے اوران کا مقام متعین کیا جائے گویا　ع

''صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے''

Prof. Nabi Ahmad
Professor
Deptt. of Urdu
J.P. University, Chapra - 841 301
Mob : 9631957798

ڈاکٹر ممتاز احمد خان

علیم اللہ حالی کی نظم ''ہوا سے ایک گفتگو'': تجزیاتی مطالعہ

علیم اللہ حالی جدید اردو شاعری کا ایک معروف، معتبر اور مستند نام ہے۔ ان کے کلام کے تین مجموعے ''سفر جلتے دنوں کا'' (۱۹۷۸ء)، ''نخلِ جنوں'' (۱۹۸۹ء) اور ''لفظ، آواز، صورت گری'' (۲۰۰۰) ''عکسِ خواب'' (۲۰۱۵ء) شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے شاعری کے علاوہ تنقیدی مضامین بھی خاص تعداد میں لکھے ہیں اور ان کے ایسے مضامین کے دو تین مجموعے احتساب، اعتبار اور شاخیں کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ پرویز شاہدی پر ان کی یک موضوعی کتاب اپنے معیاری تحقیقی اسلوب اور گراں قدر تنقیدی مواد کی بنیاد پر حوالے کی کتاب بن چکی ہے۔ انھوں نے اپنا سفر نامہ ''ہم مسافر جہاں جہاں ٹھہرے'' کے نام سے لکھا ہے جس میں اسلوب کی شگفتگی اور مواد کی شائستگی پائی جاتی ہے۔ یہ تصنیف پروفیسر حالی کو ایک منفرد تخلیقی نثر نگار کی حیثیت سے سامنے لاتی ہے۔ علیم اللہ حالی ہمارے ان فن کاروں اور ادیبوں میں ہیں جو پوری زندگی نہایت یک سوئی، انہماک اور ذوق وشوق سے شعر وادب کی زلفیں سنوارتے رہے ہیں۔ وہ صلہ وستائش سے بے نیاز اور انعامات واعزازات سے بے پروا ہو کر خدمتِ ادب اور پرورشِ لوح وقلم میں مصروف ہیں۔ ان کی عمر ستّر سے تجاوز کر چکی ہے لیکن ان کا تخلیقی سرچشمہ ابھی خشک نہیں ہوا ہے۔ وہ آج بھی نثر اور شاعری میں اپنی نگارشات وتخلیقات شائقینِ ادب کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ ادب کے ایسے سچے عاشقوں کے کارناموں کا جائزہ لینا، ان کی قدر وقیمت متعین کرنا اور ان کی خدمتوں کو منظرِ عام پر لانا نئی نسل کے قلم کاروں کا فرض ہے۔ علیم اللہ حالی کی شاعری، تنقید نگاری اور دیگر ادبی خدمات کا الگ الگ جائزہ لیا جانا ابھی باقی ہے۔ ذیل کے سطور میں ان کی صرف ایک نظم کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

''ہوا سے ایک گفتگو'' علیم اللہ حالی کی نظموں کا تازہ مجموعۂ کلام ''لفظ، آواز، صورت گری'' کی ایک نمائندہ نظم ہے۔ اس نظم میں شاعر ''ہوا'' کو مخاطب کر کے اس سے التجا کرتا ہے کہ وہ اسے ایسی جگہ لے جائے جہاں خوشبوؤں کے تازہ وروح افزا مناظر ہوں، جہاں رنگ ونور ونکہت کے جلوؤں کا دیدار ہو۔ شاعر کی یہ آرزو ہے کہ وہ ایک حسین وجمیل اور معطر ومنور مقام پر پہنچ جائے جہاں کسی طرح کی گھٹن نہ ہو، جہاں المناک واقعات وسانحات دیکھنے کو نہ ملیں۔ شاعر اپنے گرد وپیش کی لہولہو واردات کو دیکھ کر ہراساں وخوف زدہ ہے۔ اس کی سانس رُکی رُکی سی ہے اور اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کی گردن کی سرحد کے قریب ہی قاتل کا ہاتھ

ہے۔ شاعر اپنے آس پاس کے بھیانک حالات سے نہ صرف بے زار ومتنفر ہے بلکہ وہ ان حالات سے خوف زدہ وسراسیمہ بھی ہے۔ اس کی دلی آرزو ہے کہ وہ ایک پر سکون فضا میں سانس لے، ایک ایسے مقام پر بود وباش اختیار کرے جہاں اسے اس بات کا اطمینان ہو کہ اس کے جان ومال، عزت وآبرو محفوظ رہے، اسے زندگی کی سچی خوشی کا احساس ہو اور اسے محسوس ہو کہ چمن میں ابھی شادابی اور خوشبو باقی ہے۔

۲۲ر چھوٹے بڑے مصرعوں پر مشتمل یہ مختصر سی نظم معاشرے کی موجودہ صورتِ حال سے شاعر کی بے اطمینانی وبے زاری کا کھلا اظہار ہے، ساتھ ہی ساتھ ایک مثالی پُرسکون وپُرفضا معاشرے کے حصول کی شدید آرزو کا اظہار بھی ہے۔ یہ نظم خالص تاثراتی نوعیت کی ایک دل نشیں وپُراثر تخلیق ہے۔ موضوع کے اعتبار سے اس نظم کا موازنہ اور تقابلی مطالعہ اقبالؔ کی نظم ''ایک آرزو'' اور ڈبلو بی ییٹس (W. B. Yeats) کی نظم ''دی لیک آئیل آف اِنِس فری'' (The Lake Isle of Innis Free) سے کیا جا سکتا ہے۔ اقبالؔ بھی اپنی نظم ''ایک آرزو'' میں دنیا سے اُکتا جانے اور دنیا کے حال احوال دیکھ کر اپنے دل کے بجھ جانے کا ذکر کرتے ہیں۔

دنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یارب !
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

اس لیے وہ انسانی آبادی سے بہت دور پہاڑوں کے درمیان ایک پُرسکون مقام پر جھونپڑا بنا کر رہنے کی تمنا کرتے ہیں۔

مرتا ہوں خامُشی پر، یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اِک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

علیم اللہ حالی بھی اپنے گرد وپیش سے اُکتا چکے ہیں، وہ ہوا سے کہتے ہیں :

ہوا مجھے خوشبوؤں کے تازہ
مشامِ جاں منظروں میں لے جا
ہوا مجھے رنگ ونور ونکہت
کا جلوۂ جاوداں دکھا دے
ہوا مجھے اِن فضاؤں میں
اِک گھٹن سی محسوس ہو رہی ہے
لہولہو واردات ساری
رکی رکی سی نفس کی راہیں

سڑی گلی بدبوؤں میں کب تک
میں اپنی سانسوں کو روک رکھوں

علیم اللہ حالی ہوا سے التجا کرتے ہیں کہ وہ انھیں ایسی جگہ لے جائے جہاں وہ خوف و دہشت کے جان لیوا احساس سے نکل کر زندگی کی فطری اور سچی خوشی ولذت کا احساس کر سکیں اور ان کو یہ یقین ہو کہ ابھی یہ دنیا جینے کے لائق ہے۔ حالی کی نظم میں اپنے گرد و پیش کے فرقہ وارانہ فسادات سے پیدا ہونے والے خوف و دہشت کی جانب بھی اشارہ ہے۔

ہماری گردن کی سرحدوں سے
ہے دستِ قاتل ابھی بھی باہر

اقبالؔ اور ییٹسؔ کی نظم میں شاعر اپنی زندگی سے مایوس اور اپنے سماج سے ڈرا ہوا نہیں ہے جب کہ علیم اللہ حالی کی نظم میں شاعر کو اپنی جان ہر وقت خطرے میں معلوم ہوتی ہے اور وہ امن و سلامتی کے لیے ترستا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ ہوا کو مخاطب کر کے آرزو کرتا ہے۔

کھلی فضا کا اِک ایسا لمحہ
مجھے عطا کر
جہاں رکوں۔ اور
ایک بھرپور سانس لے کر
یہ کہہ سکوں کہ
ابھی فضا میں
ہمارے جینے کے ساز و ساماں بھی ہیں میسر
ابھی مجالِ نفس ہے باقی
ہماری گردن کی سرحدوں سے
ہے دستِ قاتل ابھی بھی باہر
ابھی تلک زندگی ہے شاداں
ابھی تلک ہے چمن معطّر

انگریزی زبان کا مشہور شاعر ڈبلو بی ییٹسؔ (۱۸۶۵ء-۱۹۳۹ء) بھی اپنی نظم ''دی لیک آئل آف اِنس فری'' (The Lake Isle of Innis Free) میں تمنا کرتا ہے کہ وہ شہر اور انسانی آبادی سے دُور اِنس فری کے مقام پر جا کر رہے۔ یہ ایک ایسی جگہ ہے جو چاروں طرف سے بہت بڑی جھیل کے پانیوں سے

گھری ہوئی ہے۔

شاعر اس مقام پر ایک چھوٹا سا کمرہ بنا کر رہنا چاہتا ہے۔ وہاں اس کے جانے کا مقصد سکون و عافیت کی تلاش ہے۔ وہ شہر اور آبادی کی تھکا دینے والی بے رحم اور میکانیکی زندگی سے نکل کر فطرت کی آغوش میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ وہ ایک ایسے مقام کی تمنا کرتا ہے جہاں شہد کی مکھیوں کی گنگناہٹ، جھینگرے کی جھنکار اور ننھے ننھے خوش رنگ و خوش نوا پرندوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ اور سرسراہٹ سنائی دے۔ شاعر اپنے دل کی گہرائی میں اِنس فری جیسے مثالی و پُرسکون جزیرے کی طرف سے آتی ہوئی سمندر کی موجوں میں ایک بلاوا محسوس کرتا ہے اور عزم کرتا ہے:

I will arise and go now, and go to Innisfree,
And a small cabin build there, of clay and watt'les made
Nine bean rows will I have there, a hive for the honey bee,
And live alone in the bee-loud glade.

And I shall have some peace there, for peace comes dropping slow,
Dropping from the veils of the morning to where the cricket sings;
There midnight's all a-glimmer, and noon a purple glow,
And evening full of the linnets' wings.

I will arise and go now, for always night and day
I hear lake water lapping with low sounds by the shore,
While I stand on the roadway, or on the pavements gray,
I hear it in the deep heart's core.

ترجمہ : ''میں اُٹھوں گا اور اب چلا جاؤں گا، چلا جاؤں گا اِنس فری، اور وہاں ایک چھوٹا سا کمرہ مٹی اور نرکل کے پودوں کا بناؤں گا۔ (اپنے کمرے کے آس پاس) سیم کے پودوں کی نو قطاریں لگاؤں گا اور ایک چھتّا شہد کی مکھیوں کے لیے رکھوں گا۔ میں رہوں گا تنہا اُس پُرفضا مقام پر جہاں شہد کی مکھیوں کی گنگناہٹ ہوتی ہے۔

وہاں مجھے سکون حاصل ہوگا، اس لیے کہ سکون نازل ہوتا ہے آہستہ آہستہ صبح کے

پردوں سے، اس مقام پر جہاں جھینگر جھنجھناتا ہے۔ اس مقام پر آدھی رات چراغاں معلوم ہوتی ہے اور دوپہر ارغوانی چمک سے معمور ہوتی ہے اور وہاں کی شام لینٹ چڑیوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے بھری ہوئی ہوتی ہے۔

میں اُٹھوں گا اور چلا جاؤں گا اب، اس لیے کہ ہمیشہ دن رات میں سنتا رہتا ہوں جھیل کے پانیوں کو مدھم آواز کے ساتھ ساحل سے ٹکراتے ہوئے، جس وقت میں سڑک پر یا بھورے فٹ پاتھوں پر کھڑا رہتا ہوں، میں سنتا ہوں اُس آواز (بلاوے) کو اپنے دل کی گہرائیوں میں۔''

ییٹس، اقبال اور علیم اللہ حالی کی ان نظموں کے مطالعے کے بعد قاری پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ دنیا کا ہر شاعر ایک مثالی معاشرہ اور ایک آئیڈیل سماج کا خواب ضرور دیکھتا ہے۔ اس لیے کہ شاعر حُسن، صداقت اور خیر کا متلاشی و متمنی ہوتا ہے۔ شاعر وفن کار کو شر، کذب، بدصورتی، ظلم، جہالت اور ظلمت سے نفرت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کی بدصورتی کو نمایاں کرتا ہے اور ہر طرح کے جبر و جور، استحصال اور ناانصافی کو اُجاگر کر کے ایک مثالی اور خوبصورت معاشرے کا نقشہ کھینچتا ہے۔ وہ ایک یوٹوپیا (Utopia) بناتا ہے، ایک خواب دیکھتا ہے اور اپنے قاری کو بھی ایسا ہی خواب دکھانا چاہتا ہے۔ شاعر کی اور ہر انسان کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ تعصب و تعفن، ضلالت و جہالت، عداوت و نفرت کے گھٹن بھرے ماحول سے نکل کر علم و نور، نکہت و سرور، عدل و انصاف، محبت و اخوت، ہمدردی و دل داری کی شفاف و معطر فضا میں سانس لے۔ انسان کی خواہش پوری ہو چاہے نہ ہو، اس کے خواب اپنی تعبیر کے لیے چاہے ترستے ہی کیوں نہ رہ جائیں، لیکن انسان (فن کار) کو خواب دیکھنے اور آرزو کرنے کا حق کل بھی تھا، آج بھی ہے اور کل بھی رہے گا۔ اس کا یہ حق اُس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے
(چکبست)

فن کار کو ظلم کا کوئی علم بردار اسیر و مقید کر لے اور اس کے لبوں پر قفل ڈال دے تو ڈال دے، اس کی روح آزاد رہتی ہے اور اس کی روح کی چیخ فضاؤں کو لرزہ براندام کرتی رہتی ہے۔ فن کار کے خوابوں کو کوئی مقید و محبوس نہیں کر سکتا۔ فن کار جب زندان و سلاسل کے مرحلے سے گزرتا ہے تو وہ اپنے خوابوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے :

''میں اسیر ہوں لیکن/ تم کو کوئی بھی قانون/ قید کر نہیں سکتا/ سر بلند اور آزاد/

یوں ہی مسکراتے جاؤ/ میرے دل کی دنیا میں/ یوں ہی جگمگاتے جاؤ/ قید و بند کے جلّاد/
تم کو پا نہیں سکتے/ لمبے لمبے ظالم ہاتھ/ تم کو چھو نہیں سکتے/ اے میرے حسین خوابو!''

(ماخوذ از : نظم ''میرے خواب''، علی سردار جعفری)

شاعر و ادیب، صحافی و فن کار کی متاعِ لوح و قلم جب چِھن جاتی ہے اور اس کے اظہار پر پابندی لگا دی جاتی ہے تو وہ چیخ اُٹھتا ہے ۔

متاعِ لوح و قلم چِھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں اُنگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا، کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے
(''دستِ صبا''، فیض احمد فیض)

شاعروں کو مختلف خانوں میں بانٹ کر دیکھنا درست نہیں۔ غالب، اقبال، انیس، ورڈز ورتھ، شیلی، ییٹس، چکبست، فیض، سردار اور علیم اللہ حالی، سب ایک ہی قبیل کے ہیں، اس لیے کہ یہ سب بنیادی طور پر انسانی قدروں کے علم بردار اور رجز خواں ہیں۔ یہ سب حسن، خیر اور صداقت کے مبلغ و مغنّی ہیں۔ علیم اللہ حالی اپنی زیرِ مطالعہ نظم میں بھی حسن و خیر کا نغمہ گاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور رہ گئی بات تبلیغ کی، تو یہ بھی شاعر و فن کار کا منصب و مقدر ہے، چاہے کوئی اس سے کتنا بھی انکار کرے یا اسے ناپسند کرے۔

Dr. Mumtaz Ahmad Khan
Rtd. Associate Professor
University Deptt. of Urdu
B. R. A. Bihar University
Muzaffarpur - 842 001
Mob. : 96084 17347

ڈاکٹر جمال اُویسی

اجتبیٰ رضوی

اجتبیٰ رضوی کوئی بہت بڑے اکیڈمیشین نہیں تھے۔ملت کالج کے پرنسپل اور للت نرائن متھلا یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر رہ چکے تھے۔وہ علمی مشاغل کے آدمی نہیں تھے۔علمی مشاغل کے آدمی بہ ایں معنی کہ انہیں تدریسی زندگی میں کچھ ایسی دلچسپی ہرگز نہیں تھی کہ وقت بہ وقت سیمی نار اور سمپوزیم میں حصہ لیں۔شاید وہ ایسے پرنسپل بھی نہیں تھے جس کے اندر علمی تبحّر کے ساتھ ساتھ انتظامی امور کی خوبیاں بھی موجود ہوں۔ان کے زمانے کے بعض احباب نے بتایا کہ ان کی باتیں فلسفیانہ موشگافیوں سے پُر ہوا کرتی تھیں اور ان کی گفتگو میں ایمائی حسن پایا جاتا تھا۔یہ باتیں ثابت کرتی ہیں کہ اجتبیٰ رضوی ایک مفکر دماغ انسان تھے اور ہر وقت فلسفی یا شاعر ہی معلوم ہوتے تھے۔ایسے انسان سے کسی تعلیمی ادارے کو کیا فیض ہو سکتا تھا یہ اس وقت کے ان کے کلیگ ہی بتا سکتے ہیں۔یہ باتیں میں نے ضرور سنی ہیں کہ خواہ کسی بھی سبجکٹ کا کلاس ہوا گر خالی جا رہا ہے تو اجتبیٰ رضوی طلباء کو مجوزہ سبجکٹ پڑھا دیا کرتے تھے۔وہ انگریزی زبان و ادب، فلسفہ، اردو و فارسی شعر و ادب کے علاوہ تاریخ، سیاسیات، نفسیات وغیرہ کی کلاس بھی لے لیا کرتے تھے۔یہ معلوم نہیں ہو پایا کہ اجتبیٰ رضوی نے طبعیات(Physics) کی کلاسیں لی تھیں یا نہیں اور انہوں نے ریاضیات میں کس درجہ تک مہارت حاصل کر رکھی تھی؟ اگر وہ ان موضوعات کو بھی پڑھانے کے اہل ہوئے ہوتے تو یقیناً انہیں ہرفن مولا کہا جا سکتا تھا۔آج ان کی حیثیت ایک قد آور مابعد الطبیعاتی شاعر کی ہے۔دراصل اجتبیٰ رضوی وجدانی سطح کے انسان اور شاعر تھے۔ ہر وقت ایک بہاؤ کے صورت میں رہنا ہر شاعر یا ہر شخص کے اختیار میں کب ہوتا ہے۔لیکن یہ اجتبیٰ رضوی ہی تھے جنہوں نے روزمرہ کی زندگی کو وجدان یا الہام سے لبریز ہو کر گزارا۔ذہن کی کچھ ایسی ہی حالت جمیل مظہری کی بھی تھی۔بہت سے معاملوں میں جمیل مظہری اور اجتبیٰ رضوی مشترک تھے۔دونوں کے ذہنی دھاروں میں یکسانیت تھی۔دونوں کے بعض اشعار ملتے جلتے نظر آتے ہیں۔دونوں بے حد قریبی دوست بھی تھے۔اجتبیٰ رضوی کے اندر فلسفیت کچھ زیادہ تھی۔ان کے مدرکات علمی بھی تھے اور انفرادی بھی۔وہ علم کی سطح پر ایک باخبر انسان تھے۔حسی و درکی سطح پر عام انسان سے افضل تھے۔ان کا تخلیقی جوہر ان کی رباعیوں اور بعض غزلوں میں کھل کر سامنے آیا ہے۔ان کی رباعیوں میں فلسفیانہ موشگافیاں بیش از بیش ہیں لیکن جب ان رباعیوں میں کسی فکر یا فلسفہ کو مرکزی موضوع کے طور پر

تلاش کیا جاتا ہے تو یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ تشکیک ان رباعیوں کی فکری اساس ہے۔ہم لوگوں نے اب تک صرف علامہ جمیل مظہری کے حوالے سے تشکیک کے فلسفہ پر گفتگو کی ہے۔اجتبیٰ رضوی کی شاعری میں تشکیک کے عناصر کی تلاش مجھ سے قبل شاید کسی نے نہیں کی۔اجتبیٰ رضوی پر یوں بھی بہت کم لکھا گیا ہے اور جن لوگوں نے بھی ان کی شاعری پر قلم اٹھایا ہے ان کی شاعری کے اس فکری سرچشمہ کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے۔اجتبیٰ رضوی نے شاعری کی ابتدا اسلام و منقبت سے کی تھی۔اس وقت ان کی عمر پندرہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔۱۹۲۴ء سے انہوں نے غزلیں لکھنی شروع کر دیں۔ان کا گھرانہ علمی و ادبی پس منظر لئے ہوئے تھا۔ان کے والد فارسی و عربی زبانوں پر قدرت کے ساتھ شاعرانہ ذوق بھی رکھتے تھے۔وہ غزلیں لکھتے تھے۔داغ و امیر کی معرکہ آرائیوں میں شریک رہتے تھے۔منشی امیر اللہ خاں تسلیم اور صغیر بلگرامی کی صحبتوں میں بھی ان کی شرکت ہوا کرتی تھی۔میر و غالب اور آتش کے ماننے والوں میں تھے۔غزل لکھتے وقت یہ تینوں اکابرین ان کے تخلیقی ذہن پر چھائے رہتے تھے۔اجتبیٰ رضوی کے والد ہندوستان میں قومی اور ادبی رجحانات سے جڑے ہوئے تھے۔وہ اس لحاظ سے سرسید و حالی کے حامی و ہمنوا بھی تھے۔اجتبیٰ رضوی نے اپنے والد سے وراثت میں شاعری حاصل کی۔لیکن اس وراثت اور قدرت شعر گوئی کو ان کی شاعری کا سرچشمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ان کی زندگی میں دو عظیم سانحے رونما ہوئے جس کے سبب وہ ٹوٹ گئے اور مدتوں شعر گوئی کی طرف مائل نہ ہوئے۔پہلا سانحہ ۱۹۲۶ء میں ہوا جب ان کے صرف ڈیڑھ سال بڑے بھائی سید مجتبیٰ حسین انتقال کر گئے۔سید مجتبیٰ حسین کی شادی ان کی کم عمری میں کر دی گئی تھی۔شادی کے تین ہی سال بعد ۱۹۲۶ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔اس حادثہ کا اجتبیٰ رضوی پر بہت گہرا اثر ہوا۔۱۹۳۰ء میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔۱۹۲۹ء میں اجتبیٰ رضوی نے جی۔بی کالج مظفر پور سے بی اے کر لیا تھا۔لیکن والد کے انتقال کے بعد ان کی تعلیم جاری نہ رہ سکی لہٰذا انہوں نے ضلع اسکول چھپرہ میں عارضی ملازمت اختیار کر لی۔انہیں زیادہ دن اپنے باپ کی خدمت کرنے کا موقع نہ مل سکا۔اجتبیٰ رضوی کے مزاج میں رومانیت یا عشق پسندی بالکل نہ تھی۔ان کی شادی ۱۹۳۱ء میں ہو گئی۔انہیں اپنی اہلیہ سے بہت شدید محبت تھی۔شادی کے بعد انہوں نے وکالت کا امتحان پاس کیا، اور دوسرے پارٹ کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ ۱۸ر ستمبر ۱۹۳۶ء کو ان کی اہلیہ انتقال کر گئیں۔اہلیہ کے انتقال کے بعد ان کی طبعیت دنیا کی ہر شے سے روگرداں ہو گئی۔وکالت کا ارادہ ترک کر دیا۔ان کی زندگی میں ایک عظیم خلا پیدا ہو گیا تھا جو کسی طرح بھرا نہیں جا سکتا تھا۔اس درمیان علامہ جمیل مظہری نے جو ان کے دیرینہ دوست تھے انہیں کلکتہ بہ اصرار بلوا لیا۔وہاں کچھ دنوں تک اردو صحافت سے جڑے رہے۔۱۹۳۸ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کر کے چھپرا کے راجندر کالج میں لکچرر ہو گئے۔اہلیہ کے انتقال کے بعد اجتبیٰ رضوی نے مغرب کی سوسائیٹیوں کے مرتب کردہ

ISSN. 2582 - 3612

علم الارواح کا مطالعہ کیا۔انہوں نے کچھ نفسیاتی وروحانی تجربات بھی کئے۔لیکن یہ تجربات خودفریبی کے سوا حقیقت نہ تھے۔تھوڑے ہی دنوں کے بعد اجتبیٰ رضوی نے تھیاصوفیکل سوسائٹی کی ممبرشپ اختیار کرلی۔وہ ایک بزرگ رہنما بابو کیشور بہاری ورما کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوئے اوران سے گہرا اثر حاصل کیا۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۰ء تک تھیاصوفیکل سوسائٹی اور دیگر فلسفوں اور مذہبوں کا مطالعہ کیا۔انہوں نے تھیاصوفیکل سوسائٹی کے افکاروعقائد کی تبلیغ بھی کی۔اس تشکیلی عہد کے بعد ایک دورذاتی تجربات کا آتا ہے جس میں اجتبیٰ رضوی نے (جیسا کہ سنا جاتا ہے) کچھ روحانی تجربے کئے۔پھران کا مزاج فلسفہ اور روحانی خیالات کی تقلید سے مشتعل ہوکر اچانک اجتہاد کی طرف آمادہ ہوا۔۱۹۴۴ء کے آتے آتے ان پر جنون کی کیفیت طاری ہوگئی اور وہ گھر سے نکل کر گیا کی پہاڑیوں میں سے کسی پہاڑی میں جا کر روپوش ہوگئے۔ وہاں وہ شاید کسی خدائی کرشمہ کے منتظر تھے۔گیا کی پہاڑیوں سے واپس لوٹ کر آئے تو بولنا چالنا بالکل کم کردیا۔برائے ضرورت زبان سے کچھ کہتے تھے۔اس دوران اجتبیٰ رضوی کی شاعری پر بھی سکوت چھایا رہا۔میرا ذاتی خیال ہے کہ اجتبیٰ رضوی کے اندر اہلیہ کے انتقال کے بعد کئی ذہنی انقلابات آئے۔ان انقلابات میں عقاید کا انقلاب بھی شامل ہے۔اجتبیٰ رضوی نے ادیان ومذاہب کو شک بھری نظروں سے دیکھنا شروع کیا۔۱۹۴۴ء کے بعد جوان کے اندر فکری اجتہاد پیدا ہوا اس سے ان کی شاعری کے بنیادی عناصر تشکیل پاتے ہیں۔''شعلۂ ندا'' میں اس بات کا اشارہ موجود نہیں ہے کہ ان کی رباعیات کس دور شعر گوئی سے متعلق ہیں۔انہوں نے سلام ومنقبت سے شعر گوئی کی ابتدا کی تھی اور ۱۹۲۴ء سے غزل کہنے لگے تھے۔۱۹۳۹ء سے قبل تک ''صبح بنارس'' اور ''ہلال عید'' جیسی نظمیں انہوں نے لکھ لی تھیں۔تو یوں سمجھنا چاہئے کہ ۱۹۳۶ء تک اجتبیٰ رضوی کی غزلوں اور نظموں کا سرمایہ اکٹھا ہوجاتا ہے اور ۱۹۴۵ء کے بعد رباعیات تشکیل پاتی ہیں۔دراصل رباعیات ہی اجتبیٰ رضوی کا اصل شعری سرمایہ ہیں۔یہ اتنی مربوط اور محکم ہیں کہ ان کے مطالعہ کی روشنی میں اجتبیٰ رضوی کے فلسفۂ تشکیک کو کامیابی کے ساتھ باہر نکالا جاسکتا ہے۔یہ چند رباعیاں ملاحظہ ہوں :

جلوہ اندھیر ہے بس اور کچھ بھی نہیں　　ادراک کا پھیر ہے بس اور کچھ بھی نہیں
جو شعلۂ سیمیں نظر آتا ہے وہ چاند　　اک راکھ کا ڈھیر ہے بس اور کچھ بھی نہیں
یہ فلسفہ کیا ہے اعتبارات کا کھیل　　یہ تجربۂ نظر طلسمات کا کھیل
ہے جلوۂ حسن ایک مفروضۂ شوق　　عالم تو ہے صرف چند ذرات کا کھیل

یہ گمشدہ قافلوں کے میلے اے دوست　　یہ راہ تلاش کے جھمیلے اے دوست

یہ شورش رنگ و بو یہ طغیانِ نمود　　اس بھیڑ میں ہم رہے اکیلے اے دوست

فطرت کو دل تپاں بنایا ہوتا　　درد آگہ و ہم زباں بنایا ہوتا
جس بزم کا میہماں بنایا ہم کو　　اس کو تو مزاج داں بنایا ہوتا

ان رباعیوں کے درمیان سے ایک فکر آشنا اور ملتہب شاعر کا ہیولہ جھانکتا نظر آتا ہے۔اس کی پیشانی پر سلوٹیں ہیں۔گہرے وجدان وبصیرت کا اثر آنکھوں میں ہے۔ظاہر ہے یہ شاعر تشکیک میں گرفتار ہے۔لیکن یہ تشکیک علامہ جمیل مظہری کی خلق کردہ مثنوی ''آب وسراب'' کے موضوع سے مماثل نہیں ہے اور نہ ہی یہ تشکیک غالب کی شاعری کا ہے جس میں انسان کی پوری ذات سوال کے گھیرے میں ہے۔اجتبیٰ رضوی کی رباعیوں میں جس متفکر دماغ شاعر کا پرتو نظر آتا ہے وہ انسان کے وجود سے زیادہ کائنات کے مظاہر اور اس کے باہمی رشتوں پر اپنے شک وشبہہ کا اظہار کرتا ہے۔درج بالا رباعیوں میں پہلی رباعی ایک بڑے کائناتی مظہر کو جس بے معنویت سے تعبیر کرتی ہے اس کا کچھ نہ کچھ تعلق مغرب کے وجودی افکار سے بھی ہے۔دوسری رباعی میں جلوہ حسن کو ایک مفروضۂ شوق کہنا محض فلسفہ آشنائی نہیں ہے اس کے اعماق میں اجتبیٰ رضوی کی اپنی اہلیہ سے دائمی مفارقت تہہ نشیں ہے۔اجتبیٰ رضوی کی زندگی میں رونما ہونے والے دو تین المناک حادثوں نے ان کی شاعری کو موضوعاتی سطح پر قائم کردیا ہے۔ابتدا میں ان کی شاعری چند فلسفیانہ موشگافیوں کے سوا کچھ نہ تھی۔

دلوں کی بھی دھڑکنیں ملی ہیں نظر کی بھی ڈوریاں بُنی ہیں
صدائے پرواز ہوش آتی ہے ساز خاموشی بج رہا ہے
اسی انقلاب قدم قدم پہ حیاتِ نو کا مدار ہے
جو ہزار طرح کی گردشیں ہیں تو اک طرح کا قرار ہے
جسے ڈھونڈتے ہو وہ میہماں کہیں اور اٹھ کے چلا گیا
جو سرائے کہنہ میں رہ گیا ہے وہ کہنگی کا غبار ہے

یہ شاعری اس قسم کی ہے جیسے شاعر کچھ بامعنی بات کہنا چاہتا ہو لیکن کہہ نہ پاتا ہو۔مندرجہ بالا اشعار تشکیلی دور کے نمائندے ہیں۔ان میں شاعر کا اپنا فکر وتفکر تلاش کرنا بے سود ہے۔البتہ کچھ اشعار ایسے ضرور مل جاتے ہیں جن میں اجتبیٰ کی شاعری نے اپنا لہجہ دریافت کرلیا ہے۔اور یہ لہجہ فلسفہ آمیز، ربودگی کے پرتو سے لبریز اور ماورائی احساسات سے ہم آمیز نظر آتا ہے۔

گھپ اندھیرا ہے کیا قیامت ہے　　اک تبسم کی پھر ضرورت ہے

ISSN. 2582 - 3612

دل کی دھڑکن جو ہے مدار حیات　　اک ذرا تیز ہو تو آفت ہے
آگ پانی سے بھاپ اٹھتی رہی　　ہم سمجھتے رہے محبت ہے
انسان کو دل ملا مگر کیا　　اندھے کے ہاتھ میں دیا ہے
تیری دنیا کو ہم سنواریں　　یہ ایک عجیب ماجرا ہے

یہ شاعری پڑھنے والوں کے جذبات کی کسی نہ کسی سطح کو چھوتی ضرور ہے۔ ان شعروں میں جذب وفکر کی آمیزش کے باوجود ایک بکھراؤ کی کیفیت محسوس کی جاسکتی ہے۔ اگر اس نوع کی غزلیں اپنے تناظر میں ذرا پھیل جاتیں تو اجتبیٰ رضوی کسی نہ کسی سطح پر ٹینی سن کے قریب ہو جاتے اور ان کی شاعری مابعد الطبیعاتی جمالیات سے ہمکنار ہو جاتی۔ لیکن اس نوع کی شاعری کے لئے بھی ایک ربط باہم کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک ایسا ربط باہم جو اندرونی نظام کے آشکار کرنے میں ظاہری نقوش کی ترتیب سے پیدا ہوتا ہے۔ اجتبیٰ رضوی کی غزلوں میں ایک جوش اور تیز بہاؤ کے ساتھ گہرے فکری ارتعاشات اس وقت پیدا ہوئے جب ۱۸ر ستمبر کو ان کی اہلیہ داغ مفارقت دے گئیں۔ اہلیہ کے انتقال سے پہلے وہ ایک کیف کے عالم میں شعر کہا کرتے تھے۔ اہلیہ کے انتقال کے بعد عالم رنجوری میں شعر کہنے لگے۔ پھر ان کی طبیعت کی فتادگی اور ربودگی نے نئے عالم معنی سے آشنائی حاصل کرنا شروع کر دیا۔ نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

حاصل سعیٔ موج رنگ دیکھئے لالہ زار میں　　گل ہی سے آگ لگ چلی پیرہن بہار میں
پنکھڑیوں کو خاک پر دیکھ کے سن سے جی ہوا　　ان کو بہار کھا گئی آگ لگے بہار میں
شام ہوئی جلے چراغ اٹھ گئے راہ سے فقیر　　جن کا کہیں کوئی نہیں رہ گئے رہگزار میں
شام ہوئے پہ عادتاً مڑتے ہیں اک طرف کو ہم　　جیسے کہ اب بھی ہے کوئی صبح سے انتظار میں
رستے کی دوکان پہ رہرو ایک نشانی چھوڑ چلا　　جس کوزے سے پیاس بجھائی اس کوزے کو توڑ چلا
شوق کے کاروبار بہت پردیس میں پھیلا بھی نہ سکا　　دیس کے جانے والے بتا کیا لے کے چلا کیا چھوڑ چلا

ان اشعار میں اجتبیٰ رضوی کا تخلیقی ذہن نئی جہت اختیار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ اہلیہ کے انتقال کے بعد کے پہلے پڑاؤ کی شاعری کے چند نمونے ہیں۔ دوسرے پڑاؤ کی غزلوں میں تشکیک پورے طور پر چھائی نظر آتی ہے۔ ایسی غزلوں میں خدا کی ذات سے ناراضگی اور برہمی بھی صاف نظر آتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :

جنت کیا ہے ہوس کا دھوکا　　کیا ہوگی خوشی کہ غم نہیں ہے
سجدہ ہے کرشمۂ تصور　　مت کہہ کہ خدا صنم نہیں ہے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

پہنچ نہیں تو محبت کا حوصلہ کیا ہے　　خدا کے پوچھنے والے بتا خدا کیا ہے
طلب کی ذلت و بیچارگی معاذ اللہ　　مری خودی کا تشنج ہے یہ دعا کیا ہے
ہم اُٹھ کھڑے ہوئے دنیا سے جھاڑ کر دامن　　کہ ان بجھے ہوئے ذرات میں دھرا کیا ہے
زندگی کیا ہے فقط ایک جنون رفتار　　کہ سفر میں ہیں مگر وجہہ سفر یاد نہیں
ہائے یہ گم شدگی روح کی تقدیر میں تھی　　آج پوچھو کہ کہاں گھر ہے تو گھر یاد نہیں
جنوں کی کون سی بیتابیاں جہاں میں نہیں　　وہ ہو کہ صوت جرس میں ہے جو اذاں میں نہیں
لکھا ہوا انہی ذرات کے صحیفوں میں　　مرا فسانہ ہے لیکن مری زباں میں نہیں

مندرجہ بالا اشعار میں کچھ اشعار تو ایسے ہیں جنہیں اردو غزل کے بہترین اشعار میں جگہ دی جاسکتی ہے۔ تیسرے چوتھے اور پانچویں شعر میں جو تیور ہے اس نے شعریت میں اضافہ کیا ہے۔ چھٹا اور ساتواں شعر غزل کا بڑا بے پناہ شعر ہے۔ یہ دونوں اشعار وجودی فکر کے قریب ہیں۔ اجتبیٰ رضوی نے غزل میں کچھ توجہ کی ہوتی تو ایک بڑے غزل نگار بن سکتے تھے۔ ان کی غزلوں میں امکان پوشیدہ تھا۔ لیکن ان کی رباعیاں ان کے شعری سرمایہ میں سب سے اہم تخلیق کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ رباعیاں اجتبیٰ رضوی کے شاعرانہ مزاج کے قریب بھی ہیں۔ کچھ اور رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

احساس کے واردات جھوٹے نکلے　　حکمت کے مسلمات جھوٹے نکلے
پرکھا جو عقائد کو تو افسوس افسوس　　سچوں کے تصورات جھوٹے نکلے

جکڑا ہوا ابتلا کی زنجیروں میں　　تقدیر کی جان اسیر تدبیروں میں
یہ آدم ظلمت حسب و نور نسب　　اک خواب ہے الجھا ہوا تعبیروں میں

بیگانہ بھی سن لے آشنا بھی سن لے　　اس طرح نہ روکہ دوسرا بھی سن لے
فریاد نہ کر خودی کو رسوا کر کے　　حاصل نہیں کچھ اگر خدا بھی سن لے

ہے آج تک اپنی ہی نظر سے پنہاں　　اب تک اک راز ہے وجود انساں
وہ پھول کھلا کہ جس میں تہہ اندر تہہ　　باقی ہیں ہزار ناشگفتہ کلیاں

یہ رباعیاں اجتبیٰ رضوی کی پہچان قائم کرتی ہیں۔ ان میں ان کے ذہنی وفکری تجربے سموئے ہوئے ہیں۔ بعض تجربے تو نہایت قیمتی ہیں۔ اجتبیٰ رضوی کہیں باغی دکھائی دیتے ہیں اور کہیں مجتہد۔ کہیں نرے فلسفی اور کہیں سموچے شاعر۔ لیکن میں انہیں ایک جرأت مند شاعر تسلیم کرتا ہوں۔ ہر سچے اور تجربہ کار بلکہ تجربہ آشنا شاعر کے اندر ایک باغی چھپا رہتا ہے۔ اجتبیٰ رضوی کے یہاں بھی ایک باغی چھپا بیٹھا ہے بلکہ کئی جگہوں پر وہ اتنے عریاں طور پر سامنے آتا ہے کہ چھپائے نہیں چھپتا۔ اجتبیٰ رضوی کی نظموں میں ''صبح

ISSN. 2582 - 3612

بنارس'' اور ''ہلال عید'' کا ذکر اکثر لوگوں نے کیا ہے۔ لیکن ان کی دو نظمیں ''فریاد آدم'' اور ''در یتیم'' بے پناہ ہیں۔ ''فریاد آدم'' میں انسان اور فطرت کے مابین تصادم کو دکھایا گیا ہے۔ چند فلسفیانہ موشگافیوں کے سہارے انسان، خدا اور فطرت کے رشتوں کو متشکل کیا گیا ہے اور ان رشتوں میں جو پیچیدگیاں اور بیتابیاں ڈال دی گئی ہیں وہ قابل دید ہیں۔ در یتیم میں دردمند دل شاعر نے یتیموں کی زندگی کی محرومیوں کو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ اس نظم کی خوبی شاعر کے جذبہ کی صداقت ہے۔ وہ اپنے تجربوں کا درد انگیز اظہار کرتا ہے۔ ''شعلۂ ندا'' (۱۹۵۴ء) میں رباعیات، نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ ہر صنف شاعری میں انہیں مہارت حاصل ہے۔ لیکن رباعیات اجتبیٰ رضوی کا صحیح شناخت نامہ پیش کرتی ہیں۔ ان رباعیوں میں ایک گہرا، خوددار، فلسفہ آشنا اور حکیم شاعر رونما ہوا ہے۔

Dr. Jamal Owaisi
Head
Deptt. of Urdu
M. R. M. College
Darbhanga (Bihar)
Mob. : 7352284181

ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر

ساقی نامہ کی فنّی و فکری خوبی

''ساقی نامہ'' علاّمہ اقبالؔ کی ایک لازوال نظم ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں فکرِ اقبالؔ کے جملہ خدوخال بے نقاب نظر آتے ہیں۔ اُن کے خیالات، اِحساسات، اور مُشاہدات کی دِل آویز تصویر کشی اِس نظم میں موجود ہے۔ یہ ایک ایسی نظم ہے جس میں فکر ہے، فلسفہ ہے، تہذیبی اور سماجی شعور ہے اور ایک واضح نقطۂ نظر موجود ہے۔ اِس کی بنیاد خیالوں پر نہیں اُستوار ہے بلکہ اَز اوّل تا آخر اس میں حقیقت ہی حقیقت ہے۔ ''ساقی نامہ'' میں کشمکشِ حیات کی صحیح آئینہ داری ملتی ہے۔ زندگی کو سَنوارنے اور ماحول کو آراستہ کرنے کا شدید احساس اس میں پایا جاتا ہے۔ یہ ایک بھرپور اور ہمہ گیر نظم ہے۔ اس میں مَوضوع کا جلال اور فن کا کمال موجود ہے۔ اَفادی اور جَمالیاتی پہلوؤں کی ایسی مکمّل ہم آہنگی دوسری جگہ نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

''ساقی نامہ'' کا آغاز موسمِ بہار کی تصویر کشی سے ہوتا ہے۔ لیکن یہ بہار صرف موسم کا نام نہیں ہے بلکہ تبدیلی کی علامت اور نئی زندگی کا اِشارہ ہے۔ علاّمہ حالات کی تبدیلیوں کو دیکھتے ہیں۔ چپّہ چپہ پر عروسِ بہار خیمہ زَن دکھائی دیتی ہے۔ ساری دُنیا رنگ و نِکہت میں ڈوبی نظر آتی ہے۔ ہوا میں ایک خاص مستی محسوس ہوتی ہے۔ آبشاروں میں بَلا کی سی تیزی ہے۔ اِس منظر کو دیکھ کر شاعر بے حد متاثر ہوتا ہے۔ لہٰذا علاّمہ اپنے ساقی سے ایک ایسی شراب کا تقاضہ کرتے ہیں جس کے پیتے ہی تمام حجابات اُٹھ جائیں اور ضمیر کائنات منوّر ہو اُٹھے۔ ایسی شراب جس کے پیتے ہی زندگی کا راز آشکار ہو جائے اور انسان ہمت و حوصلہ کا پیکر بن جائے۔ اِسے نبرد آزمائی کی قوت مِل جائے۔ اور وہ مَصافِ زندگی میں دلِ رعنا اپنے مدّ مقابل سے مقابلہ کے لیے نکل پڑے۔ لہٰذا علامہ اقبالؔ کہتے ہیں ؂

اُٹھا ساقیا ! پردہ اِس راز سے !
لڑا دے مَمولے کو شہباز سے

علاّمہ اقبالؔ نے مختلف مذاہب کی زندگی اور مغربی ممالک کی سیاسی بازی گری کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا تھا۔ انہیں اقوامِ عالم کے نظامِ حیات اور نظام اقتدار سے بیزاری تھی۔ سرمایہ دارانہ نظام سے

وہ خوش نہیں تھے۔لہٰذا انہوں نے شدّت سے یہ محسوس کیا کہ فرنگیوں کی مکّاری اب صیغۂ راز میں نہیں رہی۔ سرمایہ داری آخری سانس لے رہی ہے۔مَداری کی طرح تماشہ کر کے یہ نظام اپنی موت مر چکا ہے۔چین اور ہندوستان دونوں مَمالک میں بیداری کی کِرن پھوٹ چُکی ہے۔لہٰذا کہتے ہیں کہ ؎

گیا دَورِ سَرمایہ داری گیا
تَماشا دِکھا کر مَداری گیا
گِراں خواب چینی سَنبھلنے لگے
ہِمالہ کے چَشمے اُبلنے لگے

اِن تاریخی اور سیاسی پسِ منظر میں یکا یک اقبالؔ کی توجہ اَپنی قَوم کی طرف مَرکوز ہوتی ہے۔مسلمانوں کی زَبوں حالی دیکھ کرانہیں بے حَد صَدمہ ہوتا ہے۔علاّمہ یہ سوچ کر مُتحیّر اور مُتاسِّف ہوتے ہیں کہ سارا عالم بیدار ہو چُکا ہے اور قومِ مُسلم میں تبدیلیوں کی کوئی عَلامت نظر نہیں آتی گرچہ یہ قوم مُوحِّد ہے مگر اِس کا دِل ابھی پاکیزہ نہیں ہوا ہے۔مُسلمان ہونے کے باوجود اِس نے بہت سارے بُت تراش رکھے ہیں اور بُت پَرستی اِنکا شِعار ہے یعنی مُسلمانوں کی شَریعت، اُن کے تمدّن اور تَصوّف پر جمی چھاپ ہے۔یہ پوری مِلّت خُرافات میں اُلجھی ہوئی ہے۔اِن کے خطیبوں کی زَبان سے تاثیر ختم ہو چُکی ہے۔ان کے صُوفی بے راہ رَوی کے شکار ہیں۔ان تمام بدحالیوں اور بَداَعمالیوں کے سَبب پر غور کرنے کے بعد علاّمہ اِس نتیجے پُر پہنچتے ہیں کہ مُسلمانوں میں مُردنی اور بَداَعمالی اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ اِن کا دل آتشِ عِشق سے خالی ہو چُکا ہے یعنی یہ قَوم راکھ کا ڈھیر بن چکی ہے۔جیسا کہ شعر زیریں سے واضح ہوتا ہے ؎

بُجھی عِشق کی آگ اَندھیر ہے
مُسلمان نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

چونکہ اقبالؔ ایک رَجائی (Optimist) شاعر ہیں۔لہٰذا مُسلمانوں کی اَبتری اور زَبوں حالی سے مایوس نہیں ہوتے کیونکہ وہ اپنی قَوم کے مُتعلق یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ ؎

نہیں ہے نا اُمید اقبالؔ اپنی کِشتِ ویراں سے
ذَرا نَم ہو تو یہ مِٹّی بہت زَرخیز ہے ساقی !

چنانچہ اپنے ساقی سے جسے حالات کو آنِ واحد میں تبدیل کرنے کی پوری قدرت ہے، تقاضہ کرتے ہیں کہ ؎

شَرابِ کُہن پھر پِلا ساقیا!
وَہی جامِ گردش میں لا ساقیا

اَور وہ کُس شَراب کے مُتقاضی ہیں۔اس کی وضاحت وصَراحت کے لیئے یہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے ؎

تَڑپنے پھڑکنے کی توفیقِ دے
دلِ مُرتضیٰؓ سوزِ صِدّیقؓ دے

علاّمہ اپنے ساقی سے جس بادۂ کُہن کا مطالبہ کر رہے ہیں وہ بادہ اُن کے اَسلاف کے کارنامے ہیں، ماضی کی رَوایات ہیں۔اقبالؔ اَپنے اَسلاف کے نقشِ قدم پر چل کر مراحل حیات کو طے کرنا چاہتے ہیں۔اُن کے دل میں اَپنی قوم کے لیے ایک حقیقی محبت اور تڑپ ہے۔لہٰذا چاہتے ہیں کہ قوم کا ہر فَرد مَردِ حُر بن کر باعزّت زندگی گزارے۔اُن کے جوانان با جوہر بن جائیں۔اُن کی شِریانوں میں صَداقت وشَرافت، شُجاعت و دَیانت اور اِخلاق ومروّت خون بن کر دوڑ جائے تاکہ انہیں اپنی زندگی کی سمجھ آ جائے۔اِن پر حیات وموت کے اَسرار کُھل جائیں۔دراصل علاّمہ ملّت اِسلامیہ میں زندگی کی پوری توانائی دیکھنا چاہتے ہیں۔اِس لئے اُنہوں نے اپنے جَذبات کی ترجمانی والہانہ انداز میں کی ہے۔وہ زندگی میں جَمود اور تَعطّل کے قائل نہیں ہیں۔اِس لیے وہ مُسلمانوں کے اندر اِنقلاب دیکھنا چاہتے ہیں۔

اِن خیالات وتصورات سے گزرنے کے بعد اقبالؔ کو اَچانک زندگی کا خیال آتا ہے۔چنانچہ وہ زندگی کے رُخ سے نقاب کشائی کرتے ہیں۔زندگی کے متعلق اقبالؔ کا فلسفہ اور لوگوں سے بالکل جُداگانہ ہے۔اوروں کے یہاں زندگی کا اِتنا حَسین اور بصیرت اَفروز رُخ نہیں پیش کیا گیا ہے جیسا کہ علاّمہ نے پیش کیا ہے۔اقبالؔ کی نگاہوں میں زندگی مُسلسل رَواں دَواں ہے۔اور کائنات کی کوئی بھی شے رَمِ زندگی سے خالی نہیں ہے۔اقبالؔ نے زندگی کی ایک حَسین تصویر پیش کرنے کے بعد اپنی عام روِش کے مطابق جوہر زندگی کو موضوعِ سُخن بنایا ہے۔چُنانچہ زندگی کے بعد خودی کی بات کی ہے۔زندگی اَگر تلوار ہے تو خُودی اُس کی دھار ہے۔خودی کے اِمکانات لامحدود ہیں۔اِس کی قوّت ووُسعت کا کوئی اندازہ نہیں۔چنانچہ علاّمہ کہتے ہیں ؎

یہ مَوجِ نَفس کیا ہے ؟ تلوار ہے
خودی کیا ہے ؟ تلوار کی دَھار ہے
خودی کیا ہے ؟ رازِ دَرونِ حَیات
خودی کیا ہے ؟ بیداریٔ کائنات

خودی کا نَشیمن ترے دِل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تِل میں ہے

ISSN. 2582 - 3612

علّامہ شاعرِ حیات ہیں۔ اُن کی شاعری میں بلا کی حیات اَفروزی اور غضب کا جوش وخروش موجود ہے۔ انہوں نے شاعری کا اِستعمال ذریعۂ اِبلاغ اور وسیلۂ اظہار کے طور پر کیا ہے۔ علّامہ اپنی قوم کی حالت کو یکسر بدل دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اَپنی شاعری کو ولولہ خیز بنا کر قوم کے سامنے پیش کیا تاکہ خوابیدہ قوم خوابِ گراں سے بیدار ہو جائے۔ اس کا جمود و تعطّل ختم ہو جائے۔ اِس کی غیرت جگ جائے اور یہ قوم پھر اپنے اَسلاف کی طرف باوقار بن کر اَقوامِ عالم پر چھا جائے۔ اِسی دِلی مقصد کو عوام تک پہنچانے کے لیے علّامہ نے اپنی شاعری کا سہارا لیا اور اِس طرح دَرسِ عمل دیا کہ ؎

تِری آگ اِس خاک داں سے نہیں
جہاں تُجھ سے ہے، تو جَہاں سے نہیں

بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طِلسمِ زمان و مکاں توڑ کر

کیونکہ

خودی شیرِ مولا، جہاں اِس کا صَید
زمیں اِس کی صَید، آسماں اِس کا صَید

نظم ''ساقی نامہ'' اَندازِ بیان، اَسلوب اور طرزِ اَدا کے اعتبار سے ایک مکمّل تخلیق ہے۔ بظاہر اِس کے رنگ و آہنگ کا تعلق روایات سے وابستہ ہے۔ لیکن غور سے دیکھنے پر اس میں ندرت بھی نظر آتی ہے۔ اِس کی علاماتی فضا ایک نئے مزاج کو ظاہر کرتی ہے۔ علّامہ نے پُرانی علامتوں کے ساتھ نئی علامتوں اور اِشاروں سے کام لے کر اپنی اعلیٰ فنکارانہ بصیرت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ فنّی روایتوں کی پاسداری اور فنکار کی ذاتی صلاحیتوں کی حسین ہم آہنگی دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ اِس نظم میں ماضی اور حال گلے ملتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کا آہنگ نہایت تیز وتُند ہے۔ اِس کی لَے نرم اور دھیمی نہیں ہے پھر بھی ہمارے دلوں میں یہ اُتر کر ایک خاص قسم کا اثر ڈالتی ہے۔ اِس نظم میں پیش کردہ تمام خیالات اپنے مَوضوع سے مکمّل ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ اِس میں مقصدیت یعنی اِس نظم میں غایتی پہلو خاص طور سے قابلِ تحسین اور لائقِ صد آفریں ہیں۔

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی

اماوس میں خواب : معاصر ہندوستان کا استعارہ

جدید اردو ناول نگاروں میں حسین الحق ایک اہم نام ہے مگر انہوں نے افسانے پر زیادہ توجہ دی اس لئے ان کے ناول کم اور طویل وقفے کے بعد آئے۔ حسین الحق نے اب تک تین ناول لکھے ہیں۔ پہلے ناول ''بولومت چپ رہو'' (۱۹۹۰) کا موضوع پرائمری و مڈل اسکول کی تعلیم اور سکنڈری لیول پر ایجوکیشن افسر کی نوکر شاہی ہے جس میں اسکول لیول پر بہار میں تعلیمی بدنظمی اور تعفن زدہ تعلیمی نظام کو اکسپوز کیا گیا ہے۔ دوسرا ناول ''فرات'' (۱۹۹۲) نئی زندگی اور نئی Sensibility کا اچھا ناول ہے جس میں ہم عصر ہندوستان کی تہذیب کے مختلف رنگوں اور ان کے ٹکراؤ کو سلیقے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ طویل گیپ کے بعد حسین الحق کا نیا ناول ''اماوس میں خواب'' (۲۰۱۷) آیا جو ایک بڑے کینوس پر لکھا گیا ہے۔ اس میں آزادی کے بعد کی سیاسی، سماجی صورت حال بھی ہے اور مسلمانوں کی زندگی میں پیش آئے تغیرات و انقلابات بھی۔ تعلیم کی کساد بازاری بھی ہے اور سیاست کی عیاری بھی۔ اس میں بھیونڈی، مالیگاؤں، بھاگلپور، بابری مسجد، گجرات، لو جہاد، گئو رکچھا سب کچھ موجود ہے اور ان سب کو خوبصورتی سے قارئین تک پہنچانے کے لئے اسماعیل، قیدار، نائلہ اور رمیش جیسے مضبوط کردار بھی تراشے گئے ہیں۔ آزادی کے بعد سے اب تک کی ہندستانی تاریخ کو ایک سیکولر اور غیر جانبدار نقطہ نگاہ سے دکھانے کے لئے ایک بڑے کینوس اور ہزاروں صفحات کی ضرورت تھی مگر حسین الحق نے ایک ماہر فنکار کی طرح استعارے، تمثیل اور علامت کی زبان دے کر بڑی خوبی سے ۳۴۷ صفحات میں سمیٹ دیا ہے۔ یہاں ماضی اور اس کی قدریں، اسلاف کی تہذیب، مشترکہ ثقافت خواب کی صورت جلوہ گر ہوتی ہیں جسے تعبیر کی صورت میں اسماعیل سے نائلہ تک تین نسلیں پانا چاہتی ہیں، مگر کیا کیجے کہ ملک نے اپنے اوپر نفرت، سیاست اور دشمنی کے اماوس کی وہ چادر تان رکھی ہے کہ تعبیر کا چاند نکل ہی نہیں پاتا۔ حسین الحق نے اس ناول میں بیانیہ کا خوبصورت استعمال کیا ہے۔ اس کا ڈکشن استعارے اور تمثیل کو نئی جہتیں دیتا ہے اور بیانیہ کو دلچسپ بنا دیتا ہے۔

۳۴۷ صفحات پر مشتمل اس ناول میں جیسا کہ میں نے کہا آزادی کے بعد سے آج تک کی ہندستانی تاریخ کے بین السطور کو پیش کرنے کوشش کی گئی ہے۔ آزادی کے بعد کا یہ عرصہ ملک کے لئے جیسے بھی تغیرات سے بھرا رہا ہو، انسان کے لئے ذہنی انتشار، قلبی خلفشار اور فکری اضطراب کا عرصہ رہا ہے جس کا

تعلق آج سے ہے اور آنے والے کل سے بھی۔ جمہوریت کے خوشنما لبادے میں قید فرد کی چھٹپٹاہٹ، بے چینی اور جھنجھلاہٹ مسلسل بڑھتی جارہی ہے۔ آج کا انسان جس کی زندگی آزادی کے بعد سے مسلسل عذاب کا شکار ہے، جس بے یقینی کا شکار ہے اور جن ناہمواریوں میں سانس لینے پر مجبور ہے اس کا تخلیقی اظہار اس ناول کا وصف ہے۔ اردو میں ہم عصر صورت حال پر ناول کم کم لکھے گئے ہیں۔ یہ ناول موجودہ سیاسی، سماجی، تہذیبی صورت حال کی عکاسی تاریخ کے بجائے تجربات کی روشنی میں کرتا ہے۔ اس میں ہر لحظہ بدلتی زندگی، ہر پل انقلاب سے دوچار معاشرے اور ہر گھڑی چونکانے والی حسیت کے اتنے مناظر سامنے آتے ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے ہم ناول کے بجائے وقت کے ساتھ سفر کررہے ہوں۔ اپنے آس پاس کی صورت حال کو حسین الحق نے جس جذباتی قوت اور غیر معمولی حسی شدت کے ساتھ محسوس کرکے اپنے ناول کا حصہ بنایا ہے وہ اس ناول کو local situation based novel کے ساتھ ساتھ عالمی صورت حال کا آئینہ بھی بنادیتی ہے۔ دم توڑتی انسانیت، عصری سیاسی حسیت اور قدروں کا بکھراؤ ایسے عناصر ہیں جو اگرچہ مقامی تناظر میں ناول کا حصہ بنے ہیں مگر بڑی آسانی سے قاری کے فکری منطقے کو عالمی صورت حال تک بھی پہنچانے کا وصف رکھتے ہیں۔

ناول کا انتساب ''مادر وطن ہندستان کے نام'' کیا گیا ہے اور نیچے شعر درج ہے :

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے　　وہ قرض اتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے

یہ شعر ہی ناول کی روح ہے۔ اسماعیل ایک استعارہ ہے اس سماج کا جو آزادی کے بعد سے مسلسل منزل کی تلاش میں پل صراط سے گزر رہا ہے مگر دوسرا سرا دور دور تک دکھائی نہیں دیتا۔ اس سفر میں اس کے دل ودماغ میں ایک محشر بپا ہے۔ وہ گرتا ہے، زخمی ہوتا ہے، مگر ہمت نہیں ہارتا۔ شکست کھا کر بھی اُٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ اسے وہ قرض اتارنے ہیں جو نہ ہوتے ہوئے بھی اس پہ واجب قرار دے دیئے گئے ہیں۔ دراصل گزشتہ نصف صدی کا عہد ہی قیامت جیسے انتشار اور افراط وتفریط کا ہے۔ اس عہد میں جنم لینے والی بیشتر ناہمواریاں مصنف کی نگاہ میں رہی ہیں اور وہ اپنے عہد کی ہر تصویر کا گواہ ہے۔ اس لئے سیاست، سماج، کرپشن، فساد، مذہب، فلسفہ اور عہد حاضر کے تمام تغیرات جب اس کے قلم کی زد میں آتے ہیں تو زندہ مناظر کی صورت سامنے سے گزرتے ہیں اور قاری کے لئے یہ مناظر صرف ماضی کی بازیافت نہ رہ کر موجودہ صورت حال اور اس کی معنویت کا استعارہ بن جاتے ہیں۔ ناول سے کہانی اخذ کرنا مقصود ہو تو وہ چند سطروں میں بیان کی جاسکتی ہے کہ اسماعیل مرچنٹ فسادات کے بعد دربدر بھٹکتا ہوا بالآخر جائے اماں کی تلاش میں 'بہار' پہنچتا ہے اور زندگی کی آزمائشوں سے جوجھتے ہوئے بم دھماکے کا شکار ہوجاتا ہے اور تقریباً یہی انجام اس کی اولاد کے ساتھ بھی پیش آتا ہے اور بس۔ مگر کہانی کے ساتھ ماضی قریب سے حال تک کا

تہذیبی اور معاشرتی سفر کرنا ہو تو بات چند سطروں سے نہیں بنتی ۔ پھر اس کا ہر صفحہ، اس کا ہر باب ایک نیا منظر لئے سامنے آتا ہے اور آپ کو مٹی کی محبت میں قرض اتارنے والے آشفتہ سروں کا سامنا کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس منظر نامہ کو پیش کرتے ہوئے مصنف کی نگاہ عہد حاضر کے چھوٹے چھوٹے واقعات و حادثات پر رہی ہے، اس لئے گاؤں سے ممبئی جیسے شہر تک کے مناظر اس سفر کا حصہ بنے ہیں۔ ناول کے ابتدائی تین ابواب گویا قصہ کی تمہید کا درجہ رکھتے ہیں، جس میں اماوس کا اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور جس سے جوجھنے، لڑنے اور باہر نکلنے کی چھٹپٹاہٹ، بے چینی واضطراب کی علامت۔ مگر یہیں سے کسی فلم کی سین کی طرح مناظر دامن پکڑنا شروع کردیتے ہیں۔ آیئے کچھ دور ہم بھی ان سچویشنز کا سامنا کریں۔

پہلا منظر۔ دربدر بھٹکتا ہوا اسماعیل جب بہار میں پناہ لیتا ہے تو اسے پٹنہ یونیورسٹی اپنے دامن میں پناہ دیتی ہے۔ جہاں دوستوں میں ایک طرف فیضان رسول میرانی ہے تو دوسری طرف انیل شرما۔ یہ وہ زمانہ ہے جب بہار میں ایم۔ وائی کی جوڑی سیاست میں دھوم مچا رہی تھی۔ ایک دن انیل شرما اور شوبھا کی لواسٹوری میں رقابت کی جنگ ہوتی ہے اور وہ گوالا کے بجائے اپنے دوست انیل شرما کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے :

''اِس سالے کو دیکھو، یہ میاں ہے سالا؟ یہ بھومیہار کا ساتھ دیتا ہے؟ سالا بھومیہار کا ساتھ دیتا ہے''

فیضان اُس وقت وہاں نہیں تھا، بعد میں پہنچا۔ اسماعیل نے تفصیل بتائی تو وہ ہنسنے لگا۔ اسماعیل پر جھنجھلاہٹ طاری ہوگئی۔ 'اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟ ارے یار! وہ سالا عشق کا معاملہ ہے، اس میں تم بلا وجہ کود گئے۔ مگر وہ لڑکا بھومیہار بھومیہار کیا کررہا تھا؟ وہ لڑکا گوالا ہے، بہار میں مسلمان گوالوں کے ساتھ ہیں اور گوالا بھومیہار کے خلاف ہے۔ اب تم گوالے کے خلاف جاکر اور بھومیہار کے ساتھ ہوکے لڑنے لگے تو اُس پر جھلاہٹ تو طاری ہونی ضروری تھی۔ یہ ایک نیا منظر نامہ تھا اور اسماعیل کو جگہ جگہ اس کا سامنا کرنا پڑا''

(ص۔۹۴)

یہ وہ منظر نامہ ہے جسے بہار کی حالیہ سیاست میں مرکزیت حاصل تھی۔ مسلمان اقتدار میں حصہ داری کے نشے میں جھوم رہے تھے۔ کالج کے ریزلٹ سے نوکری تک گوالوں کی حصہ داری میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اور اس کے لئے جواز یہ دیا جارہا تھا کہ جب تک برہمنوں، راجپوتوں اور بھومیہاروں کی چلی گوالوں کو تیسرا درجہ بھی نہیں دیا گیا، اب موقع ملا ہے تو کیوں نہ فائدہ اٹھائیں؟ اور رہی مسلمان کی تو وہ اسی میں خوش تھا کہ وزیر اعلیٰ اس کے بنائے کباب کھا رہے ہیں، بی جے پی کو کھری کھری سنا رہے ہیں اور

خانقاہوں، مزاروں کی تقریبات میں ٹوپی پہن کر شریک ہو رہے ہیں۔ اس میں کوئی فرق نہ کر سکا کہ وہ ٹوپی پہن رہے ہیں یا پہنا رہے رہیں۔

دوسرا منظر: جو کاسٹ لائن گوالوں اور مقابل اعلیٰ ذات کے درمیان پیدا ہوئی تھی وہ بڑھتے ہوئے اس منزل تک پہنچ گئی کہ گوالہ گردی اور نکسل تحریک سے مقابلہ کے لئے سن لائٹ سینا، ایم سی سی اور گولڈن آرمی جیسی سینائیں وجود میں آ گئیں۔ اسماعیل فیضان رسول کے ساتھ 'میران بیگہ' کا سفر کرتا ہے تو اس کے سامنے ایک اور دنیا آتی ہے جہاں ہندستان کی ۸۵ کروڑ جنتا دلت ٹولے میں ملتی ہے، شیو چرن سنگھ کا قتل چونکاتا ہے، ایم سی سی اور گولڈن آرمی میں پسماندہ بنام اعلیٰ نسب اقوام کا مقابلہ جنگ کی صورت اختیار کرتا ہے اور اس جنگ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے منہ میں زبان آ جاتی ہے جو صدیوں سے گونگے تھے۔ اور اس طرح اپنا ہندستان بدل رہا تھا :

''کمیونزم کے بارے میں وہ سنی سنائی باتیں افصح صاحب پر پٹخنے لگا تو وہ بولے، دیکھو موجودہ منظرنامے کو تم صرف کمیونزم کے واسطے سے نہیں سمجھ سکتے۔ ہندستان میں کچھ اور فکری دھارائیں بھی زیریں لہر کی طرح کام کر رہی ہیں، لوہیا جی نے سماجی انصاف پر جو تھیوری پیش کی ہے اس میں انہوں نے بہت صاف صاف لکھا ہے کہ ہندستان میں طبقاتی جدوجہد کو کاسٹ اورینٹڈ ہونا ہی پڑے گا۔ 'آپ کھلم کھلا ذات پات کی حمایت کر رہے ہیں'۔ اسماعیل نے بہت زور سے بدک کر کہا۔ تس پر وہ ہنسے اور بولے۔ 'گاندھی میدان کے ایک بڑے جلسے میں جے پرکاش نرائن نے کھلے عام کہا تھا۔ ''سوال سماجی انصاف کا ہے، وہ جس راستے سے آ سکے، اسی راستے سے اُسے لانا چاہیے۔''

تیسرا منظر: سیاست جب رنگ بدلتی ہے تو اس کے اثرات دور پا اور دیرپا ہوتے ہیں۔ بہار کی سیاست نے جہاں سماج کو فکر سطح پر بدل دیا وہیں انتظامی سطح پر بھی تبدیلیاں پیدا کیں۔ ساتویں باب میں ناول نگار نے مثال کے طور پر تعلیمی اداروں میں پیدا ہونے والی صورت حال کا منظرنامہ پیش کیا ہے۔ حکومت نے ۱۹۷۰ سے پہلے کے قائم کئے ہوئے کالجوں کو کنسٹی چوینٹ کرنے کا اعلان کر دیا تو ایک طرف انتظامی مسائل پیدا ہوئے اور دوسری طرف رشوت خوری، اقربا پروری کا بازار گرم ہو گیا۔ صلاحیت کی بجائے طاقت، غنڈہ گردی، پیسہ اور سیاست نے آگ پکڑ لی۔ پچھلے دروازے سے تقرری، فرسٹ پوسٹ، سیکنڈ پوسٹ کی لڑائی میں رشوت دینے والے کی فتح، تنخواہ میں کٹوتی کی تلوار، پروفیشنل کورسز کو بڑھاوا دے کر پیسہ اگاہی کا راستہ بنانا اور دھیرے دھیرے کالجوں سے علم کا غائب ہو جانا، اس منظرنامے کے اہم حصے ہیں :

''اُس رات اسماعیل کو بہت دیر تک نیند نہیں آئی۔ پہلی مرتبہ اُس کو اپنے پیشے سے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

اُکتاہٹ محسوس ہوئی۔ یہ کیسی نوکری ہے جس میں غنڈہ بدمعاش جاہل لفنگا سب گھس جاتا ہے۔ اگر اسی طرح لکچرر پروفیسر بنا جا سکتا ہے تو اتنی محنت، اپنے سبجکٹ کے بارے میں حاصل کی جانے والی مہارت، برسہا برس سے دن کا چین اور رات کا آرام حرام کر کے سارا شوق مار کر، کوڑی کوڑی بچا کر، اپنے سبجکٹ میں آنے والی نئی نئی کتابیں خریدنے کی اور گئی رات تک جاگ جاگ کر پڑھنے کی کیا ضرورت تھی؟ سب محنت کرنے والے گدھے ہوئے، ارون بھاٹیہ جیسے لوگ ہی عقلمند ہوئے نا، کہ ہلدی لگی نہ پھٹکری رنگ آیا چوکھا۔''

(ص۔۱۳۹)

چوتھا منظر: ہم عصر ہندستان کو ایک نئے رنگ میں رنگنے والا خوفناک واقعہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو وقوع پذیر ہوا جب بھیڑ جمع کر کے بابری مسجد شہید کر دی گئی۔ یہ ایک زوردار جھٹکا تھا اُن لوگوں کے لئے جو ملک کی جمہوری قدروں کے امین تھے۔ مگر مصنف نے کمال فنکاری سے شہادت کا واقعہ بیان کرنے کے بجائے معاشرے کی فکری صورت حال پر توجہ دی ہے۔ ''ایسی فضا کو کیا کہا جائے جس میں حبس ہو نہ کشادہو''۔ ایسی صورت حال میں کیا کیا جائے جب یہ ثابت ہو جائے کہ کچھ ثابت نہیں ہو سکتا۔'' یہ جمہوریت ہے یا جمورے کا تماشہ؟۔ کسی نے اسے مسلمانوں کی بداعمالی کا نتیجہ قرار دیا تو کسی نے مذہبی منافرت کے شعلوں کو ہوا دی۔ بات آستھا، عقیدے سے ہوتی ہوئی مذہب اور تصوف تک پہنچ گئی مگر نتیجہ یہی نکلا کہ نجات۔۔ سیاست، مذہب، عقیدہ اور تصوف کے بجائے بھگتی اور تصوف کی آمیزش میں ہے جو بت پرستی اور خدا پرستی سے زیادہ انسان پرستی کی راہ دکھاتی ہے۔ اور جو کہتی ہے مجھ سے کہا جبریل جنوں نے، یہ بھی وحی الٰہی ہے مذہب تو بس مذہب دل ہے، باقی سب گمراہی ہے مگر کسی کو یہ بات آسانی سے کب سمجھ آئی ہے۔ عام آدمی نہ تالا کھلوانے سے فکرمند ہوا اور نہ دیواروں کے ٹوٹنے سے متاثر ہوا، پن چکی چلتی رہتی ہے۔ اور لوگوں کے پاس اپنے مسائل کم ہیں کہ وہ پیٹ بھرے نیتاؤں، واعظوں اور مقرروں کی طرح مذہب، زبان اور تہذیب کے نام پر اپنی روٹی سینکیں؟ وقت کے ساتھ سب بھول گئے اور صورت حال یہ ہے کہ :

''عمارت گری پڑی ہے، کچھ لوگ تو دب کر مر ہی گئے، باقی گرتے ہوئے ملبے سے چوٹ کھا کر زخمی ہوئے، اور بہت سارے عمارت کے گرنے سے دُکھی ہوئے، کچھ زخمی ابھی تک کراہ رہے ہیں، بہتوں کا ہاتھ عمارت کے نیچے دبا ہے، کچھ کا پیر پھنسا ہے اور کچھ کی املاک تباہ ہو گئی ہیں۔ مگر صورت حال جیسی تھی ویسی ہی ہے کیوں کہ مالکانِ اصلی اور کاشت کارانِ اصلی

ISSN. 2582 - 3612

دونوں کو کسی نے سمجھا دیا تھا کہ عمارت کے نیچے خزانہ دفن ہے۔اس لئے دونوں ہی اس عمارت کی ملکیت کے دعوے دار ہیں اور وہ منہدم عمارت ،عمارت کے درجے سے آگے بڑھ کر ماں بن گئی ہے۔حیات اللہ انصاری کی 'آخری کوشش' والی ماں!''

(ص۔۲۷۳)

پانچواں منظر: بہار میں انتخابات کا موسم بڑے برے موسم کے روپ میں شمار کیا جاتا ہے۔دوسرے صوبوں میں ہوسکتا ہے یہ صورت حال نہ ہو اور لوگ بخوشی الیکشن ڈیوٹی کرتے ہوں ،مگر بہار میں یہ عذاب سمجھی جاتی ہے اور پرائمری اسکول سے کالج کے پروفیسر تک سب اس کوشش میں لگ جاتے ہیں کہ دامے ،درمے ،قدمے، سخنے جیسے بھی ممکن ہو اس ڈیوٹی سے نجات حاصل ہو جائے۔غیر تدریسی ملازمین کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ سارے کام ٹیچروں سے ہی کروالیے جائیں۔ڈیوٹی سے نام کٹوانے سے انتخاب کے بعد ووٹوں کی گنتی تک جتنے مراحل ہیں وہ پل صراط سے کم نہیں۔حسین الحق خود پروفیسر رہے ہیں ،اور دوران ملازمت انہیں اس جہنم زار سے گزرنا پڑا ہوگا۔چنانچہ انہوں نے الیکشن ڈیوٹی ،ووٹ اور ملازمت کی مجبوریوں میں پھنسے ایک شریف انسان کی بے بسی ، ذہنی کرب اور اذیت کو بڑے حقیقی انداز میں پیش کیا ہے۔اس کے ساتھ ہی انہوں نے سیاست ، ووٹ بینک اور بوتھ قبضے کے ذریعہ فتح حاصل کرنے کے سیاسی کھیل پر بھی گہری نظر ڈالی ہے۔ایک منظر دیکھئے :

''اسکول کے باہر لوگوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔ہر پارٹی والے اپنے دو چار سور ماؤں کے ساتھ موجود تھے۔رکشہ والے عورتوں کو اور کبھی کبھی بوڑھوں کو بھی لے کر آتے اور اسکول سے ذرا دور پر اُتار کر پھر محلے کے اندر چلے جاتے ۔اسماعیل کو یاد آیا کہ پارٹی والوں کی طرف سے ووٹروں کو آنے جانے کی یا کسی قسم کی سہولت دینا اب الیکشن کمیشن کی طرف سے غیر قانونی قرار دیا جا چکا ہے۔مگر اسماعیل دیکھ رہا تھا کہ رکشے آ جا رہے تھے اور کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ تھا۔۔۔۔وہ ایک پولنگ ایجنٹ سے پرچی بنوانے لگا۔اچانک اسکول کے اندر سے پہلے تڑاتڑ لاٹھی چلنے کی آواز آنے لگی ،اور پھر ہوائی فائر ہوا۔''

(ص۔۲۰۴)

بوتھ کیپچرنگ، قتل وغارت گری، گالی گلوج یہاں الیکشن کے لازمی عناصر ہیں جن کے درمیان عام انسان، شریف انسان خاموشی کے ساتھ پستا رہتا ہے۔یہ منظر اشارہ ہے اُس صورت حال کا جس میں زبان

بندی کا غیر اعلان شدہ حکم جاری ہو چکا ہے۔آدمی کتابی، قانونی اور اصولی باتیں دماغ میں دہرا تو سکتا ہے ،زبان پر ہرگز نہیں لاسکتا۔

''میں اسماعیل رضا ولد ابراہیم رضا بابری مسجد کے گرنے پر کچھ نہیں کرسکتا ۔شاہ بانو کیس کی بے معنویت پر اپنے ہم مذہبوں سے کوئی مکالمہ نہیں کرسکتا، الیکشن (ووٹ) دیتے ہوئے بلا وجہ گرفتار کر لینے پر اور دن بھر کے لئے حراست میں ڈال دینے پر کچھ نہیں کرسکتا ۔یہاں اجماع چاہئے۔بھیڑ، جاہلوں کی یا ایسے پڑھے لکھے لوگوں کی جنہیں جاہلوں کی بھیڑ پڑھا لکھا مان لے۔یہاں ایک آدمی کی تنہا رائے کا کوئی معنی نہیں بنتا۔جمہوریت وہ طرز حکومت ہے۔''

(ص۔۲۰۶)

چھٹا منظر : یہ منظر وہ ہے جو ہمارے مشاہدے اور تجربے کا حصہ بن چکا ہے۔رشوت خوری، اقربا پروری اور فرقہ پرستی سرکاری دفتروں اور وہاں کی ہر فائل سے جونک کی طرح چمٹ کر رہ گئی ہے۔گپتا جی ہوں یا یادو جی ،سنگھ صاحب ہوں یا اسماعیل صاحب ،سب اسی جونک کا شکار ہیں۔دفتروں میں معمولی سی فائل بھی بغیر چائے پانی کی آگے نہیں کھسکتی۔جسے چاہا اور جب چاہا، حکومت نے پروموشن دے دیا اور جب چاہا جسے چاہا ڈیموٹ کر دیا یا برطرف کر دیا۔جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔مگر کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔حکومت اور سیاست نے مداری اور اس کے کھیل کی شکل اختیار کر لی۔کانگریس کی مخالفت کے بعد اقتدار کی ہوس نے جگلروں کو پیدا کیا جنہوں نے مذہب اور فرضی ہندو مسلم تہذیب و تشخص کا شوشہ چھوڑ کر تمام ہندستانیوں کو الگ الگ خانوں میں بانٹنے کا ایسا کھیل شروع کیا جس نے سماج میں ایک خوفناک اور بھیانک صورت حال پیدا کر دی۔ایسے میں زندگی سے انسان کا سروکار صرف جینے کی حد تک رہ گیا اور وہ اسی میں مطمئن ہے کہ کم از کم غیر فطری موت سے تو دور ہے :

''سیماب نے اسی جوکھم کا ذکر کرتے ہوئے توفیق کی وہ بات بھی دہرائی تھی کہ ''اب یہاں ہندو مسلم فساد نہیں ہوتا''۔اور اس بات پر اسماعیل کو ممبئی کا وہ ملنگ دوست یاد آیا، جس نے بہار لوٹنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''بہار ایک پرسکون صوبہ ہے۔وہاں فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوتا''۔کیا انسانی سروکار میں سب سے بڑا عنصر جینا ہے؟ پاگل، مفلوج اور مند بدھی والے بھی تو جیتے ہیں۔''

(ص۔۲۱۸)

ISSN. 2582 - 3612

اوراس مفلوج اور مند بدھی سماج میں اگر کوئی اپنا سروکار ذہن وفکر سے قائم کرتا ہے تو اسے اس قسم کے سوالات پریشان کرتے ہیں۔کیا زندگی کا مقصد صرف سانس لینا ہے؟ کیا انسان کی منزل صرف روٹی ہے؟ کیا کسی ایک ہی پھول سے باغ بن جاتا ہے؟ کیا آدمی کو رنگ برنگے پھولوں کی اب کوئی ضرورت نہیں ہے؟ کیا سچ مچ کسی ایک پھول اور خوشبو کے علاوہ باقی سارے پھول اور خوشبوئیں صرف باہر سے برآمد کی ہوئی ہیں؟ کیا اس رویے کے بغیر بھی جینے کی کوئی راہ ہے؟ مگر موجودہ صورت حال کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس نے ایسے سوالوں سے جوجھنے والے ذہنوں کو قید کرلیا ہے۔

ساتواں منظر: اس منظر کے کئی شیڈز ہیں جو ہمارے معاشرے کی مذہبی، تعلیمی اور سیاسی صورت حال کی عکاسی کرتے ہیں۔زوال روس کے اثرات، مذہبی جماعتوں کے فروغ اور مدارس کے دقیانوسی نظام تعلیم وغیرہ پہ مصنف نے نہ صرف بحث کی ہے بلکہ اس سے وابستہ قوم کی ذہنی ومعاشی پسماندگی سے بھی روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔مدرسے میں عام طور پر غریب طبقہ تعلیم حاصل کرتا ہے، جو وہاں نہ جاتا تو پاکٹ ماری، چوری چکاری کرتا یا رکشہ چلاتا، بیڑی بناتا اور مزدوری کرتا۔یہاں خوش حال طبقے کی دلچسپی کا کوئی سامان نہیں ہوتا۔صدیوں پہلے فٹ بال کا کھیل وہاں بچوں کی تفریح کا سامان تھا، وہ اب بھی ہے ٹھیک ویسے ہی جیسے صدیوں سے ان کا نصاب تعلیم۔کرکٹ ، بیڈمنٹن وغیرہ سے وہ اب تک کیوں متعارف نہ ہوسکے؟ بہار سے مہاراشٹر تک پورے ہندستان میں ایک ہی طرز تعلیم کیوں ہے؟ سالہا سال سے اس میں تبدیلی کی کوئی ضرورت کیوں نہیں محسوس کی گئی؟

''اسے درخت یاد آئے جو ہر سال اپنی چھال بدلتے ہیں، پرندے یاد آئے جو اپنے پر جھاڑتے ہیں، جاندار جسم یاد آیا جو اندر سے باہر تک لگاتار اپنے کو ادلتا بدلتا رہتا ہے۔مگر یہ لوگ؟ اسے شتر مرغ یاد آیا، جو ریت میں سر چھپا کر سمجھتا ہے کہ طوفان ٹل گیا۔یا وہ مینڈک جو کنویں میں رہتا ہے اور کنویں کو ہی سمندر سمجھتا ہے۔''

(ص۔۲۴۴)

آٹھواں منظر : یہ منظر آج کا ہے جس میں نتیش مودی کی دوستی، سوشاسن بابو اور بی جے پی کی حکمت عملی، پردھان منتری کی آمد، گاندھی میدان کا بم دھماکہ، افضل گرو، جے این یو، موب لنچنگ ، اخلاق کی موت اور وہ سب کچھ ہے جو ہماری زندگی، سماج اور ملک کے بدلتے منظر نامے کی علامت ہے۔۱۴ویں باب سے ۲۳ویں باب یعنی اختتام تک ناول ہمیں اپنے آپ سے ملواتا ہے۔یعنی آج کے موجودہ منظر نامے سے جہاں پٹنہ، بہار اور ملک کی صورت بدل چکی ہے۔بے روزگاری منہ بائے کھڑی ہے، نوجوان باہر بھاگ

رہے ہیں، فارورڈ بیک ورڈ اور ریزرویشن نے معاملہ اور پیچیدہ کردیا ہے، فرقہ وارانہ عصبیت شہر سے بڑھتے ہوئے گاؤں کی مسجد، خانقاہ اور قبرستانوں تک پہنچ گئی ہے، ذات پات کی لعنت نے غیر مسلموں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، نکسل موومنٹ میں پسماندہ مسلمان بھی شامل ہو رہے ہیں اور بات یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اب گاؤں میں ان کی میٹنگیں بھی ہو رہی ہیں۔اور اس سب کے درمیان ایک نعرہ امید کی طرح شہرت حاصل کررہا تھا کہ اچھے دن آئیں گے۔مگر اچھے دن کے لئے جو راستہ اختیار کیا گیا اس سے معلوم ہوا کہ وہ نعرہ عوام کے لئے نہیں خود کے لئے لگایا گیا تھا۔عوام کو تو اُس آگ میں جھونک دیا گیا جس کا شکار اسماعیل، فیضان، اخلاق اور جنید جیسے لوگ ہوئے :

''گئو رکچھا۔۔وندے ماترم۔۔رام مندر۔۔۔انہی آوازوں میں کچھ اور آوازیں گڈمڈ ہورہی تھیں۔۔۔اسلام واحد راہ نجات۔۔۔کافروں سے قتال کار ثواب۔۔۔پھر فضاؤں میں جھنڈے لہراتے ہیں۔ہندو واہنی۔۔۔بجرنگ دل۔۔۔گئو رکچھا سمیتی۔۔۔شیو سینا۔۔آر ایس ایس۔۔جھنڈوں کے چیختے چلاتے رنگوں میں۔۔۔بیچ بیچ سے کچھ مدھم ہم رنگ سر اٹھاتے۔۔۔مجلس اتحاد المسلمین۔۔۔سیمی۔۔۔انڈین مجاہدین۔۔۔قیدار ایک طرف سے نظر چراتا تو دوسری سمت کچھ ایسا تھا جو راستہ روک کے کھڑا ہو جاتا۔۔۔ہر طرف اونچی اونچی دیواریں۔۔۔ہر دیوار پر جھنڈے۔۔ہر دیوار کی ہر اینٹ سے گندا خون اُچھلتا کودتا باہر آتا۔''

(ص۔۲۶۹)

صورت حال پہلے بھی خراب ہوئی تھی مگر اُس زمانے میں خون خرابے کی نوبت کم آتی تھی، دلوں میں دیواریں قائم نہیں کی جاتی تھیں۔جنگ کے بعد بھی دل ملے رہتے تھے یہاں تک کہ رشتے داریاں قائم ہوجاتی تھیں۔ہولی، دیوالی سے مسلمان اور شب برات محرم سے ہندو الگ کب اور کیسے ہوگئے یہ کوئی محسوس نہ کرسکا۔صورت حال کے بھیانک پن میں اضافہ ہی ہوتا گیا، یہاں تک کہ تاریخ، تہذیب اور عشق کی ساری داستانیں بدل دی گئیں۔

مذکورہ بالا مناظر سے سب سے پہلے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ مصنف نے گذشتہ پچاس برسوں کے دوران ہمارے عہد اور معاشرے کو متاثر کرنے والی بیشتر ناہمواریوں پر گہری نظر ڈالی ہے۔کبھی تجربے کی صورت میں اور کبھی مشاہدے کا سہارا لے کر انہوں نے صوبہ بہار کے انُ چھوٹے چھوٹے واقعات کو بھی ناول کا حصہ بنایا ہے جن کا تعلق ہمعصر علاقائی صورت حال سے تو ہوسکتا ہے، قومی یا عالمی تاریخ سے قطعی

ISSN. 2582 - 3612

نہیں۔مثلاً کالجوں کا کنسٹی ٹیو ینٹ ہونے کا معاملہ، رنجن یادو کا سیاسی عروج، کوچنگ کلاسز کا کھیل، بوتھ کیپچرنگ، الیکشن ڈیوٹی کی بوالعجبیاں اور شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی کی منتقلی وغیرہ۔مگر ناول محض ان واقعات کا بیان نہیں۔ یہ مصنف کے گہرے سماجی، سیاسی اور تہذیبی شعور کا عکاس بھی ہے۔ یہ اُس قوم کی داستان بھی ہے جو گذشتہ کئی دہائیوں سے نفرت، فرقہ پرستی اور دشمنی کا عذاب جھیل رہی ہے۔ وہ عذاب جو اُس پر صدیوں سے شکلیں بدل بدل کر نازل ہوتا رہا ہے کیوں کہ محبت اور نفرت، ظلم اور رحم میں ازل سے جنگ جاری ہے ،بس ان کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد عذاب کی ایک اور صورت سامنے آئی اور اس نے محبت کرنے والوں کے لئے زمین تنگ کردی۔ مصنف کا کمال یہ ہے کہ اس صورت حال کو انہوں نے تاریخ کے بجائے فلسفے کی زبان دی ہے جو فکشن کو بڑا بناتی ہے اور بلیغ علامتوں، استعاروں اور اشاروں کے سہارے فلسفۂ حیات کی سفاکیوں اور نزاکتوں کو دل پذیر انداز میں پیش کرتی ہے۔

مرکزیت بہار اور مسلمان ہونے کے باوجود اس ناول کو علاقائی یا مخصوص معاشرے کا ناول نہیں کہا جاسکتا۔صرف اس لئے نہیں کہ اس میں بھیونڈی، ایودھیا اور ممبئی کا بھی ذکر ہے یا مرکزی کردار اسماعیل، فیضان، قیدار اور نائلہ ہیں۔ان کے ساتھ بہت سارے کردار اپنے تفاعل کے ساتھ موجود ہیں۔مبشر رجائی، میاں والا، بنسی دھر، رمیش، رکمنی، دلبیر سنگھ، انیل شرما، مجمدار، ٹوپو اور شوبھا وغیرہ سب کے سب ناول کا ناگزیر حصہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ اسماعیل، فیضان، قیدار اور نائلہ کے ساتھ ساتھ ان میں سے بھی اکثر اپنے فکر و عمل کے ذریعہ ایک اچھا ہندستان بنانے میں مصروف ہیں۔اس لئے یہ ہندستانی معاشرے اور معاشرت کا ناول ہے۔اس ہندستانی معاشرے کا جس کی معاشرت کو آزادی کے ستر سال کے بعد اس طرح بے جان کردیا گیا ہے کہ اس کی حالت منٹو کے افسانہ 'کھول دو' کی سکینہ جیسی ہوگئی ہے۔ یہ دردناک مگر بلیغ علامتی منظر دیکھئے :

> ''وہ آیا، کھانا کھایا، دیر تک بلو فلم دیکھی، گندے گانے سنے اور اس کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔اس نے سکینہ کی طرح اپنا ازار بند کھول دیا۔ یہ آزادیٔ وطن کے بعد کی سترویں رات تھی۔''

(ص۔۳۲۸)

اس معاشرے میں انسانوں کے انسان پر مسلط ہونے اور اقتدار پانے کا جنون ہے جس نے اسے وحشی بنادیا ہے۔وحشی انسان طبقاتی ٹکراؤ، مذہبی شدت پسندی اور تاجرانہ ذہنیت کا سہارا لے کر سماج پر راکشش کی طرح حاوی ہوگیا ہے، جس کے نیچے انسانیت، عشق، دردمندی، محبت دبی کراہ رہی ہے۔

''اماوس میں خواب'' موضوع کے علاوہ اپنے بیانیہ کی وجہ سے بھی قابل توجہ ہے۔اس کا بیانیہ بہت عام، سپاٹ اور سادہ نہیں ہے۔کہیں شعری بیانیہ متاثر کرتا ہے تو کہیں استعاراتی اسلوب دامن دل

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

کھینچتا ہے۔کبھی تجریدیت ملتی ہے تو کبھی سفاک حقیقت نگاری ہیجان پیدا کرتی ہے۔ناول کا اسلوب ابہام اور صراحت کا آمیزہ ہے۔شروع سے ہی ناول نگار دو متوازی بیان لے کر آگے بڑھتا ہے۔ایک بیان عشق کا ہے اور دوسرا تاریخ و سیاست کا۔کبھی ایک میں آگے بڑھتا ہے اور دوسرے میں پیچھے، کبھی ایک کو چھوڑتا ہے اور کبھی دوسرے کو۔مگر وہ رکتا نہیں ہے۔کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جو بات چھوٹ گئی وہ شاید ادھوری رہ گئی ،مگر دوسرے یا تیسرے باب میں جاکر اس کا سرا مل جاتا ہے اور بیانیہ کے ساتھ پلاٹ کا ادھوراپن بھی تکمیل کی جانب گامزن ہو جاتا ہے۔یہ بیان کا انوکھا انداز ہے جو مطالعے کے لئے ذہین قاری کا تقاضا کرتا ہے۔مثلاً یہ اقتباس دیکھئے :

> ''اور پھر تمکنت جس نے مرنے سے پہلے خط لکھا تھا ،مجھے کینسر ہو گیا ہے، میری کیمو تھیراپی ہوئی ہے ،میرے سب بال اڑ گئے ہیں۔۔۔مجھے بھولنا چاہتے ہو تو ایک بار آکے دیکھ لو۔۔۔کہتے ہیں پہلا پیار اور آخری پیار سانس ٹوٹنے تک ساتھ نباہتا ہے۔کانگریس ہندستانی مسلمانوں کا پہلا پیار ہے، کانگریس بھی جانتی ہے کہ ہندستانی مسلمان لاکھ بدکیں مگر جائیں گے کہاں۔انہیں بھی شاید یقین تھا کہ اسماعیل نامی شخص اُن سے چھٹ کر زندہ نہیں رہ سکے گا۔اور سچ بھی یہی تھا، وہ تو ساری زندگی ان کے ناز سہتا رہا۔غیر کانگریسیوں نے تو مسلمانوں کو کانگریس کی داشتہ تک کہ دیا۔اور تمکنت؟ جو مرگئی۔اور پاکستان جو صرف مرا نہیں، اس کی لاش کو بیچ سے دو ٹکڑے کردیا گیا۔''

(۲۳)

مگر مکمل ناول اس ایک بیانیہ پر منحصر نہیں ہے۔واقعات جس صورتحال سے گذرتے ہیں، بیانیہ بھی اسی کے مطابق بدل جاتا ہے۔آزادی کے بعد سے بھیونڈی کے فسادات تک چونکہ اسماعیل فکری اور عملی دونوں اعتبار سے اضطراب، کشمکش اور بے یقینی کی صورت حال سے گزرتا ہے اس لیے بیانیہ بھی پیچیدہ اور پریشان کن ہے، مگر جیسے ہی اسماعیل پٹنہ پہنچ کر مطمئن ہوتا ہے بیانیہ بھی سادہ، پرسکون اور عام فہم ہو جاتا ہے۔شاید اسی لیے ناول کے ابتدائی ۷۵ صفحات سے گزرنا آسان نہیں، اور اگر اس سے گزر گئے تو پھر اسے چھوڑنا ممکن نہیں ۔اسی طرح تمکنت، شوبھا اور نائلہ کے عشق کے مناظر بھی بیانیہ کے مختلف رنگ پیش کرتے ہیں۔شعری بیانیہ کی ایک مثال دیکھئے :

> ''وہ آرہی ہیں۔۔۔ایک وہم سا ہوا۔۔۔کہیں نظر نہیں آرہی تھیں مگر ایسا

ISSN. 2582 - 3612

لگ رہا تھا کہ وہ آ رہی ہیں۔ برف یا روئی کے گالے سے تیار کی ہوئی فضا میں سنہرے گل بوٹے ٹکے ہوئے تھے اور جگنوؤں کو حکم دیا گیا تھا کہ تم سارے میں جگمگاتے پھرو اور چاند نے منادی کی تھی کہ ابدالآباد تک میں اس فضا پر چاندنی بکھیروں گا اور غیب الغیب سے ایک فرمان جاری ہوا تھا کہ سورج اپنی تپش کو اس جلسے سے دور رکھے۔ الٰہی یہ جلسہ کہاں ہو رہا ہے، جہاں حوران بہشتی کا مجمع دف پر گاتا تھا۔۔۔ چوں پردہ بر افتد۔۔۔ چوں پردہ برافتد۔۔۔۔ اور پردہ ابھی اٹھا نہیں تھا۔ حریری پردوں کی نرم سرسراہٹ نرم بھی تھی اور ریشم جیسی کومل بھی، پردے ساکن نہیں تھے، مگر اُٹھ بھی نہیں جا رہے تھے۔ اہتمام یہ تھا کہ کچھ چھپا بھی رہے، کچھ جھلملاتا بھی رہے، ایسے ستر پردوں کے پرے وہ ساعد سیمیں ایک مستانہ سی بوجھل اور سرشار کیفیت میں مکیّف ہوئیں کہ ماتھے پر ان کے شکنیں صف تشنگاں تھیں اور بھویں طلب کی آگ میں جل کر زلف زلیخا کی مانند سیاہ اور آنکھوں کی پتلی میں سیاہی تھی، سفیدی تھی، شفق تھی، ابر باراں تھا۔''

(ص۔۳۱)

اس ناول میں جہاں موجودہ زمانے کی حسیت یعنی روح عصر ہے وہیں وہیں بھرپور جذباتیت اور مادیت و روحانیت کے درمیان پھنسے ہوئے فرد کی چھٹپٹاہٹ بھی ہے اور ان دونوں کے درمیان سے ناول نگار کا مخصوص نقطۂ نظر سامنے آتا ہے کہ زندگی کو جذباتیت، حقیقت، عصریت، علمیت، فلسفہ یا کسی قسم کے نظریے کی ضرورت نہیں۔ اسے صرف ہم سفر کی ضرورت ہے جو عشق سے حاصل ہوتا ہے۔ گویا عشق زندگی کی طرح اس ناول کا سرچشمہ ہے۔

آزادی کے بعد کا عرصہ واقعات و حادثات کے اعتبار سے ہنگامہ خیز رہا ہے۔ ہر دن نیا سورج اور ہر شب نئی تاریکی کے ساتھ آئی ہے۔ حسین الحق کا حوصلہ قابل قدر ہے کہ انہوں نے حالات کو نظرانداز کرنے کے بجائے اس کی سچائی سے ہمیں روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ مذہب، تصوف اور ترقی پسندی جیسے تمام نظریات وافکار کا جائزہ لینے کے بعد انہوں نے قاری کو جو دعوت فکر دی ہے وہ فوری طور پر اثر پذیر ہو یا نہ ہو ، اسے غور وفکر پر ضرور مجبور کر دیتی ہے۔ اور اس لحاظ سے یہ ناول ہم عصر فکشن میں اپنا انفراد و امتیاز قائم کر لیتا ہے۔

اوپر جو مناظر پیش کئے گئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناول کا کینوس بہت وسیع ہے اور شاید پورے ہندستان کا احاطہ کرتا ہے۔ ناول نگار نے مالیگاؤں، بھیونڈی، دہلی، ممبئی اور پٹنہ کا ذکر کر کے اس کے

کینوس کی وسعت کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے۔ ازموں کا ٹکراؤ، ذات پات کی جنگ، مذہبی تفریق اور سیاسی ریشہ دوانیاں کسی ایک جگہ تک محدود بھی نہیں۔ مگر ناول کا بڑا حصہ صوبہ بہار کی عکاسی کرتا ہے۔ لالو پرساد کا عروج، کالجوں کے حالات، الیکشن کے مناظر، الیکشن ڈیوٹی کی دہشت، کالجوں میں ریگولر کلاسز کا نہ ہونا، کوچنگ کی طرف توجہ کا بڑھنا، پٹنہ کالج اور ساحلِ گنگا کے مناظر، دربھنگہ ہاؤس، کالی مندر اور پٹنہ کے مختلف علاقوں کا تفصیلی ذکر اور شعبۂ اردو کی منتقلی وغیرہ اس طرح ناول میں در آئے ہیں کہ بین الاقوامی تہذیب وفلسفہ یا کم ازکم قومی تغیرات کے پس منظر میں لکھے گئے ناول کے کینوس کو کچھ حد تک محدود کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ مقامیت آفاقیت میں پوری طرح تبدیل نہیں ہو پاتی اور پرسنل اُس طرح امپرسنل بن کر نہیں آپاتا جیسا حسین الحق کے ماقبل ناول 'فرات' میں سامنے آیا تھا۔ مگر کسی بھی عہد کے تہذیبی، ثقافتی، مذہبی اور سیاسی مزاج کی تلاش کے لئے ارضی حوالہ تو ضروری ہے۔ غالباً مصنف نے سہولت کے کے لئے اپنی دیکھی اور بھوگی ہوئی زمین کو منتخب کیا ہے۔ اسی طرح روشنی سہائے اور قیدار بن اسماعیل کی یکجائی اس بات کا اشارہ ہوسکتی ہے کہ مصنف کی نظر میں ہندستان کے محفوظ وخوبصورت مستقبل کے لئے ہندو مسلمان کے درمیان محبت یا کم ازکم رواداری کا رشتہ ہی راہ نجات ہے مگر نائلہ اور رمیش سے وابستہ میلوڈرامائی واقعات کی پیش کش کا جواز کیا ہے؟ نائلہ کا دردناک انجام بھی تو اسے نمونۂ عبرت نہیں بنا سکا۔ شاید یہاں مصنف کا منشا یہ بتانا ہے کہ اس پرخطر راہ میں ہر مسافر قیدار بن اسماعیل اور روشنی سہائے ہو یہ ضروری نہیں۔

مختصر یہ کہ 'اماوس میں خواب' دور حاضر کا منفرد اور نمائندہ ناول کہا جائے گا کہ اس میں آزادی کے بعد سے آج تک کی ہر لمحہ تغیر پذیر تہذیب، تحریک اور ہر طرح کے بے معنی تماشوں کا مکمل منظر نامہ تخلیقی انداز میں موجود ہے۔ اس میں سیاست، مذہب، دانشوری، تصوف، نظریات اور جبر کی قید میں پھنسے آج کے انسان کی چھٹپٹاہٹ اور ہم عصر صورت حال کی وہ چلتی پھرتی تصویر پیش کی گئی ہے جسے ہم معاصر ہندستان کا استعارہ یا آئینہ کہہ سکتے ہیں۔

Dr. Shahab Zafar Azmi
Associate Professor
University Department of Urdu
Patana University
Patna - 800 005
Mob. - 94311 52912

ڈاکٹر مظہر کبریا

''عوامی ادب اور ابن صفی''

ادب کے سلسلے سے مختلف مکتبۂ فکر کے مختلف لوگوں نے مختلف تعریفیں کی ہیں لیکن ادب ایک ایسا وسیع سمندر ہے جس کی تعریف و توصیف ایک جملے میں آسانی کے ساتھ نہیں کی جاسکتی ہے۔ کسی نے ادب کو زندگی کی ترجمانی کہا تو کسی نے زندگی کی تنقید کہا اور کسی نے اسے تفسیر کے نام سے موسوم کیا لیکن اتنی بات تو طئے ہے کہ ادب اُس تحریر کو کہتے ہیں جس میں روزمرّہ کے خیالات کو نہ صرف روزمرّہ کی زبان میں پیش کر دینا ہوتا ہے بلکہ بہتر خیالات کو بہتر زبان میں پیش کرنے کا نام ادب ہے جس میں انسان کے تجربات و مشاہدات مستور ہوتے ہیں۔ انسان دنیا میں جو کچھ دیکھتا ہے، جو تجربے حاصل کرتا ہے اور جو کچھ سوچتا اور سمجھتا ہے اُس کا ردّ عمل ادب کے اظہار کی صورت میں سامنے آتا ہے یہی وجہ ہے کہ ادب زندگی کے وسیع تر مسائل کا نہ صرف احاطہ کرتا ہے بلکہ اُسے پروان چڑھانے کی صورت بھی پیدا کرتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عوامی ادب کیا ہے؟ جب ہم اس کا تجزیہ کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ جس ادب کا تعلق براہ راست عام انسانوں سے ہوتا ہے اُسے ہم عوامی ادب کہتے ہیں۔ انگریزی میں اسے پاپولر لٹریچر بھی کہا جاتا ہے۔ اس پس منظر میں جب ہم عوامی ادب کی تشریح کرتے ہیں تو یہ نکات سامنے آتے ہیں کہ وہ شعر و نثری تحریریں جس کے مُخاطب عام آدمی ہوتے ہیں اور جو اِن کے فہم و استطاعت کو متاثر بھی کرتے ہیں یعنی جسے پڑھ کر اُنہیں کیف و سرور اور لطف و انبساط کا بھی احساس ہوتا ہے اس گفتگو کو مزید آگے بڑھانے سے پہلے چند حقائق کی طرف بھی نگاہ کر لینے کی ضرورت ہے تاکہ مختلف سیاق و سباق آسانی کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے روشن ہوسکیں۔

ادب کے مختلف موضوعات پر شروع سے آج تک مسلسل لکھا جا رہا ہے معاملہ شاعری کا ہو یا نثر کا اس میں کبھی ضرورت کے تحت اور کبھی بغیر ضرورت کے مختلف قسم کے تجربے کئے جاتے رہے نتیجہ یہ ہوا کہ

ادب کی دو (۲) شاخیں قائم ہوگئیں۔ ایک وہ ادب جس کا تعلق خواص سے قائم ہوا اور دوسرا وہ جس کا تعلق عوام سے قائم ہوا۔

ہمارے بیشتر کلاسیکی شاعر و ادیب اور فنکاروں نے جو فن پارے پیش کئے ہیں وہ باآسانی سارے لوگوں کی سمجھ میں آجایا کرتے تھے اُس عہد میں اُس کے سمجھنے کے لئے کسی تشریحی اور تفسیری کتابوں کی ضرورت نہیں ہوا کرتی تھی۔ ترقی پسند تحریک تک شعر و ادب کا یہی مزاج رہا۔ ادب، زندگی، معاشرے اور فرد کا اٹوٹ حصّہ بنا رہا لیکن اس کے بعد قاری کا رشتہ ادب سے آہستہ آہستہ کم زور ہونے لگا وجہ یہ رہی کہ ادب کو خانوں میں بانٹا جانے لگا، لکھنے کے اُصول و قواعد مرتب کئے گئے اور خواہ مخواہ علمی استعداد کو ظاہر کرنے کی صورت پیدا کر دی گئی۔ نتیجتاً عوام النّاس کا انسلاک و اِدراک اُنہیں چیزوں پر قائم رہا جو اِن کے اذہان کی سطح تک پہونچ سکے اور بیشتر چیزیں اُن کی گرفت سے باہر نکل گئیں۔ اُسے آپ ایک مثال کے ذریعہ بڑی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ نظیر اکبرآبادی کی شاعری کو عوام و خواص دونوں بڑی آسانی سے اپنے احاطۂ فکر میں لے آتے ہیں لیکن عادل منصوری کی شاعری کسی ایک مخصوص طبقے کے ذہنوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ اُسی طرح پریم چند سے لے کر بیدی تک افسانوں کی افہام و تفہیم میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی ہے لیکن احمد ہمیش اور سریندر پرکاش کے افسانوں کو سمجھنے کے لئے علم کا گراف اتنی اونچائی تک پہونچتا ہے کہ عام اذہان تک اس کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔

اس صورتحال میں جب ہم ادب کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں بڑی مایوسی ہوتی ہے کہ عام طور پر جو ادب لکھے جا رہے ہیں اُن کا معیار بلند ہوتا ہے (معیار کی بلندی الفاظ کے استعمال اور کرتب بازی کے حوالے سے) اس لئے کہ ان کا مُخاطب باشعور حلقہ ہوتا ہے۔ ان میں سے بیشتر ایسے لوگ ہوتے ہیں جو ادب کی مبادیات و التزامات سے واقف ہوتے ہیں اور ادبی کتابیں پڑھتے رہتے ہیں۔ لیکن ایسی کتابوں کی تعداد بہت کم ہے جو عام لوگوں کے معیار کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہوں۔ اور اُن کی دلچسپی کے معیار کو مقدم سمجھا گیا ہو۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ادب کا مطالعہ محض چند گنے چنے باشعور لوگوں تک محدود نہیں ہوتا ہے۔ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جن کا مطالعہ محدود ہوتا ہے، جن کی نظر سطحی ہوتی ہے جن کا تخیل محصور ہوتا ہے اور جن کا ذوق زیادہ ترقی یافتہ ہوتا ہے لیکن اِن کے پاس زندگی کا تجربہ وسیع ہوتا ہے،

ISSN. 2582 - 3612

مشاہدے میں عمق ہوتا ہے اور ادب کے زوال و کمال پر نہ صرف نظر رہتی ہے بلکہ ادب کی فصل بہار پر بھی یہ اپنا حق رکھتے ہیں اور دنیا کے کاروبار بھی اُن کے دَم سے ہی چلتے ہیں۔ دراصل ایسے لوگ بڑے بڑے فلسفیانہ مسائل اور منطقیانہ دلائل سے اُلجھنا نہیں چاہتے کہ ان کے لئے اپنی زندگی کا ڈور ہی سلجھانا کافی ہوتا ہے چنانچہ حاکمانہ گفتگو اور مدبرانہ تحریر ان کی گرفت سے باہر ہو جاتی ہے۔ اِس لئے کہ لوگ ادبی اصطلاحات سے واقف نہیں ہوتے ہیں، ادبی نظریات و رجحانات سے ان کی آشنائی نہیں رہتی ہے اور مختلف مکتبۂ فکر کے لوگوں کے آپسی ٹکراؤ کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتے لیکن سچ پوچھئے تو یہی لوگ ایسے ہیں جن کے بل بوتے پر نہ صرف قومیں ترقی کرتی ہیں اور نشو نما پاتی ہیں بلکہ ادب کے کاروبار بھی چلتے ہیں۔ اس لئے ایسے لوگوں کو جنہیں ہم عام آدمی سمجھتے ہیں، نظر انداز کر دینا نہ صرف ان کے ساتھ بے انصافی ہے بلکہ ادب کے ساتھ بھی کھلواڑ ہے کہ پڑھنے والے کے حلقے کو محدود کر دینا ہے۔ ہم درجۂ اول کی بلند معیاری تخلیق کرنے کی دُھن میں ان عوام کو نظر انداز کرتے رہتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اُن کی طرف سے اپنی ذمہ داری کو مکمل طور پر نباہ نہیں پاتے ہیں اور ایک جوئے کم آب ہو کر رہ جاتے ہیں۔

سمجھنے والے اور سمجھانے والے کا رشتہ بڑا نازک اور مشکل ہوتا ہے۔ قبولیت عام کی سند اُسی فنکار کے حصّے میں آتی ہے جو عوام الناس کے ذہن کو سامنے رکھ کر کے ہی اپنی تخلیقی قوت کو بروئے کار لاتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ بڑا قابلِ قدر کارنامہ ہوتا ہے۔ آج ادب میں پھر ایک بار یہ شور شدت کے ساتھ سامنے آیا ہے کہ ادب کا انسلاک سماجی زندگی سے لازمی ہے اور جو ''سوچیں'' اُسے من وعن اُسی طرح پیش کر دیں یہی فنکاری اور ہنر مندی ہے۔ جب ہم ادب میں سماجی رشتوں کی بات کرتے ہیں تو یہ لازمی قرار پاتا ہے کہ جس سماج کی نمائندگی ہو رہی ہے اُس سماج کے رہنے والے بھی اس زبان سے اس لب و لہجہ سے اور ادب کے مبادیات سے مکمل طور پر واقف ہو سکیں تاکہ وہ اپنے سماج کی باتوں کو اپنی زبان میں سمجھ سکیں۔ لیکن اُردو کے بیشتر لکھنے والے اس ہنر سے بیگانگی برتتے ہیں وہ مشکل کو آسان نہیں بلکہ آسان کو بھی مشکل اور ادق بنانے میں اپنی بڑائی اور اپنا کمال سمجھتے ہیں۔ اپنے اس ہنر اور اپنی اس قابلیت کو جتانے یا اظہار کرنے میں بڑا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ صرف پڑھنے والے محبت اور عزت کا صلہ پانے سے محروم رہتے ہیں۔

ہم جب کھلی آنکھوں سے ادب کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ بہت ہی عالمانہ،

مدبرانہ اور ادیبانہ شان کی کتابیں جب سامنے آتی ہیں تو وہ کسی ایک مخصوص طبقے ہی میں گردش کرتی رہتی ہیں اور اُس کی شہرت محدود ہوتی ہے لیکن وہ کتابیں جو آسان، سلیس اور عام فہم زبان میں لکھی جاتی ہیں اور جن میں فلسفیانہ موشگافیاں نہیں ہوتی ہیں وہ بقائے دَوام کی شہرت حاصل کر لیتی ہیں اور ایسی کتابیں نہ صرف ہمارے گھروں میں داخل ہوتی ہیں بلکہ ہمارے دلوں پر بھی حکومت کرتی ہیں۔ باغ و بہار سے لے کر ابن صفی کے ناولوں تک ایسی کتابوں کی ایک طویل فہرست ہے جس نے اپنی تمام تر مخالفتوں کے باوجود آج بھی ہمارے ذہن اور دل دونوں کو نہ صرف منور و ضوبار کر رہا ہے بلکہ ہمیں مسرت و شادمانی کا احساس بھی دلا رہا ہے۔

ابن صفی اُردو کے جاسوسی ادب کے ''بابائے ناول'' سمجھے جاتے ہیں جنہوں نے کثیر تعداد میں ناول لکھے اور ناول کی دنیا میں ایک ہلچل مچا دیا۔ جاسوسی ناول لکھنے میں ابن صفی سے پہلے کوئی نظر آتا ہے اور نا ہی اُن کے بعد۔ گویا جاسوسی ناولوں کے مُوجِد بھی وہ تھے اور خاتم بھی۔ ایک عرصے تک ہمارے ناقدینِ ادب نے ابن صفی کے ناولوں کو دوسرے درجے کی چیز سمجھ کر ان سے بے اعتنائی برتتے چلے آئے اور اس کا ذکر کرنا کسرِ شان سمجھے لیکن جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے آج ابن صفی کا عہد ہے۔ عوام سے خواص تک سب ابن صفی کے گرویدہ اور شیدائی نظر آرہے ہیں۔ بڑے سے بڑے فکشن ناقد بھی ابن صفی کے فن، فن پارہ اور اور فنکاری کی افہام و تفہیم، تحسین و تقلیب اور ادراکات و اکتسابات میں لگے ہوئے ہیں۔ ابن صفی پر ضخیم ضخیم کتابیں منظر عام پر آرہی ہیں اور کئی رسائل و جرائد کے گوشے اور نمبر بھی شائع ہو رہے ہیں۔ آخر ایک فنکار جو اتنے دنوں تک ملعون و مطعون تھا اور جسے جان بوجھ کر پس منظر میں ڈال کر رکھ دیا گیا تھا اچانک اُس کی بازیافت کیوں ہوئی اور اُس کی فنکاری پر شدت کے ساتھ مکالمہ قائم ہونے لگا۔

ابن صفی کے ناولوں کے پڑھنے والوں کا حلقہ کوئی مخصوص و محدود نہیں۔ یہ اُردو کا واحد فنکار ہے جس کے پڑھنے والے عام طبقے کے ساتھ ساتھ اشرافیہ طبقہ کے لوگ بھی، کم پڑھے لکھے لوگوں کے ساتھ ساتھ اہل علم و دانش بھی اور شاعر، ادیب، ناول نگار سبھی شامل ہیں۔ کچھ لوگ تو ایسے بھی تھے جو ابن صفی کے ناولوں پر اوپر سے کاغذ کا Cover (کور) لگا کر اپنے سرہانے میں رکھتے تھے اور دوسروں سے چُھپا کر پڑھتے تھے۔ میرا تو دعویٰ ہے کہ ہمارے بیشتر فکشن نگاروں نے نہ صرف ابن صفی کے ناولوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا بلکہ ناول کے اسرار و رموز کو بھی سمجھا۔ اس کی وجہ دراصل یہ تھی کہ ابن صفی کے ناول عوامی ادب کی

زندہ مثال ہیں۔ابن صفی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنہوں نے عوام اور خواص کو اُردو سے جوڑے رکھا۔حقیقت تو یہ ہے کہ ابن صفی کی حیثیت عالمی ہے۔اُنہوں نے نہ صرف تھکے ہارے ذہنوں کو تفریح مہیّا کرایا بلکہ اُنہیں تاریخ، تہذیب، ثقافت اور معاشرے سے آشنائی کراتے ہوئے قانون کا احترام کرنا بھی سکھایا۔آزادی کے بعد ہندوستان میں جو کچھ بھی ہوا اُس نے شخصیت کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا۔ہر طرف خون کی ندیاں تھیں، افراتفری کا ماحول تھا اور قانون کے خلاف عوام میں بیزاری تھی۔ایسے میں ابن صفی کے ناولوں نے اِن سوئے ہوئے اور بیمار ذہن کے لئے ٹانک کا کام کیا۔ابن صفی نے بھی ان حالات کو دیکھا تھا اور بھوگا بھی تھا اس لئے انہوں نے اپنی تحریروں سے شعوری طور پر یہ کوشش کی کہ لوگوں کو محبت اور مساوات کے احترام کے ساتھ ساتھ قانون کے سلیقے سے بھی آشنا کرائیں اور اُن کے اندر وطن کی محبت کا جذبہ بیدار کریں۔اُنہوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اگر عالمانہ زبان میں گفتگو کی گئی اور فلسفیانہ موشگافیوں سے کام لیا گیا تو اس کا تاثر دل میں نہیں بیٹھ پائے گا اور تاثر قائم بھی ہوا تو کسی مخصوص طبقے کے لوگ ہی اس سے محظوظ ہو پائیں گے۔اس لئے ابن صفی نے عوامی زبان میں اپنے قاری سے مکالمہ قائم کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے پڑھنے والوں کا حلقہ کسی خاص حلقے تک محدود نہیں رہا۔آپ کو جان کر حیرت ہوگی کہ ابن صفی کے طرزِ تحریر کے رسیا وہ لوگ بھی تھے جو ادب کے معمار بھی تھے اور جنہوں نے ادب کی صحیح معنوں میں خدمت بھی کی تھی۔ پروفیسر احتشام حسین، حسن عسکری، ابوالخیر کشفی، پرویز شاہدی، جمیل مظہری وغیرہ ابن صفی کی تحریروں کے دلدادہ رہے ہیں۔آج کے عہد میں شمس الرّحمٰن فاروقی سے لے کر خورشید اکبر تک کون ہے جس نے ان کے ناولوں کو نہ پڑھا ہو اور اُن کی ہنرمندی کا قائل نہ ہوا ہو۔اپنی سادہ بیانی، اور عام فہم تحریروں کے ذریعہ ابن صفی نے تمام دلوں کو مُسخّر کر لیا ہے۔اگر ابن صفی عالمانہ اور مدبرانہ زبان میں جاسوسی ناول لکھتے تو میرا دعویٰ ہے نہ تو اِن کا حلقۂ قاری وسیع ہوتا اور نا ہی اُنہیں وہ شہرت و مقبولیت حاصل ہوتی جو آج ہے۔آج ہم اُردو والوں کو ابن صفی کے اسی نقش پر چلنے کی ضرورت ہے تا کہ ہمارے ادب کا رشتہ قاری سے دوبارہ اُستوار ہو سکے اور ہم جس کے لئے لکھ رہے ہیں اُس تک ہماری گفتگو با آسانی پہونچ سکے۔میرے اس خیال کو سعید سُہروردی کے اس قول سے تقویت ملتی ہے :

''ہر زمانہ میں جو کچھ لکھا جاتا ہے اُسے دو خانوں میں رکھا جاتا ہے۔ایک وہ

جسے نصاب میں شامل کر کے زبردستی پڑھایا جاتا ہے دوسرا وہ جسے عوام بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔وہ ادب جو عوام میں پڑھنے اور جاننے کا شوق پیدا کرتا ہے۔وہی ادب زبان کا حلقہ پیدا کرتا ہے۔''

(ابن صفی مشن اور ادبی کارنامہ) پانچ سو صفحات پر مشتمل

گویا ابن صفی نے اپنی تحریروں کے ذریعہ دو بڑا کام لیا ایک تو یہ کہ عوام و خواص دونوں میں پڑھنے کا شوق جگایا اور دوسرا وہ کہ زبان کا حلقہ بھی پیدا کیا۔اخیر میں میں اپنی گفتگو کو عہد ساز ناقد شمس الرّحمٰن فاروقی کے قول پر ختم کرتا ہوں :

''ابن صفی کی مقبولیت کا دائرہ عروج پر ہے اور سنجیدہ سے سنجیدہ فکشن لکھنے والے پر بھی اور تقریباً لطف اندوز ہونے والے پر بھی یہ انکشافات ہو رہے ہیں، ابن صفی ہماری تحسین اور استعجاب آمیز خراجِ عقیدت کے حقدار ہیں۔ اُنہوں نے بہت کم عمر پائی اور اس میں بھی کئی برس تک وہ اس قدر بیمار رہے کہ کچھ لکھنے پڑھنے کے اہل نہ رہے۔لیکن اُنہوں نے خود کو اس بیماری سے آزاد کیا اور دوبارہ دل جمعی اور مستعدی سے لکھنے میں مشغول ہو گئے۔ان کے قلم میں کوئی لغزش یا ان کی رفتارِ نگارش میں کوئی کمی نہیں آئی۔ابن صفی جیسا زود نویس اور کثیر نویس اُردو ادب کی تاریخ میں شاید کوئی نہیں ہے۔اور میرے لئے تو ایک بات یہ بھی ہے کہ ابن صفی الہٰ آباد کے تھے اور الہٰ آباد میرا وطن ثانی ہے۔''

(ابن صفی مشن اور ادبی کارنامہ)

Dr. Mazhar Kibria
Associate Professor
University Deptt. of Urdu
J. P. University, Chapra

ڈاکٹر ریحان حسن

اردو شاعری میں گورو ہر گو بند جی کی عظمت

اردو زبان میں قومی ہم آہنگی کا اثاثہ وسیع ،متنوع اور بیحد بیش قیمت ہے ۔دراصل اس سرمایہ کو گراں قدر بنانے میں اردو داں طبقہ کے دانشوروں،ادیبوں اور شاعروں نے جس فراخدلی کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابل فخر وافتخار ہے۔سچ تو یہ ہے کہ اردو زبان کے لٹریچر نے قوموں کے درمیان محبت واخوت کے جذبے کو مہمیز کر کے معاشرہ سے عداوت ونفاق کو ختم کیا اور اس دشمنی ومنافقت کو یکتائی اور یک جہتی سے تبدیل کر کے ایک دوسرے کے تئیں ہمدردی ،باہمی دوستی اور برادرانہ برتاؤ کا ایسا ماحول بنایا کہ آج بھی اس زبان سے حقیقی محبت رکھنے والے اردو زبان کی اس تعلیم پر عمل پیرا ہو کر اس کی غرض وغایت کو پورا کرتے ہوئے قومی اتفاق کا درس دیتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔لہذا اردو اور پنجابی زبان کی معروف وممتاز شاعرہ ڈاکٹر تیجیند رگلاٹی ادا کا کلام بھی اس ذیل میں حاضر خدمت ہے۔جس میں گورو ہر گو بندو جی کی زندگی کے ایک اہم واقعہ کو خوبصورت پیرائے میں نظم کیا گیا ہے ان کا یہ جذبۂ عقیدت ملاحظہ ہو۔

سلام ہیں ان کفش کو
جو چومتے رہے تیرے قدموں کو
اور چلتے رہے تیری راہوں پر
عقیدت کی مثال ہو گئے
سلام ہے اس شمشیر کو
جو کھیلتی رہی تیرے ہاتھوں میں
میری پیری ہوئے جنگوں میں
سنت سپاہی کی مثال ہو گئے
سلام ہے موتیوں کی مالا کو
جو چپکی رہی تیرے سینوں سے
دھڑکتی رہی تیری سانسوں سے
محبت کی مثال ہو گئے

سلام ہے اس جذبوں کو
جولا وارث کے لئے ممتا بنا
ستھرا شاہ اسے نام دیا
انسانیت کی مثال ہو گئے
سلام ہے عمدہ سوچ کو
بادشاہت بھی ہو فقیری بھی ہو
انقلابی تیور بھی ہو
ست یوگ کی مثال ہو گئے
سلام ہے اس چولے کو
جو کتنے ہی حصوں میں بٹ گئے
باون راجوں کی رہائی ہوئی
انصاف کی مثال ہو گئے
سلام ہے تیری ذات کو
جو سنت بھی ہے سپاہی بھی
جو میری بھی ہے اور پیری بھی
مثلوں کی مثال بن گئے
اور بے مثال ہو گئے

مندرجہ بالا کلام گورو جی سے بے انتہا عقیدت کی گواہ ہے بھی ہے اور تیجیند رادا کے دل کی آواز بھی ،شاعرہ نے اپنے ان اشعار میں گورو جی کی زندگی کے اہم کارنامے کی جانب جس خوبی سے متوجہ کیا ہے وہ قابل غور ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ گورو ہر گو بند جی نے 52 سکھوں کو اپنی حفاظت کے لئے معین کیا تھا۔ماجھے اور دوآبے کے پانچ سو نوجوان سکھوں کو مذہب پر جان قربان کرنے کے لئے اس طرح آمادہ کیا کہ گورو جی نے انھیں اسلحے سے لیس بھی کیا جنھیں وہ اپنے ساتھ شکار کے لئے بھی لے جاتے تھے۔گورو ہر گو بند جی کے اس عمل سے مغل بادشاہ خوفزدہ ہوا اور گورو جی کو اپنے پاس بلایا۔سکھ تواریخ میں ہے کہ جب وہ بادشاہ کے پاس گئے تو گورو ہر گو بند جی کو شاہی قیدی کی حیثیت سے گوالیار کے قلعہ میں بادشاہ نے مقید کر دیا۔یہاں پر کچھ راجہ بھی اپنی سزائیں کاٹ رہے تھے،گورو جی نے لذیذ غذائیں ترک کر کے عام کھانے پر اکتفا کیا

ISSN. 2582 - 3612

۔گورو ہرگوبند جی کے اس عمل کو دیکھ کر سکھوں کے دل میں ان کی اور عزت بڑھی۔

قدیم سکھ تواریخ میں ہے کہ سکھ طویل سفر طے کر کے جتھے کی شکل میں گوالیار پہونچتے اور باہر سے ہی قلعہ کی دیواروں کو چوم کر اپنے گھروں کو واپس چلے جاتے۔ کچھ انصاف پسند مسلمانوں نے بھی گورو جی کے تئیں ہمدردی کا اظہار کیا جس کا اثر یہ ہوا کہ بادشاہ کا دل بھی نرم پڑا لیکن گورو ہرگوبند جی نے رہائی کی پیشکش اس وقت تک قبول نہ کی جب تک ان کے ساتھ مقید سبھی 52 راجاؤں کو چھوڑنے کے لئے بادشاہ آمادہ نہ ہوا چنانچہ باقی قیدیوں کو بھی رہا کروانے کے لئے گورو ہرگوبند جی کے سامنے بادشاہ نے یہ شرط رکھی کہ آپ کے ساتھ جتنے راجہ آپ کا چولا پکڑ کر باہر جا سکتے ہیں انھیں ہم رہا کر دیں گے۔ چنانچہ گورو جی نے 52 کلیوں والا ایک چولا تیار کروایا جسے قید خانہ سے نکلتے وقت ہر راجہ نے گورو ہرگوبند جی کے چولے کا کوئی نہ کوئی حصہ پکڑ لیا اور اس طرح باقی قیدیوں کو بھی گورو جی نے رہا کروایا۔ گورو ہرگوبند جی کے اس عمل کی بنا پر آج بھی انھیں ''بندی چھوڑ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

(تیجا سنگھ، ڈاکٹر گنڈا سنگھ، مترجم ڈاکٹر بھگت سنگھ، ''سکھ اتہاس 1469۔1759''، مطبوعہ پنجابی یونیورسیٹی پٹیالہ 2016، صفحہ 40۔38)

اردو کے اہم اور معتبر شاعر قمر کا گورو ہرگوبند جی کی شان میں جو ادبی سرمایہ ملتا ہے اس میں بڑے بلیغ انداز میں انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی شخصیت کی تصویر کشی انھوں نے کچھ اس طرح کی ہے کہ ان کی شخصیت مکمل طور پر نگاہوں کے سامنے آ گئی ہے۔ بطور ثبوت ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہیں ارجن گورو کے پسر ہرگوبند
جہاں میں نِشانِ ظَفَر ہرگوبند
بہادر، دِلاور، ولی اور سخی
کروڑوں کی آنکھیں ہیں جِن پر لگی
عجب روپ اِن کا عجب رنگ ہےَ
نرالی طبیعت نیا ڈھنگ ہے
جہاں میں ہیں مشہور ششم گورو
چمن زارِ قدرت کی شانِ نمُو
امیری دپیری کا بحرِ رواں
ہے عالم میں نور خُدا بیگماں

ہیں گنگا کے نُورِ نظر ہرگوبند
مُبارک ادائیں قمؔر دِل پسند
شجاعت کی بُنیاد ششم گورو
غریبوں کی فریاد ششم گورو
گھرانے کئی اِن سے آباد ہیں
جو ناشاد ہیں آج دل شاد ہیں
کئی راجگاں دامن فیض سے
رہائی سے اِن کے رہا ہو گئے
گورو گھر میں سورج درخشاں ہوا
جو چندو کی آفت کا ساماں ہوا
کئی جب ہوئی طرز آداب میں
گرامنہ کے بل بادشہ خواب میں
ہے نانک کا جلوہ ہرگوبند
ادائیں مُبارک قمؔر دِل پسند

(گورو نانک درشن، صفحہ 212۔211)

قمر نے گورو جی کی شان میں بھرپور اشعار کہے ہیں اور ان کے قابل فخر کارناموں کو جس اختصار سے پیش کیا گیا ہے وہ اردو شعراء کے لئے نمونۂ عمل ہے۔ قمر نے گورو ہرگوبند جی کی دنیا میں آمد کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ ان کی مسحور کن شخصیت کا اعتراف بھی ہے اور اردو شاعری کے لئے مینار بھی، جیسا کہ وہ کہتے ہیں۔

نُورِ نانک جلوہ گر ہے صورت ششم گورو
بہادُر سخی شاہِ عالم گورو
رہے گا ہمیشہ زمانے میں تُو
اٹل رائے پر کیسے خفگی ہوئی
یہ تھی حق کے احکام کی آبرُو

(ایضا، صفحہ 216۔215)

گورو ہرگوبند جی نے جس طرح اس خاکدان عالم پر زندگی بسر کی وہ سکھ قوم کے ساتھ ساتھ دوسروں کے لئے بھی اکتساب کا ذریعہ ہے۔ انھوں نے امیری اور غریبی کے فرق کو ختم کر کے پریشان حال

ISSN. 2582 - 3612

اورمفلوک الحال لوگوں کی جس طرح مدد کی اور انسانوں کو راہ دکھائی وہ آج بھی مشعل راہ ہے۔قمر کا یہ کہنا بجا ہے کہ گورو ہرگوبند جی کی شخصیت میں وہی تابانی تھی جو گورو نانک جی میں تھی :

مُبارک بخت ہرگوبند شاہِ دوجہاں بھی ہے
یہ بندی چھوڑ داتا، تیر ظُلمت کا نشاں بھی ہے
امیری اور پیری کا شہ کون و مکاں آیا
تلاطم سے بچانے کو برنگ باد باں آیا
گورو نانک کے جامہ میں وہی انداز روشن ہیں
گورو ارجن کی گودی میں بہارِ صحن گُلشن ہیں
یہ وہ ست گور ہیں جن پر خود شجاعت ناز کرتی ہی
انھیں کے خوف سے چندو کی ردح ہر دم لرزتی ہی
لب ساحل لگایا ہے ہزاروں ناتوانوں کو
بسایا ہے نگاہِ لطف سے اجڑے گھرانوں کو
گورو نانک کی تابانی قمر سب میں برابر ہے
وہی دس روپ میں روشن جمالِ ربّ اکبر ہے

(ایضاً،صفحہ 217)

صداقت تو یہ ہے کہ انھوں نے ہزاروں ناتواں افراد کی ہر طرح سے مدد کر کے انسانیت کے وقار کو بلند کیا ان کی کراماتی شخصیت کے پیش نظر قمر کا یہ کہنا تھا :

بخش دے ناچار کو ششم گورو
دیکھ حال زار کو ششم گورو
دوُر بنی کر عطا سرکار سے
دیدہ بیدار کو ششم گورو
سیوکوں کا دُکھ مٹانے کیلئے
پھر پکڑ تلوار کو ششم گورو
دیکھتی ہے چشمِ حق بیں دمبدم
تجھ میں حسن یار کو ششم گورو
اپنی چشمِ پُر عطا سے باغ میں

گُل بنادے خار کو ششم گورو
مُدتوں سے ملتجی ہوں جاں بلب
دے دوا بیمار کو ششم گورو
برکتیں پیری امیری کی سبھی
دے قمر نادار کو ششم گورو

(ایضا،صفحہ،214)

پنڈیداس قمر کے لب ولہجہ میں فنکارانہ اظہار ملتا ہے انھوں نے گورو جی کی شان میں شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے مثال کے طور پر ان کی یہ رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

زمانے کا داتا گورو ہرگوبند ہے بگڑی بناتا گورو ہرگوبند
قمر سے گداؤں کو شام وسحر ہے در پہ بلاتا گورو ہرگوبند

شہہ دوجہاں ہیں گورو ہرگوبند مرے مہرباں ہیں گورو ہرگوبند
سخاوت کا دریا ازل سے قمر ہمیشہ رواں ہیں گورو ہرگوبند

(ایضا،صفحہ،213)

گورو ہرگوبند جی کی شان میں اردو شعراء کے یہ کلام گورو ہرگوبند جی کی شخصیت کے کارناموں سے روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ اردو شعراء کی ذہانت طبع اور تخلیقی بصیرت کا ثبوت بھی ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ گورو ہرگوبند جی کی شان میں قمر نے غیر معمولی صلاحیت کا جومظاہرہ کیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔

پنڈیداس قمر کے علاوہ مسلم شعراء کے بھی کلام گورو ہرگوبند جی کی شان میں ملتے ہیں جن میں ایک اہم نام مہدی نظمی کا بھی ہے کہ جن کے کلام میں تازگی ،متانت شادابی خیال اور الفاظ کی مرصع کاری نظر آتی ہے۔ان کی زبان بہت ہی سہل اور کیف وترنم میں ڈوبی ہوئی ہے۔ان کا یہ خوبصورت انداز ملاحظہ ہو۔

خسروِ عارفاں ہے ہرگوبند
پیشوائے جہاں ہے ہرگوبند
آفتابِ سپہرِ عرفاں ہے
نیّرِ آسماں ہے ہرگوبند
نورِ نانک کی ہے درخشانی
جلوہ ساماں جہاں ہے ہرگوبند

غمزدوں کا معین اور یاور
مُونسِ بیکساں ہے ہرگوبند
راہِ تسلیم وجادۂ حق پر
رہبرِ انس وجاں ہے ہرگوبند
جس نے پیری کی تیغ بھی باندھی
وہ امیدِ جہاں ہے ہرگوبند
خوف سے اہلِ ظلم لرزاں ہیں
ایک شیرِ ژیاں ہے ہرگوبند
ہے نرنکار کا جہاں سایہ
آپ کا آستاں ہے ہرگوبند
کی ہے تختِ اکال کی تعمیر
یعنی شاہِ جہاں ہے ہرگوبند
بے نیازِ غمِ زمانہ ہے
جس پہ بھی مہرباں ہے ہرگوبند
مانگ جو مانگنا ہے اے نظمی
بادشاہِ جہاں ہے ہرگوبند

(مہدی نظمی، نذرِ نانک، مطبوعہ خواجہ پریس دہلی، اپریل 1969، صفحہ، 211-209)

مہدی نظمی نے گورو جی کی سیرت کو جس انداز سے پیش کیا ہے اس میں جوشِ عقیدت اور سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے۔ شاعر نے ان اشعار میں یہ باور کرایا ہے کہ گورو ہرگوبند جی نے محض سکھوں کو سپاہی بننے کی تربیت دے کر ان کے غموں کو دور ہی نہیں کیا بلکہ جو بھی بیکس و بے مددگار تھا اس کی بھی بھرپور مدد کی۔ ان اشعار میں مہدی نظمی نے یہ بھی یقین دلایا ہے کہ گورو ہرگوبند جی نے 1621 میں گورنر پنجاب کے خلاف، 1628 میں امرتسر کے قریب، 1631 میں کرتار پور میں اور 1634 میں مغل فوج کے خلاف نڈر ہو تیغ کے جوہر کر دکھائے۔

صداقت تو یہ ہے کہ انھوں نے اس خاکدانِ عالم میں اپنی پوری حیات اس طرح بسر کی کہ اہلِ ظلم خوف سے لرزنے لگے چونکہ ان کے والد ماجد گورو ارجن دیو جی کو اس وقت شہید کیا گیا تھا جب کہ ان کی عمر محض گیارہ سال تھی لہذا انھوں نے لوگوں کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی ترغیب

سکھ قوم کو دی۔ مہدی نظمی نے گورو جی کی حیات زندگانی پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ باور کرایا ہے کہ سکھ قوم کی ہدایت و رہبری کے ساتھ ساتھ اکال تخت کی تعمیر کر کے جو انھوں نے کارنامہ انجام دیا ہے اس کی بدولت وہ مذہبی رہنما ہی نہیں بلکہ وہ دین اور دنیا کے بادشاہ بھی ہیں۔

دراصل اکال تخت گورو ہرگوبند صاحب نے 1665 میں شری ہرمندر صاحب کے احاطہ میں گورو گرنتھ صاحب کی روحانی تعلیم کو معاشرہ اور تاریخ میں عملی طور پر نظم کرنے کے لئے قائم کیا کہ جس کا نام اکال تخت رکھا گیا جہاں پر آج بھی صبح وشام عقیدتمندوں کی رہبری کا نظم ہے۔ (بھائی کاہن سنگھ نابھا، مہان کوش، مطبوعہ بھاشا وبھاگ پنجاب 2011، صفحہ 36)

مختصر یہ کہ اردو شعراء کی یہ روحانی شاعری قومی یک جہتی، رواداری اور بھائی چارے کو بڑھاوا ہی نہیں دیتی بلکہ روح کی طمانیت و سکون کا سامان بھی فراہم کرتی ہے۔ بلاشبہ اس قبیل کی شاعری ہر دور کے سکھ عوام کے دکھوں اور درد کا مرہم ہے۔

Dr. Raihan Hasan
Asstt. Professor
Deptt. of Urdu & Persian
Guru Nanak Dev University
Amritsar - 143 005
Mob. - 85590 20015

اَستوتی اگروال

عصرِ حاضر میں سرسید کی تحریک کی معنویت

سرسید احمد پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ جس کی فہرست پر ہی ایک مکمل کتاب ہو جائے۔ اب تک ان پر سینکڑوں کتابیں، سینکڑوں مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ سرسید کے ادبی کارنامے اتنے ہیں کہ ہم کسی ایک کارنامے پر ہی روشنی ڈالیں تو ایک ضخیم کتاب ہو جائے۔ پھر بھی ہر اسکالر کچھ نا کچھ نیا پیش کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہے اور بات میں سے بات پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح کچھ نئے پہلو بھی سامنے آ جاتے ہیں۔ جب میں نے سرسید پر مضامین اور کتابیں پڑھنا شروع کیں تو مجھے ایسا لگا کہ اب نہیں لکھنا چاہئے اور لکھوں تو کیا لکھوں؟ کون سا نیا پہلو تلاش کروں..؟ لیکن جب ہم سرسید کے نظریات اور افکار و خیالات پر گہری نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں یہ شدّت سے احساس ہوتا ہے کہ واقعی سرسید احمد ایک ایسے قومی رہنما، اردو کے پہلے با قاعدہ نثر نگار اور کئی اداروں اور انجمنوں کے بانی اور کیا کچھ نہیں ہیں...اب جب کہ نئی تعلیم کی اہمیت پر سیمینار منعقد کیے جا رہے ہیں، بہت کچھ لکھا جا رہا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ سرسید نے دو سو سال پہلے جدید تعلیم پر جو زور دیا تھا وہ آج سامنے آ رہا ہے۔ علی گڑھ میں جس ادارے کی انھوں نے بنیاد ڈالی تھی، جو خواب انھوں نے دیکھے تھے وہ تمام خواب آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے روپ میں ہمارے سامنے ہے۔ سرسید نے نئی تعلیم یعنی مغربی تعلیم پر خاص ذور دیا تھا اور مسلمانوں کو سمجھایا تھا کہ وہ جدید یعنی مغربی تعلیم حاصل کریں، انگریزی پڑھیں ورنہ ان کا مستقبل تاریک ہو جائے گا، اسی لئے کہ بغیر انگریزی تعلیم حاصل کیے ترقی کا ایک زینہ بھی طے نہیں کیا جا سکتا۔ سرسید نے صدیوں پہلے جو مشورہ دیا تھا آج اس کو ہم ہر زاویے سے دیکھ رہے ہیں۔ عصرِ حاضر میں آج انگریزی یعنی technology کمپیوٹر، انٹرنیٹ، موبائل سارا کھیل انگریزی کا ہے۔ اس بات پر مسلمان علما بہت ناراض ہوئے اور سرسید کو اسلام مخالف سمجھنے لگے، جبکہ ان کا مطلب یہ نہیں تھا۔ وہ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے پر زور ضرور دے رہے تھے۔ اسلام کو وہ ایک سچا مذہب تسلیم کرتے تھے، ایک تقریر میں انھوں نے اسلام کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا:

> ’’اسلام میں جو خوبی ہے وہ یہی ہے کہ اس کے تمام قانون، قانونِ قدرت کے مطابق اور علمدہ مد کے لائق ہیں۔ رحم کی جگہ جہاں تک قانونِ قدرت اجازت دیتا ہے رحم ہے، معافی کی جگہ معافی ہے، بدلے کی جگہ بدلہ ہے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

> ،لڑائی کی جگہ لڑائی ہے، ملاپ کی جگہ ملاپ ہے اور یہی بڑی دلیل اس کی سچائی کی اور قانونِ قدرت کے بنانے والے کی طرف سے ہونے کی ہے۔‘‘
>
> (ایک تقریر جو جہات کے متعلق کی گئی ہے)

اسلام سے متعلق سرسید کے ان نظریات سے بہت سے علما متفق نہیں تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کی مخالفت پر اتر آئے۔ اگر ہم غور کریں تو سرسید کے وہ نظریات اور انگریزی تعلیم پر ذور دینا کتنا مفید ثابت ہوا ہے، ورنہ ہماری کچھ علما تو ایسے ہیں جو جہالت پر فخر کرتے ہیں۔ سرسید ایک سچے مسلمان تھے۔ وہ صرف مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی طرف راغب کرنا چاہتے تھے مذہبی تعلیم پر زیادہ ذور نہیں دیا، بلکہ جدید تعلیم پر ذور دیتے رہے۔ سرسید اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ’’جو علوم مسلمانوں میں مروج ہیں وہ بلا شبہ غیر مفید ہیں اور حسب احتیاج وقت نہیں ہیں اور یہی باعث ان کی مفلسی کا اصل سبب جہل ہے اور غیر مفید علوم کا عالم اور جاہل دونوں برابر ہیں اسی لئے ان سے نہ لوگوں کو فائدہ پہنچا ہے اور نہ وہ خود کچھ اپنا بھلا کر سکتے ہیں۔ جو تعلیم کے حسب احتیاج وقت لوگوں کی تعلیم و تربیت نہ ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ اول مفلسی اور محتاج اور پھر نالائق اور کاہل اور پھر ذلیل و خوار اور پھر چور و بدمعاش ہو جاتے ہیں۔‘‘
>
> (بحوالہ: سرراس مسعود (مرتب، خطوط سرسید ۱۹۲۲ ص ۳۹)

سرسید نے لوگوں کو تعلیم کی اہمیت سمجھانے میں جی جان صَرف کر دی اور جب لوگ ان کی بات نہیں مانے تو انھوں نے ’’تہذیب الاخلاق‘ جیسا رسالہ نکالا اور نہ صرف مسلمان قوم کو بلکہ سبھی قوموں کو جدید تعلیم کی اہمیت سمجھانے میں جُٹ گئے۔

سرسید احمد نے پوری قوم ہندو ہو یا مسلمان سب کو یہ احساس دلایا کہ سب سے بڑی کمزوری جہالت ہے۔ بغیر تعلیم کے ترقی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ سرسید نے اپنے رسالے ’تہذیب الاخلاق‘ کے ذریعے جس مشن کو چلایا اس کے لئے ان کی پوری زندگی جدو جہد میں گزری۔ لوگوں کے طعنے سنے، مخالفت کا مقابلہ کیا، لیکن اپنی ہمت نہیں ہاری۔ وہ جس کام کا عہد کر لیتے تھے اسے پورا کر کے چھوڑتے تھے۔ لندن کے سفر کے بعد جو انقلاب ان کے ذہن میں برپا تھا اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے سرسید نے اپنی پوری زندگی صَرف کر دی۔ اخبار نکالے، رسالے نکالنے، انجمنیں قائم کیں، لوگوں سے چندا لیا، مولویوں کی مخالفت کا درد سہا، لیکن جس عہد کو وہ لے کر چلے تھے اسے پورا کیا اور تھوڑے ہی دن میں لوگوں نے دیکھ لیا کہ سرسید نے جو شمع جلائی تھی اس کی روشنی ہر طرف بکھر رہی ہے۔ صحیح معنوں میں وہ محسنِ قوم تھے۔ آج ہم سر

ISSN. 2582 - 3612

سید کے خیالات اور ان کے فکر و عمل کی روشنی میں دیکھیں تو ان کے خوابوں کی تعبیر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جدید تعلیم کمپیوٹر، انٹرنیٹ جیسی نئی ایجادیں سرسید کے خوابوں کی تعبیر ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں :

> ’’سرسید کے اندر اعصابی قوت اتنی تھی کہ کالج کی بنیادوں کو مستحکم کرنے اور اس کو قبول عام عطا کرنے کے علاوہ وہ اپنے علمی مشاغل میں برابر مصروف رہے ۔تہذیب الاخلاق دوبارہ جاری کیا ۔گزٹ میں برابر لکھتے رہے اور ان کا آخری مضمون بھی گزٹ میں چھپا تھا، مگر سب سے زیادہ توجہ انھوں نے اپنی تفسیرّ قرآن کو صرف کی جس کی تیاری وہ عرصے سے کر رہے تھے۔ سرسید نے علمی کاموں کے لیے کبھی گوشہ نشینی اور تنہائی کی ضرورت محسوس نہ کی اور نہ علمی کاموں کی مصروفیات اور انہماک میں علمی کاموں کو پس پشت ڈالا۔ مسلمان کی تعلیم کے ہر پہلو پر وہ برابر توجہ کرتے رہے اور اس غرض سے 1886 میں انھوں نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرس کی بنیاد ڈالی ۔اس کانفرنس کے ذریعے سے پنجاب، بہار اور جنوب ہند کے مسلمانوں میں نئے خیالات پھیلے تعلیم کا چرچا ہوا اور اصلاح معاشرت کی تحریکیں پروان چڑھیں۔‘‘

سرسید نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ ہندوستان میں تعلیم کو اس قدر پھیلا سکیں کہ کسی کو بھی جہالت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ انھوں نے عورتوں اور لڑکیوں کی تعلیم کی طرف خاص ذور دیا، کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ دمسلمان عورتوں میں جہالت عروج پر ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہی چاہتے تھے کہ عورتیں پڑھ لکھ کر آگے بڑھیں، اپنا مستقبل سنواریں اور خاص طور سے پڑھ لکھ کر ہر چیز سے واقف ہوں۔ مردوں کے ظلم وستم اور تمام زیادتیوں سے لڑیں ۔قانون کی تمام سہولیات لے سکیں، کیونکہ پہلے کے زمانے میں عورتوں کو پڑھنے لکھنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی اور چھوٹی عمر میں ہی لڑکیوں کی شادی بھی کردی جاتی تھی، جس کی وجہ سے لڑکیاں بس چار دیواری میں ہی قید ہو کر رہ جاتیں تھیں۔ سرسید کی تحریروں سے یہ بات بھی صاف ظاہر ہوتی ہے کہ انھیں لڑکے لڑکیوں کو ساتھ ایک ہی مدرسے میں تعلیم دلانے میں کوئی عتراض نہ تھا، لیکن ان کے راستے میں کئی مشکلیں سامنے آگیں جیسے کہ مردوں کی جہالت جس کی وجہ سے عورتیں چاہ کر بھی آگے نہ بڑھ سکیں۔ عورتوں پہ ہمیشہ سے ظلم ہوتے آرہیں اور اس کی سب سے بڑی وجہ ہے انپڑھ ہونا۔ اگر ایک عورت پڑھی لکھی ہوگی تو وہ اپنے پورے خاندان کو تعلیم کی اہمیت سمجھا سکتی ہے کیونکہ عورت ہی وہ ایک پاکیزہ کردار ہے، وہ ایک ماں ہے، وہ ایک بیوی ہے، ایک بہن ہے ،ایک نند ہے اور ایسے کئی رشتے ہیں جنھیں ایک عورت ہی سنوارتی ہے۔ عورت کی گود ہی بچے کا پہلا اسکول ہوتا ہے۔ عورت کا کردار اتنا بلند ہے کہ جسے بیاں کرنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ عورت کو اسلامیت میں جنت کی

چابی بتایا گیا ہے۔ جب تک مرد تعلیم سے آشنا نہیں ہوں گے تب تک وہ عورتوں کی تعلیم کی طرف دھیان نہیں دے سکتے ہیں اسی لئے ضروری ہے کہ پہلے مرد جہالت کی اندھیری غاروں سے باہر نکل کر دیکھیں کہ دنیا کتنی بڑی ہے، عورت ایک ایسا سلجھا ہوا کردار ہے جس کے بغیر دنیا ادھوری ہے۔

سرسید نے جب انگلستان کا سفر کیا اور دیکھا کہ عورتیں بڑی ہی سلیقے مند ہیں، یہ دیکھ کر انھیں بھی ایسا محسوس ہوا کہ ان کے ملک کی عورتیں بھی پڑھ لکھ کر آگے بڑھیں۔ انھوں نے کئی ممالک کے سفر کیے اور دیکھا کہ لڑکیاں اسکولوں میں پڑھ رہی ہیں، ان کی تعلیم کی طرف خاص توجہ دی جا رہی ہے اور وہاں لڑکیوں کو اسکول اور کالج بھیجنے میں کوئی روک ٹوک کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا ہے اور اگر ایسا ہندوستان میں بھی ہو جائے تو سبھی لڑکیاں پڑھ لکھ سکتی ہیں اور معاشرے میں اس سوچ کو بدل سکتی ہیں کہ لڑکیاں صرف چولہا، چوکے تک ہی نہیں، بلکہ ہر بڑے کام کو کر سکتی ہیں، لیکن جب سرسید تعلیم کی اہمیت لوگوں کو سمجھاتے تو لوگ انہیں تعلیم نسواں کا مخالفت کہنے لگے۔ سرسید نے نہ صرف مسلمان عورتوں، بلکہ ہندو اور عیسائی عورتوں کی تعلیم کی اہمیت بھی ظاہر کی۔

آج صدیوں بعد سرسید کی تعلیم اور ان کے افکار و خیالات کا جائزہ لیں تو یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ عصرِ حاضر میں سرسید کی تعلیم اور نظریات کی وجہ ہے کہ آج عورتیں بھی مردوں کے برابر کام کر رہی ہیں۔ بڑے بڑے عہدوں پر فائض ہیں۔ ایسا کوئی کام نہیں ہے جو عورت نہ کر سکے۔ سرسید نے کبھی کوئی بھید بھاؤ نہیں رکھا۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر دیکھنا چاہتے تھے۔ حالانکہ وہ انگریزوں کی سیاسی چالوں سے خوب واقف تھے، اسی لئے انھوں نے انگریزوں سے مقابلہ کرنے کے لئے جس سیڑھی کا کام لیا وہ تھی ’جدید تعلیم‘ کہ بغیر تعلیم کے انگریزوں سے مقابلہ یا کسی بھی فیلڈ میں ترقی ممکن نہیں ہے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی لکھتے ہیں :

> ’’واقعہ یہ ہے کہ سرسید نے ایسے پُر آشوب دور میں نہایت حوصلے کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا ۔انھیں یہ احساس تھا کہ ہندوستانیوں میں جذبات و احساسات کے باوجود عمل کی حلاوت کی گرمی نہیں جو یورپ کی زندگی کا خاصّہ ہے ۔لہٰذا انھوں نے عمل پر خصوصی توجہ دی ۔ ماضی پرستی کے بجائے حال کو استوار کرنے اور مستقبل کو سنوارنے کی تدبیر میں لگ گئے ۔انھوں نے ضروری سمجھا کہ قدیم تہذیبی نظام کا ازسرِ نو جائزہ لیا جائے اور اسے مغرب کی مادی وعقلی تصورات سے ہم آہنگ کیا جائے۔ بنیادی طور پر حکومت سے عدم تعاون کی پالیسی ،تقلید پرستی ،مذموم رسم و رواج کی پابندی، قوم تعصّبات کی جکڑ بندی اور جدید تعلیم و تربیت کی کمی مسلمانوں کو

ISSN. 2582 - 3612

تباہی اور بربادی کی طرف لے جا رہی تھی۔ سرسید کی یہ فکر ان کے نظریے
تاریخ میں تعمیر کا باعث بنی۔ تاہم ان کے مقصد میں کبھی کوئی فراق واقع نہیں
ہوا۔ انھوں نے جس علمی و تحقیقی شوق کے تحت 'آثار الصنادید' مرتب کی تھی
اس نے ہی تاریخ نویسی کو ایک واضح مقصد کے تابع کر دیا۔''

سرسید احمد ایک ایسی شخصیت تھے جن کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ مستند سمجھا جاتا تھا، اسی لئے کہ وہ زبان سے کہنے کے بعد اس پر عمل بھی کرتے تھے اور اپنی قوم سے بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ بھی عمل کرے اور تعلیم کی اہمیت کو سمجھے۔ خاص طور پر جدید تعلیم، انگریزی پر زیادہ زور دیتے تھے۔ سرسید چونکہ بہت دوراندیش ایک ایسے قومی رہنما تھے کہ جو قوم کے مستقبل کے لئے اتنے فکرمند تھے کہ انھوں نے 'تہذیب الاخلاق' جیسا رسالہ نکال کر اس میں اپنی قوم کو بیدار کرنے کے لئے جو مضامین لکھے ہیں ان میں جگہ جگہ یہ بات دیکھی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی قوم کے لئے، ان کے مستقبل کے لئے کتنے فکرمند تھے۔ سرسید کے الفاظ دیکھئے :

''جب اپنے ہم وطنوں کے حال پر غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ وہ گذشتہ
حالات سے اس قدر ناواقف ہیں کہ آئندہ رستہ چلنے کو ان کے پاس کچھ بھی
نہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ کل کیا تھا اور آج کیا ہے اور اس سبب سے وہ نتیجہ
نہیں نکال سکتے کہ کل کیا ہوگا۔''

اس طرح کی کئی تقریریں اور بیانات ان کے سنہری حرفوں میں لکھنے کے قابل ہیں۔ ایک اور بیان دیکھئے :

''اے رئیسوں اور اے دولتمنوں تم اپنی دولت وحشمت پر مغرور ہو کر یہ مت سمجھو
کہ قوم کی بری حالت ہو اور ہمارے بچوں کے لئے سب کچھ ہے۔ یہی ان لوگوں
کا خیال تھا جو تم سے پہلے تھے، مگر اب ان ہی کے بچوں کی یہ نوبت ہے کہ جس
کے لئے ہم آج اسٹیج پر کھڑے ہیں۔ اے صاحبو، ہر کوء تسلیم کرتا ہے کہ تعلیم نہ
ہونے سے قوم کا حال روز بروز خراب ہوتا جا رہا ہے۔ قوم کے بچے اخراجات تعلیم
کے سرانجام نہ ہونے سے ذلیل اور ذلیل ہوتے جاتے ہیں۔ میں نے کوئی پہلو
ایسا نہیں چھوڑا جس کے قوم کے غریب بچوں کے اخراجات تعلیم میں مدد پہنچے
۔ مگر افسوس کامیابی نہیں ہوئی۔ خود لوگوں سے بھیک مانگی مگر قلیل ملی۔ والنٹیر
بنانے چاہے مگر بہت کم بنے اور جو بنے ان سے کچھ بن نہ آئی۔ بس میں اسٹیج پر
اس لئے آیا ہوں کہ قوم کے بچوں کی تعلیم کے لئے کچھ کر سکوں۔''

سرسید کے ان بیانات کو پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سرسید نے جدید تعلیم کے لئے کتنی مشقت

اٹھائی اور مخالفت کا سامنا کیا۔ لوگوں کے طعنے سہے، لیکن ہمت نہیں ہاری اور مستقل مزاجی سے اپنا کام کرتے رہے اور جس مشن کا انہوں نے عہد کیا تھا اسے مکمل کر کے چھوڑا۔ عصرِ حاضر میں آج تعلیم کی جو چہل پہل ہے، نئی ٹیکنولاجی اور ایجادات سے تعلیم کا جو ڈھانچا تبدیل ہوا ہے صحیح معنوں میں وہ سرسید کا ایک خواب پورا ہوا ہے۔

Stuti Agrawal
Agrawal Jewellers
Sironj - 464228 (M.P)
Mob-9575089694

M. N. M. Mahila MahaVidyalaya
Estd. - 1966
Raj Compound, Bettiah
West Champaran - 845 438
A Permanent Affiliated Unit of B. R. A. Bihar University
Muzaffarpur (Bihar)
Salient Features :
1. Permanent Affiliation in all subjects of Arts
2. A team of experienced teachers for imparting education.
3. Free education for poor students.
4. Facilities of electicity, fan, and furniture along with girl's common room
5. Well equipped laboratory and a good library.
6. Drinking water points and toilets.
7. Centre for practical and various competitive examinations.

Dr. Arun Kumar Prasad

Principal

ڈاکٹر عبدالوحید

ساؔحر کی نظم ''تاج محل'' کا تجزیاتی مطالعہ

ساؔحر ایک اشتراکی شاعر ہیں اس لئے ان کے سوچنے اور سمجھنے کا ایک مخصوص انداز ہے۔ ان کی شاعری اپنے عہد کا مرقّع ہے۔ سیاسی یا سماجی ہیجان کا پتہ ان کی نظموں سے ہر قدم پر ملتا ہے۔ غریبوں کا دکھ درد، ماحول کی پرچھائیاں ان کے سارے کلام پر رواں دواں ہیں، سماج میں اقتصادی بے انصافی، امیر و غریب کے امتیاز اور طبقاتی فرق کو ساؔحر نے بڑی کامیابی کے ساتھ شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ محبوب سے باتیں کرتے وقت بھی ملک کی ابتری اور سماج کی مفلسی کا دل کھول کر تذکرہ کرتے ہیں۔ ساحر نے ایک خاص جذبے سے بھرے ہوئے اور رواں دواں انداز میں اپنے خیالات پیش کئے ہیں۔ وہ اگرچہ فلم کے شاعر ہیں لیکن انہوں نے کبھی اپنی ادبیت کو فلم پر قربان نہیں کیا۔ انہوں نے اونچے خیالات اور شاعرانہ احساسات کو فلم میں جگہ دی، فلمی گیتوں کو ادبی زبان دی اور فلموں میں غزلوں کی جگہ نظموں کا چلن شروع کیا۔ انہوں نے نظم کو ایک نئی ہیئت اور نئے رنگ و آہنگ سے آشنا کیا۔ ان کی رومانی نظمیں غزل کی کیفیات و تاثرات کا حسین سنگم ہیں۔ ان کا کلام رومان اور حقیقت کا حسین سنگم ہے۔ ان کی شاعری الہامی نہیں تجرباتی ہے۔ طبقاتی کشمکش اور سامراجیت کے وحشیانہ مظالم کی نقاب کشائی میں ساؔحر نے کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ ان کی نظم ''تاج محل'' اسی قبیل کی ہے۔ جس میں انہوں نے ''تاج محل'' کو سامنے رکھ کر طبقاتی فرق کی ایک چھپی ہوئی مخالفت کی ہے۔ اس میں ایک ایسا کردار نظر آتا ہے جو غریب ہے لیکن محبت کرتا ہے وہ اپنی محبوب سے یہ کہتا ہے کہ اب وہ اس سے تاج محل کے آس پاس نہ ملا کرے اس لئے کہ اس سے اپنی شکست کا احساس ہوتا ہے اس کی زبان میں ساؔحر کہتے ہیں۔

میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے
بزم شاہی میں غریبوں کا گذر کیا معنیٰ ؟
ثبت جس راہ پہ ہوں سطوتِ شاہی کے نشان
اس پہ الفت بھری روحوں کا سفر کیا معنیٰ ؟

بادشاہوں امیروں اور جاگیرداروں نے اپنی دولت کے ذریعہ محبت جیسی پاکیزہ صفت کو بھی اپنی چہاردیواری میں قید کر دینا چاہا۔ محبت تو ایک ایسا جذبہ ہے جو تمام انسانوں میں یکساں ہے۔ شاہ جہاں نے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

اپنی دولت کے ذریعہ ممتاز محل کی محبت کو لافانی بنانے کی کوشش کی لیکن اور دوسرے لوگوں کی محبت بھی شاہ جہاں کی محبت سے کسی طرح کم نہیں۔

ان گنت لوگوں نے دنیا میں محبت کی ہے
کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے ان کے
لیکن ان کے لئے تشہیر کا سامان نہیں
کیونکہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مفلس تھے

ساؔحر کی یہ نظم ایک طرف ان کے خیالات کو پیش کرتی ہے اور دوسری طرف ہندوستان میں بسنے والے لاکھوں دلوں کی آواز ہے۔ جاگیرداروں اور رئیسوں نے طبقاتی فرق کو زندگی کی ہر منزل میں بہت زیادہ اہمیت دی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اپنے بنیادی جذبات و احساسات کے اظہار میں بھی امارت اور غربت کے لحاظ سے فرق محسوس کرنے لگے، شاعر اپنی کیفیات سے دوسروں کے احساسات کا اندازہ لگاتا ہے۔ اس لحاظ سے ساؔحر کی یہ نظم آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ شاہ جہاں نے ''تاج محل'' کو ایک مثالی عمارت بنا کر اپنے جذبۂ محبت کی بے جا تشہیر کی ہے لیکن جن لوگوں کے پاس تشہیر کا سامان نہیں ہے وہ ایک نفسیاتی دباؤ محسوس کرتے ہیں۔ ایک خالص اشتراکی شاعر کے انداز میں ساؔحر یہ کہتے ہیں کہ ''تاج محل'' کی ساری آرائش و زیبائش اس کی مضبوطی اس کا حسن و جمال یہ سب کچھ غریبوں کی محنت کا ثمرہ ہے اور ان میں غریب محنت کش انسانوں کا لہو دوڑ رہا ہے۔

یہ عمارت و مقابر یہ فصیلیں یہ حصار
مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستون

سینۂ دہر کے ناسور ہیں کہنہ ناسور
جذب ہے ان میں تیرے اور میرے اجداد کا خون

دولت ایک ایسا ذریعہ ہے جس کے سہارے صاحبان دولت نام و نمود حاصل کر لیتے ہیں اور ہنرمندوں صنعت گروں اور محنت کشوں کی تندہی اور جانفشانی کا استحصال کرتے ہیں۔ ساؔحر اس بے انصافی کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ وہ غریبوں کی حالت پر روتے ہیں اور ''تاج محل'' کے مقابلے میں غریبوں کے مقابر کا یوں ذکر کرتے ہیں۔

میری محبوب ! انہیں بھی تو محبت ہوگی
جن کی صنّاعی نے بخشی ہے اسے شکل جمیل

ISSN. 2582 - 3612

ان کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام ونمود
آج تک ان پر جلائی نہ کسی نے قندیل

اتنا کچھ کہنے کے باوجود ساحرؔ نے تاج محل کی خوبصورتی سے انکار نہیں کیا ہے اور اس کے لئے ''جمیل'' لفظ استعمال کیا ہے۔ دولت کی غیر مساوی تقسیم کی وجہ سے ساحرؔ کے دل میں اہل دولت کے لئے نفرت کا ایک جذبہ اُمڈتا ہے۔ یہ جذبہ دراصل ردّعمل ہے جو، امیروں اور رئیسوں کے ظلم وجبر کے مقابلے میں پیدا ہوا ہے۔ ساحرؔ ایک حسّاس شاعر ہیں وہ چیزوں کو ایک خاص انداز سے دیکھتے ہیں۔ ''تاج محل'' کی دلکشی اور حسن کی تعریف تو سبھی نے کی ہے لیکن ساحرؔ نے جس انداز سے اسے دیکھا ہے وہ ان کا اپنا انداز ہے اور بے حد اچھوتا ہے نظم رومانی انداز سے شروع ہوتی ہے یعنی عاشق ومعشوق کی گفتگو سے نظم کی ابتدا ہوتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس میں انقلابی لہر پیدا ہوتی ہے۔ لہر میں شدت بڑھتی جاتی ہے۔ اختتام تک پہنچتے پہنچتے نظم پورے طور پر انقلابی ہوجاتی ہے۔

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق

اس نظم ''تاج محل'' کے بارے میں سیّد احتشام حسین ٹانڈوی نے کیا ہی خوب کہا ہے۔

''ساحرؔ نے تاج محل نظم لکھ کر دنیا کو اتنا مجبور کر دیا ہے کہ وہ شاہ جہاں کے تاج محل کے ساتھ ساحرؔ کے تاج محل کا بھی ذکر کرے۔''

ساحرؔ کی ایک تاریخی نظم ہے ''نور جہاں کے مزار پر'' تاج محل کی طرح یہ نظم بھی صرف تاریخی حقیقت نگاری تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ جذبات کی رنگ آمیزی کرتے ہوئے زمانہ حال کے سماجی حقائق اور جمہوری نظام سے اس کا رشتہ استوار کیا گیا ہے بند ملاحظہ ہو۔

تو میری جان مجھے حیرت و حسرت سے نہ دیکھ
ہم میں کوئی بھی جہاں دار و جہانگیر نہیں
تو مجھے چھوڑ کے ٹھکرا کے بھی جا سکتی ہے
تیرے ہاتھوں میں میرے ہاتھ ہیں زنجیر نہیں

ساحرؔ کی شاعری ان کے دل کی پکار ہے جو ماحول انہوں نے اپنے اردگرد دیکھا اور جس فضا کا مطالعہ کیا اسی کا عکس ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ ساحرؔ نے شاعری میں نئے گوشے پیدا کئے اور بعض نئی قدروں کو جنم دیا۔ اور دوسرے ترقی پسند شاعروں کی طرح شاعری کو محدود حصار سے باہر نکال کر اسے وسعت عطا کی۔

ساحرؔ نے امن عالم کے موضوع پر بھی کئی خوبصورت نظمیں کہی ہیں جن میں ان کی طویل نظم

پرچھائیاں خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ اس طرح کی اکثر موضوعاتی نظمیں دوسروں کے یہاں خطابت بن کر رہ جاتی ہیں لیکن ساحرؔ کی اس نظم کو پڑھنے سے قارئین کو ایسا کبھی محسوس نہیں ہوتا کہ وہ کوئی وعظ سن رہے ہیں۔ ساحرؔ نے لفظوں کے فنکارانہ استعمال سے اس نظم کو محاکات کا اعلیٰ نمونہ بنا دیا ہے۔ نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جوان رات کے سینے پہ دو دھیاں آنچل
مچل رہا ہے کسی خواب مرمریں کی طرح

اس نظم کے بارے میں دیوندر ستیارتھی کے خیالات قابلِ غور ہیں :

''داخلی تأثر اور خارجی کیفیات کا جو خوبصورت تال میل پرچھائیاں میں ملتا ہے اس کی مثال بہت کم نظموں میں نظر آئے گی پوری نظم ایک نئے تجربے کی حامل ہے قدم قدم پر شاعر ایک مصوّر کا روپ دھارن کر لیتا ہے حسب حال نظم کے آنگن میں گیت کا دامن پھیلنے لگتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک ناول کی مختلف جھانکیاں گلے مل رہی ہیں۔''

تقریباً سبھی شاعروں نے اپنی تعریف میں دو چار اشعار ضرور کہے ہیں لیکن ساحرؔ کی فراخدلی دیکھئے کہ وہ اپنے اشعار سے زیادہ مقصد کو اہم قرار دیتے ہیں۔

کل اور آئیں گے نغموں کی کھلتی کلیاں چننے والے
مجھ سے بہتر کہنے والے تم سے بہتر سننے والے

کل کوئی مجھ کو یاد کرے کیوں مجھ کو کوئی یاد کرے
مصروف زمانہ میرے لئے کیوں وقت اپنا برباد کرے

دنیا کو امن اور شانتی کا پیغام دینے والا ساحرؔ ۲۶؍ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو ہمیشہ کے لئے اجل کی نیند سو گیا لیکن آج بھی اس کے نغمے نوجوانوں کے لئے مشعلِ راہ ہیں۔

Dr. Abdul Waheed
Head
Deptt. of Persian
L. N. T. College, Muzaffarpur
Mob. 98010 37112

محمد ضیاء الحق

غیاث احمد گدی کی افسانہ نگاری پر طائرانہ نظر

جب ہم افسانوی ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تب اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ غیاث احمد گدی نے زودنویسی کو کبھی ترجیح نہیں دی۔ ان کے تین افسانوی مجموعے ''بابا لوگ'' (۱۹۶۹ء) ''پرندہ پکڑنے والی گاڑی'' (۱۹۷۷ء) اور ''سارا دن دھوپ'' (۱۹۸۵ء) منظر عام پر آکر دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ آپ کے افسانوں میں آپ کا فنی اختصاص صاف طور سے عیاں ہے، لیکن یہ بھی تعجب خیز امر ہے کہ جب آپ نے افسانوی دنیا میں قدم رکھا اس وقت کرشن چندر، منٹو، بیدی اور عصمت افسانوی ادب کو روشن اور تابناک کر رہے تھے، لیکن غیاث احمد گدی نے اپنے مشاہداتی قوت اور نظریہ حیات کے بل بوتے پر افسانے کے ادبی منظرنامے پر اپنی الگ شناخت بنانے میں کامیابی پائی۔ اپنی افسانہ نگاری کے سلسلے سے غیاث احمد گدی فرماتے ہیں :

> ماحول کی چیرہ دستیوں کا احساس، باطن کا خلفشار اور لگاتار داخلی کشمکش بظاہر معنی شوریدہ سری تخلیقی سطح پر سمت اور معنویت کی جستجو معنی کے اظہار کے لئے وسائل کی تلاش جن کے بغیر فنی تخلیق ممکن نہیں بالآخر مجھے الفاظ کا سہارا لینا پڑا ....رفتہ رفتہ میری نظر اپنی ذات سے اٹھ کر آس پاس کے افراد کی زندگی ان کے دکھ سکھ ان کی آرزوئیں زندہ رہنے کے لئے اور بہتر حالات کے لئے ان کی جدوجہد ان کی کامیابیاں انسان اور انسانی معاشرہ سیاست اور سیاسی الجھنیں یہ سب چیزیں خودبخود میری توجہ کے دامن کو پکڑنے لگی۔ حالات سے فرار یا ایک بہتر زندگی کی تلاش کا جذبہ ماحول کے چہرے کے خلاف نبرد آزمائی کے لئے حوصلے کے فقدان کے باعث نفسیاتی طور پر خواب دیکھنے کی عادت بظاہر منفی رویہ ہے مگر بلا مبالغہ میرے لئے یہ اہم تھے۔ اسی عادت نے مجھ سے افسانے لکھوانے اور کچھ کہنے پر آمادہ کیا۔''
>
> (غیاث احمد گدی فرد اور فنکار، ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ص-۹۳-۹۲)

اس اقتباس کی روشنی میں یہ کہا جائے گا کہ غیاث احمد گدی نے افسانوی دنیا میں تقلید کے بجائے اپنی الگ شاہ راہ بنانے پر اکتفا کیا۔ خواہ موضوع ہو یا اسلوب دونوں اعتبار سے آپ کے افسانے اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

آپ کے افسانوی مجموعے ''بابا لوگ'' (۱۹۶۹ء) کے تمام افسانے ''بابا لوگ''، ''ڈورتھی جون سین''، ''بدصورت''، ''سیاہ صلیب''، ''پیاسی چڑیا''، ''صبح کا دامن''، ''پہیہ''، ''بابے''، ''منظر پس منظر''، ''جوہی کا پودا'' اور ''چاند'' کامیاب کہے جائیں گے۔ غیاث احمد گدی مذکورہ افسانوں میں اپنے مشاہدے تجربے اور عمیق مطالعے کا قارئین ادب کو احساس کرانے میں کامیاب رہے ہیں۔ فنی عناصر، قصہ گوئی، ماجرا سازی اور وحدت تاثر کے اعتبار سے بھی یہ تمام افسانے اپنی مثال آپ کہے جائیں گے۔ افسانہ ''بابا لوگ'' میں غیاث احمد گدی نے ایک اینگلو انڈین خاندان کے علاوہ ایک ضعیف ہندوستانی ملازم کی محبت کا نمونہ پیش کیا ہے۔

اس مجموعے میں شامل افسانہ ''پہیہ'' بھی اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔ فنی اعتبار سے بھی اسے کامیاب کہا جائے گا۔ مختصر یہ کہ اس افسانے میں غیاث احمد گدی نے ایک نچلے طبقے کی عورت کی ارضیت کو بہت ہی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ لہٰذا افسانہ نگار نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ زندگی کی گاڑی دونوں پہیوں کی بدولت ہی صحیح سمت میں چلتی ہے۔ اسی طرح اس مجموعے میں شامل دیگر افسانے بھی آپ کے فن اور فکر کو عیاں کرنے میں معاون و مددگار ہیں۔

آپ کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''پرندہ پکڑنے والی گاڑی'' (۱۹۷۷ء) بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اس مجموعے میں کل ۱۶ افسانے شامل ہیں جن میں ''ڈوب جانے والا سورج''، ''اندھے پرندے کا سفر''، ''پرکاشو''، ''کیمیا گر''، ''افعی''، ''ہم دونوں کے بیچ''، ''کالے شاہ''، ''پاگل خانہ''، ''تج دو تج دو''، ''خانے اور تہہ خانے''، ''قیدی''، ''ایک جھوٹی کہانی''، ''پرندہ پکڑنے والی گاڑی''، ''دیمک''، ''نارد منی'' اور ''ایک خوں آشام صبح'' ہیں۔ ان تمام افسانوں کے حوالے سے یہ کہا جائے گا کہ موضوع کے اعتبار سے یہاں تنوع دیکھنے کو ملتا ہے اس پر اضافہ یہ کہ یہ افسانے افسانہ نگار کی انسانی زندگی سے گہری قربت اور مشاہدے کی گہرائی و گیرائی کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے گا کہ عصری حسیت، جمالیاتی قوس وقزح، جدید وقدیم، رنگوں کا خوبصورت امتزاج اور شاعرانہ زبان ان افسانوں کی منفرد شناخت قائم کرتی ہیں۔ اس کی خاص وجہ ہے کہ اس مجموعے سے غیاث احمد گدی کا فن ایک نیا موڑ اختیار کرتا ہے اور ارتقائی سفر طے کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں افسانہ نگار جدید بھی معلوم ہوتے ہیں اور روایت کے پاسدار بھی۔ یہ حقیقت ہے کہ اس مجموعے میں شامل افسانے غیاث احمد گدی کو نئے افسانہ نگاروں کی صف میں مستحکم مقام عطا کرانے میں معاون نظر آتے ہیں اس سلسلے سے پروفیسر شمیم حنفی کہتے ہیں :

> ''بابا لوگ کے بعد پرندہ پکڑنے والی گاڑی کے نام سے غیاث احمد گدی کا جو دوسرا مجموعہ سامنے آیا ہے وہ ان کے خاموش سفر کے ایک نئے موڑ کی گواہی دیتا ہے۔ اس مجموعہ کی کہانیوں میں بیانیہ کا وہ ماحول جو اس سے پہلے کی کہانیوں

ISSN. 2582 - 3612

میں ابھرا تھا بدستور قائم ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ اولین دور کی سادہ نظری
کے مقابلے میں اب تجربوں کی پیچیدگی کا ادراک زیادہ نمایاں ہے۔''

(بہار میں اردو فکشن ایک تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر احمد صغیر، ص-۱۵۹)

اس مجموعے میں شامل افسانہ ''پرندہ پکڑنے والی گاڑی'' جدید دور کی تحریر کردہ بہترین کہانی ہے۔ زمانے کے نامساعد حالات کی بہترین ترجمانی کرنے میں یہ افسانہ کامیاب نظر آتا ہے۔ مختصر یہ کہ آج کے انسانوں کے ذہنی سوچ اور رویے پر بھی یہ افسانہ گہرا طنز کرتا ہے۔ افسانہ نگار نے اس افسانے کا کردار ایک لڑکا کے ذریعہ آنے والی نئی نسل کے ذہنی سوچ کی بہترین ترجمانی کی ہے۔ کیوں کہ غیاث احمد گدی نے جہاں ایک طرف زمانے کے حالات سے قارئین کو روبرو کرایا ہے وہیں حالات کو بہتر بنانے کی غرض سے اس لڑکے کا کردار خلق کیا ہے اور ایک سنہرے مستقبل کی آمد کا اعلان کیا ہے۔ اسی طرح اس مجموعے میں شامل دیگر افسانے بھی اپنی معنویت کے اعتبار سے اہمیت کا حامل کہے جائیں گے۔

آپ کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''سارا دن دھوپ'' (۱۹۸۵ء) میں کل ۱۲ افسانے ہیں جن میں ''طلوع''، ''کوئی روشنی''، ''سورج''، ''صبح کا دامن''، ''دھوپ''، ''آخ تھو''، ''کوڑھ''، ''چہرے پہ چہرہ''، ''سایے ہم سایے''، ''سرنگ''، ''ایک بھیگا ہوا لب'' اور ''چٹکی بھر ہریالی'' ہیں۔ ان افسانوں میں افسانہ نگار کا حساس ذہن اور فکر و شعور قارئین کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ آپ کے ان افسانوں کی خوبی یہ ہے کہ یہاں فکر احساس اور جذبے کے ساتھ اس طرح گھل مل گئی ہے کہ پڑھنے والا کہانی کے اصل مقصد تک رسائی کرنے میں کامیاب رہتا ہے۔ جہاں تک اسلوب کی بات ہے تو اس سلسلے سے یہ کہنا درست ہوگا کہ آپ نئی حسیت کو پرانے اسلوب میں داخل کر کے زبان کو تازگی بخشنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

اس مجموعے میں شامل افسانہ ''طلوع'' بین الاقوامی حالات کا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ یہ ایک علامتی افسانہ ہے۔ اسی طرح افسانہ ''کوئی روشنی'' فرقہ وارانہ فسادات پر تحریر کردہ بہترین افسانہ ہے۔ اس میں غیاث احمد گدی نے قتل و غارت گری، جبر و تشدد، خوف و دہشت کی بہترین تصویر کشی کی ہے۔ اس طرح ''سورج''، ''سرنگ''، ''کوڑھ''، ''سایے ہم سایے'' اور ''ایک بھیگا ہوا لب'' اس مجموعے کے بہترین افسانے ہیں۔

اس طرح غیاث احمد گدی کی افسانہ نگاری کے حوالے سے یہ تسلیم کیا جائے گا کہ آپ نے اردو افسانے کو ایک نئی جہت سے روشناس کرایا ہے۔ جن میں آپ کا فن معاون و مددگار رہا ہے۔

آپ کی افسانہ نگاری کے حوالے سے پروفیسر وہاب اشرفی رقمطراز ہیں :

غیاث کے افسانوں میں مجھے ایسی فضا ملتی ہے جو وسیع و عریض بھی ہے اور ہماری
بصیرت و بصارت کے لئے ایک امتحان کا مرحلہ بھی پیش کرتی ہے چونکہ میں نے

غیاث کو سنجیدگی سے پڑھنے کی کوشش کی ہے اور ان کے فن کے اسرار و رموز کی تفہیم
کے لئے جد و جہد کی ہے اس لئے مجھے احساس ہوتا ہے کہ میری یہ دوڑ بھاگ شاید
سعیٔ رائیگاں نہیں ہے ممکن ہے یہ بھی ایک غلط فہمی ہو۔ بہر طور غیاث احمد گدی کے
افسانے واضح طور پر مطالعے کے تین پہلو پیدا کرتے ہیں۔ ایک کا تعلق مفہوم و
معنیٰ سے ہے دوسرے کا فنی برتاؤ سے اور تیسرے کا اسلوب سے۔''

(غیاث احمد گدی فرد اور فنکار، ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ص-۱۴۶)

اس اقتباس کی روشنی میں یہ کہا جائے گا کہ افسانوی ادب میں غیاث احمد گدی کا شمار معتبر و ممتاز افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ آپ کا شمار پرانے لکھنے والوں میں بھی ہوتا رہا ہے اور نئی نسل کے افسانہ نگاروں میں بھی آپ کی شمولیت باعث فخر ثابت ہوئی۔ اس کی خاص وجہ رہی کہ آپ نے اپنے افسانوں کو وقت اور حالات کا ساتھ دینے کے قابل بنایا۔ اس پر اضافہ یہ کہ آپ نے فیشن پرستی کو کبھی ترجیح نہیں دی جس باعث آپ کے افسانوں کا فارم بالکل فطری اور حقیقی معلوم ہوتا ہے۔ آپ کے افسانوں کی اہم خصوصایت کہانی پن اور ڈرامائی عنصر ہے۔ کردار نگاری کے تعلق سے بھی آپ کی کہانیاں خاص اہمیت رکھتی ہیں اس کی خاص وجہ ہے کہ آپ کے افسانوی کردار اپنے ماحول کے ساتھ مکمل طور سے جڑے رہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ غیاث احمد گدی کا افسانوی اسلوب قدیم ہے اور اظہار بیان جدید ہے۔ لہٰذا آپ کا فنی اختصاص یہ رہا کہ آپ نئی حسیت اور عصری آگہی سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے۔

تمام باتوں کی روشنی میں کہا جائے گا کہ غیاث احمد گدی نے جس طرح اردو افسانے کو موضوع کے اعتبار سے کامیابی کے زینے طے کرائے اسی طرح فن کے اعتبار سے بھی آپ کے قلم کی جولانی اردو افسانے کو جلا بخشنے میں کامیاب رہی۔ مختصر یہ کہ آپ کے افسانوں میں تشبیہوں اور استعاروں کی ایک دنیا آباد ہے۔ اس پر اضافہ یہ کہ آپ کرداروں کی اندرونی کیفیات کو استعاروں اور علامتوں کے ذریعہ مناسب لفظوں میں پرونے کا ہنر خوب جانتے ہیں۔ اردو افسانوی ادب میں آپ کا یہی فنی اختصاص کہا جائے گا۔

Md. Ziaul Haque
Astt. Professor
Deptt. of Urdu
B. L. N. L. Bohra College
Rajmahal, Sahebganj - 816 109
(Jharkhand)
Mob. : 70509 29150

ISSN. 2582 - 3612

ڈاکٹر سمیع حسن

اقبالؔ کی شاعری میں منظر نگاری : ایک عمومی جائزہ

اقبالؔ کی منظری شاعری کو اردو شاعری میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اقبالؔ کی منظری شاعری کا آغاز اس وقت ہوا جب انیسویں صدی کا چراغ بجھ رہا تھا اور بیسویں صدی کی کرنیں نظر آنے لگی تھیں یعنی انیسویں صدی کے خاتمہ کو صرف دو تین سال رہ گئے تھے اور بیسویں صدی کی آمد آمد تھی۔ اقبال کی شاعری کی ابتدا کے بارے میں مشہور ماہر اقبالیات شیخ عبدالقادر یوں رقم طراز ہیں:

> ''۱۹۰۱ء میں غالباً دو تین سالوں پہلے میں نے انھیں پہلی مرتبہ لاہور کے ایک مشاعرہ میں دیکھا اس بزم میں ان کو ان کے چند ہم جماعت کھینچ کر لے آئے تھے اور انھوں نے کہہ سن کر غزل بھی پڑھوائی اس وقت تک لاہور میں لوگ اقبال سے واقف نہ تھے۔''
>
> (دیباچہ بانگ درا۔ شیخ عبدالقادر ص۸)

شیخ عبدالقادر کے اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۰۱ء تک شاعر کی حیثیت سے اقبال کا تعارف بہت محدود تھا۔ یہاں تک کہ اپریل ۱۹۰۱ میں مخزن لاہور کا پہلا شمارہ نکلا جس میں اقبال کی نظم ''ہمالہ'' شائع ہوئی تھی۔ اسی وقت سے اقبال کی شخصیت سے اردو دنیا کی واقفیت کا آغاز سمجھنا چاہئے۔ ''ہمالہ'' ایک ایسی نظم تھی جس کا بنیادی موضوع حب الوطنی تھا اور منظر نگاری کا نقشہ بھی اس نظم میں عروج پر تھا۔ گویا کہ نظم ''ہمالہ'' کے ذریعہ اقبال نے ایک منظر نگار اور وطن پرست شاعر کی حیثیت سے پہلی بار اردو شاعری میں قدم رکھا۔

اقبال نے اپنے فلسفیانہ افکار اور منظر نگاری سے اردو کے چمن شاعری کو طرح طرح کے گل بوٹوں سے سجایا ہے اور اس کی محفلوں کو روح پرور خوشبوؤں سے معطر کیا ہے گویا کہ اقبال کی شاعری کا محبوب موضوع مظاہر فطری کی پیکر تراشی رہی ہے۔ ان کی شاعری کے ہر دور میں مناظر فطرت کے جلوے کا فرما نظر آتے ہیں اور ہر دور میں ان کے تغزل نے حسن فطرت سے کچھ نہ کچھ رنگینیاں چرائی ہیں۔ لیکن ان کی شاعری کا پہلا دور یعنی ابتدا سے لے کر ۱۹۰۵ تک کا زمانہ فطرت کی رنگینیوں سے دوسرے دور کی بہ نسبت زیادہ مالا مال ہے۔

اقبال کی منظر نگاری سے قبل بھی اردو شاعری میں منظر نگاری کی بنیاد ڈالی جا چکی تھی۔ جس کے سرخیل محمد حسین آزاد تھے۔ منظر نگاری کی اس تحریک کو فروغ دینے والے شعراء میں علامہ اقبال کا نام بڑے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

فخر کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ گویا کہ اس تحریک کے شروع میں ہی اردو شاعری کو اقبال جیسی شخصیت کا میسر ہو جانا اس کی کامیابی کا پیش خیمہ تسلیم کیا گیا۔ اس سلسلے میں محی الدین قادری زور فرماتے ہیں:

> ''یہ اس تحریک کی خوش قسمتی تھی کہ ابتداء ہی میں اس کو اقبال جیسا بلند ہمت نوجوان شاعر مل گیا کوئی تحریک یا کوئی اصول اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس پر عمل پیرا ہونے والوں میں کامیابی کی صلاحیت نہ ہو اور اگر کسی اچھی سے اچھی تحریک اور مفید سے مفید اصول کی علمبرداری نا اہلوں کے ذریعہ سے ہو تو وہ اصول یا تحریک ایک کھلونا بن کر رہ جاتے۔''
>
> (سب رس۔ اقبال نمبر۔ خطبۂ صدارت از محی الدین قادری زور۔ ص۔۱۰)

گویا اقبال نے اپنی پہلی ہی فطری نظم ''ہمالہ'' میں منظر نگاری کا ایک خوبصورت نمونہ پیش کر دیا کہ اردو شاعری کی منظری تحریک زمین سے آسمان پر پہنچ گئی۔ اقبال تخلیقی سطح پر زندگی بسر کرنے والے ایک ایسے فنکار تھے جنھوں نے اپنی شاعری کے لیے شعری مواد کا سرمایہ زندگی کے تقریباً تمام شعبوں سے حاصل کیا۔

اقبال کی منظری شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے دوسرے منظر نگار شعرا سے الگ ہٹ کر مناظر قدرت کی عکاسی میں اپنے تخیل کی آمیزش اس طرح کی ہے کہ منظر کا لطف اس کے حقیقی منظر سے دوبالا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس میں مبالغہ آرائی اور مصنوعیت کا گزر نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے فکر و تخیل کے زور سے فطرت کے دلآویز مرقعوں میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑا دیتے ہیں۔ اقبال کا فطرت سے دلچسپی عشق کی حد تک ہے اس طرح کہ وہ اپنے جذبات و خیالات کو فطرت کے اوپر طاری کر دیتے ہیں۔ فطرت کے مطالعہ سے اقبال کی گہری وابستگی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ فطرت کے ذرے میں حسن کی جھلک دیکھ لیتے ہیں چنانچہ شاعر خود کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کے ہر ذرے میں حسن کو پیدا کیا ہے اس لیے شاعر کو کوہستان کی خاموشی سورج کی روشنی، رات کی تاریکی، صبح کا سہانا منظر، پھولوں کی خوشبو، غنچوں کی چٹک، بلبلوں کی چہک، پرندوں کی آشیاں سازی غرض کہ پوری کائنات اور اس کے ذرے ذرے میں شاعر کو حسن کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

اس نظم کے پردہ میں شاعر نے اپنا یہ خیال پیش کیا ہے کہ انسانی روح حسنِ ازل کی تلاش میں شروع سے ہی سرگرداں ہے لہٰذا مجموعی طور پر یہ نظم اقبال کی فطرت سے دلچسپی اور وسیع مطالعے کی غمازی کرتی ہے۔ اس نظم کے بارے میں اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں :

> ''ان نظموں میں جہاں اقبال فطرت کی مصوری کرتا ہوا نظر آتا ہے وہاں ایک خاص قسم کی جھجک، جستجو اور تلاش کا جذبہ بھی کارفرما ہے۔ وہ حسن میں حقیقت کا متلاشی نظر آتا ہے۔ شاعر فطرت سے درس لینے کی کوشش کرتا ہے اور قدرت کی نیرنگیوں کو دیکھ کر بعض اوقات حیران سا رہ جاتا ہے۔''
>
> (اقبال شاعر صد رنگ۔ مرتبہ سلیم احمد۔ مشمولہ اقبال کا ذہنی ارتقا از اسلوب احمد انصاری)

ISSN. 2582 - 3612

منظر نگاری کے تعلق سے اقبال کی مشہور نظم ''کنار راوی'' ہے جس میں شاعر نے جا بجا خاموشی اور سکوت کا استعمال کیا ہے۔ دراصل اقبال کو دنیا کی اس ہنگامہ خیز زندگی سے زیادہ سکوت و خاموشی پسند ہے اور اسی خاموشی کے ماحول میں راوی ندی اپنے سفر پر رواں دواں ہے۔ اس تعلق سے تین اشعار ملاحظہ ہوں۔

سکوت شام میں محو سرود ہے راوی
نہ پوچھ مجھ کو جو ہے کیفیت میرے دل کی
پیام سجدہ کا یہ زیرو بم ہوا مجھ کو
جہاں تمام سودا حرم ہوا مجھ کو
سر کنارہ آب رواں کھڑا ہوں میں
خبر نہیں مجھے لیکن کہاں کھڑا ہوں میں

شام کے خاموش ماحول میں راوی ندی کا بہاؤ شاعر کے دل پر بہت خوشگوار اثر چھوڑتی ہے۔ کہ شاعر خود اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ یہی نہیں دریا کی خاموش روانی سے شاعر اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ وہ بے تکلف خدا کے دربار میں سجدہ ریز ہو جاتا ہے اور دریا کی روانی میں ایسا محو ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بھی بھلا بیٹھتا ہے کہ وہ کون ہے؟ اور کہاں کھڑا ہے؟ اسی طرح نظم کا دوسرا بند بھی منظر نگاری کے عناصر سے بھرپور ہے۔

شراب سرخ سے رنگین ہوا دامن شام
لئے ہے پیر فلک دست رعشہ دار میں جام
عدم کو قافلہ روز تیز گام چلا
شفق نہیں ہے یہ سورج کے پھول ہیں گویا
کھڑے ہیں دور وہ عظمت فزائے تنہائی
منار خواب گہہ شہسوار چغتائی
فسانہ ستم انقلاب ہے یہ محل
کوئی زبان سلف کی کتاب ہے یہ محل

مقام کیا ہے سرود خموش ہے گویا
شجر؟ یہ انجمن بے خروش ہے گویا

اس شعر میں شراب سرخ کا استعمال شفق کا کنایہ ہے جو لال رنگ کی ہوتی ہے اور دوسرے مصرع میں شاعر نے پیر فلک کی مناسبت سے رعشہ دار لفظ کا استعمال کیا ہے۔ جو استعارہ بالکنایہ کی نہایت عمدہ مثال ہے چونکہ آسمان اپنی قدامت کی وجہ سے بہت زیادہ بوڑھا ہو چکا ہے۔ اس لیے اس کے دست رعشہ دار سے شراب سرخ کا پیالہ جھک کر گر گیا ہے۔ اور اسی وجہ سے شام کا دامن رنگین ہو گیا ہے۔ یہ شفق کے پھیلنے کی شاعرانہ توجیہہ ہے۔ دوسرے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ تیز چلنے والے دن اک قافلہ عدم کو روانہ ہو گیا یعنی دن ختم ہو گیا اور جسے ہم شفق کہتے ہیں دراصل یہ سورج کے پھول ہیں اور ان کو شفق نے سورج کی میت پر چڑھانے کے لیے جمع کیے ہیں کیا ہی خوبصورت انداز بیان ہے اس منزل پر پہنچ کر شاعر انگریزی کے فطرت پرست شعراء سے کئی قدم آگے بڑھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ بقولِ شخصے ع

آگے بڑھا ہوا ہے پیادہ سوار سے

مختصر یہ کہ علامہ اقبال کی شاعری میں منظر نگاری نہ صرف یہ کہ ایک کامیاب فن کے طور پر استعمال ہوا ہے بلکہ اقبال نے اپنے منفرد انداز بیان اور فطرت کے گہرے مشاہدہ کے نتیجہ میں شاعری میں منظر نگاری کا کامیاب اور قیمتی اضافہ کیا ہے۔

Dr. Sami Hasan
Asstt. Professor
Ambedkar Degree College
Barharia, Siwan
Mob. 9931787143

ڈاکٹر شاہ ظل اللہ فاتح

مولانا ابوالکلام آزاد : عبدالمنان طرزی کے ''منظوم مقالے'' کے تناظر میں

پروفیسر عبدالمنان طرزی نے اپنی شعری تصانیف کی کثرت کی بناء پر اردو ادب کی تاریخ میں اپنی جگہ محفوظ کر لی ہے۔ بہار ہی کے دیگر حضرات بھی شاعری میں بکثرت مجموعے مرتب کرنے کی وجہ سے مشہور ہیں لیکن عبدالمنان طرزی صاحب اپنی زود گوئی کی بناء پر اسطرح متعارف ہوئے ہیں کہ گویا ہر موضوع پر لکھنا ان کے لئے سہل ہے۔ کوئی بھی موقع ہو اگر ان سے فرمائش کی جائے یا اُن کا جی چاہے تو وہ فی البدیہ اشعار کہہ کر موضوع کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اسی لئے ان کو بسیار گو شعراء میں شمار کیا جانے لگا یہ بسیار گوئی متاعِ شعر کی کم مایگی کا سبب نہیں بنتی اور نہ یہ سمجھنا چاہئے کہ انکا شعری سرمایہ اپنی ارزش اور وقعت کے اعتبار سے کسی طرح کم ہے۔ ان کی قدر افزائی اس سے ظاہر ہے کہ وہ صدر جمہوریہ ایوارڈ یافتہ ہیں اور پدم شری بھی۔ صدر جمہوریہ ایوارڈ تو ہندوستان کی کلاسیکی زبانوں میں ہر سال ملتا ہے لیکن پدم شری کا خطاب نسبتاً کم لوگوں کو ملتا ہے اس کے لئے کسی زبان میں تصنیف و تالیف کی شرط بھی نہیں ہے جبکہ صدر جمہوریہ ایوارڈ صرف کلاسیکی زبانوں کے لئے ہے جس سے عہد حاضر کی زبانیں مستثنیٰ ہیں۔

شخصیتوں پر مفصل لکھنا اور سیرت و سوانح کے متعدد گوشوں پر روشنی ڈالنا عبدالمنان طرزی صاحب کو مرغوب ہے۔ اس جہت سے دیکھا جائے تو اشخاص کو موضوع بنانے میں انھوں نے اپنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ متقدمین ہوں یا متوسطین یا معاصرین، حضرت طرزی کا قلم کہیں رکتا نہیں ہے ان کے موضوعات قرار پانے والے اشخاص میں بیشتر مشاہیر ہیں ان میں جو متقدمین و متوسطین کے اسمائے گرامی ملتے ہیں ان میں چند جلیل القدر اور تاریخی اعتبار سے شہرت دوام رکھنے والے اشخاص کا منظوم تذکرہ والہانہ عقیدت مندی کے ساتھ ملتا ہے۔ امام غزالی، مولانا جلال الدین رومی، سر سید احمد خاں، خدا بخش خاں، ولی دکنی، بہادر شاہ ظفر اور میر انیس جیسی شخصیتوں کو طرزی صاحب نے اپنی شعر گوئی کے لئے منتخب کیا مولانا ابوالکلام آزاد، پریم چند، فیض احمد فیض، سجاد ظہیر، سعادت حسن منٹو بھی ان کی نگاہ انتخاب میں آئے ہیں۔ یہاں طرزی صاحب کے موضوعات کی فہرست سازی مقصود نہیں یہ تو اُن کی ایک کتاب ''منظوم مقالے'' مرتبہء مجیر احمد آزاد مطبوعہ ۲۰۱۲ء کے متعدد عنوانات میں سے چند ہیں۔ اُن کی ایک دوسری کتاب ''رفتگاں و قائماں'' بھی اسی طرح کی ایک شاعرانہ کاوش ہے۔ محترم طرزی صاحب کی نظر ہر اُس شخص پر پڑ جاتی ہے جو کسی وجہ سے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

اُن کا دامنِ دل کھینچ لے۔ معاصرین میں بھی ایسے حضرات اُن کے موضوعات کے دائرے میں نظر آتے ہیں جو طرزی صاحب کے پہلے کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور رفتگاں کی صف میں شامل ہو چکے ہیں اور پھر ایسے نام بھی نظر آتے ہیں جو بقیدِ حیات ہیں لیکن ہمارے پیشِ نظر سر دست ''منظوم مقالے'' کے ہی عنوانات ہیں۔ اور جو بیانات ابھی درج ہوئے ہیں اُن کا تعلق ''رفتگاں و قائماں'' والی کتاب سے نہیں ہے۔ مثلاً پروفیسر مطیع الرحمان، پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر وہاب اشرفی، قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، اور پھر مشفق خواجہ، پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر قدوس جاوید، اسلم بدر، پروفیسر سید صابر حسن، پروفیسر منصور عمر اور مشرف عالم ذوقی، کے نام بھی ملتے ہیں۔ یہ حضرات قائماں کی صف میں بھی آتے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ عبدالمنان طرزی صاحب غیر شخصی نظم نگاری نہیں کرتے۔ اسی کتاب ''منظوم مقالے'' میں ''آہنگ غزل'' ''دہلی یونیورسیٹی شعبہء اردو'' ''فلم اور اردو ادبی تناظر'' ''بہار میں اردو غزل کے سو سال''، جیسے عنوانات بھی ہیں۔ اُن سارے شخصی اور غیر شخصی عنوانات سے مترشح ہے کہ حضرتِ طرزی کو بیانیہ شاعری میں ید طولیٰ حاصل ہے وہ اپنے موضوعات کو معروضی نقطہءِ نظر سے دیکھتے ہیں اُن کی جزئیات بھی وہ فراموش نہیں کرتے۔ اپنی باتیں کہتے وقت وہ معنیٰ کی گہرائی میں اترنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ اور موضوع کے کسی بھی امکان کو نظر انداز نہیں کرتے گویا وہ اگر اشخاص پر لکھتے ہیں تو دل کھول کر اُن کی صفات اور امتیازات پر داد دیتے ہیں حتی المقدور اپنے اسلوب و آہنگ سے موضوعِ زیرِ بحث کی مکمل شبیہہ الفاظ کی مدد سے صفحہءِ قرطاس پر اُتار دیتے ہیں۔

''مولانا ابوالکلام آزاد'' بھی پروفیسر عبدالمنان طرزی کا ایک مہتم بالشان موضوع ہے جو کتاب ''منظوم مقالے'' میں شامل ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں مولانا ابوالکلام آزاد کو جو اہمیت حاصل ہے وہ اظہر من الشّمس ہے حضرتِ طرزی نے مولانا پر لکھتے ہوئے ان سے متعلق اُن تمام جہات و نکات کو اختصار کے ساتھ یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس کی بدولت ایسا نظر آتا ہے جیسے کوزے میں دریا بند کر دیا گیا ہو ایسی جامعیت بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ ابوالکلام آزاد پر لکھتے ہوئے طرزی صاحب کی لفظیات میں مولانا کی مناسبت سے جلال و جمال کا جلوہ نظر آتا ہے یہ بھی بڑی مستحسن بات ہے کہ اس ''منظوم مقالے'' میں طرزی صاحب کی زبان پختگی و برنائی کی اعلیٰ سرحدوں میں پہنچ گئی ہے۔ اور حشو و زوائد جو عام طور سے بسیار نویسی میں در آتے ہیں، مولانا پر لکھتے ہوئے خال خال پائے جاتے ہیں۔ چند اشعار بطور مثال ملاحظہ کیجئے

گردِ راہِ کوئے مقصد سے رہی وابستگی
پائے استقلال میں جنبش نہیں پیدا ہوئی

ISSN. 2582 - 3612

قلعہء احمد نگر جس کے جنوں کی داد دے
تھی گوارا موت بھی آزاد جینے کے لئے
مرد آہن پیشِ استبداد بھی جھکتا نہیں
ہاتھ غیرت دار کا بہرِ طلب اُٹھتا نہیں
ایسے مجنوں کے لئے دشت و بیا باں کچھ نہیں
زورِ طوفاں چھوڑئے، آلام زنداں کچھ نہیں

مولانا آزاد پر اس ''منظوم مقالے'' کے دو حصّے ہیں۔ پہلے حصّے میں اکیاسی ۸۱ اشعار ہیں دوسرے میں اڑتالیس ۴۸۔ پہلا حصّہ بسیط ہے اس میں مولانا کی سیرت وسوانح کے خصائص وامتیازات کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اُن کے متعدد ناموں کی تفصیل کے علاوہ اُن سے متعلق بہت سی مشہور، لیکن مستند باتوں کی جانب اشارے ملتے ہیں اور یہ روشن ہو جاتا ہے کہ مولانا کی زندگی میں ان باتوں کی کیا اہمیت ہے۔ طرزی صاحب نے اشاروں کنایوں میں بہت سے واقعات کا حوالہ دے دیا ہے۔ جو بجائے خود کتابوں اور جرائد میں بڑی وضاحت کے ساتھ ملتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا تاریخی نام فیروز بخت تھا اور ایک اور نام محی الدین بھی تھا۔ ابوالکلام خطاب تھا اور آزاد تخلّص انھوں نے شاعری کو وسیلہء اظہار نہیں بنایا۔ شوقِ سخن سرائی شاعرانہ نثر نویسی میں تبدیل ہو گیا۔ یہ شاعرانہ نثر مولانا آزاد کا امتیازی وصف تو ہے، لیکن اُن کی مکمل نثری کائنات پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ موضوع کی مناسبت سے مولانا کے قلم کے جوہر کھُلتے ہیں اور اسالیب کا رنگ بدلتا ہے۔ جب وہ خطابت کے جوشِ آہنگ کے ساتھ لکھتے ہیں تو بلند و بالا پہاڑوں کے وقار اور اُنہیں پہاڑوں کے دامن میں موجزن دریا کا بہاؤ نظر آتا ہے۔ وہ مخاطب کی رگ وپے میں سرائت کر جانے والا لہجہ ہوتا ہے جو جوشِ عمل پر آمادہ کرتے ہوئے ذہن وقویٰ کو متحرک کر دیتا ہے۔ جب وہ قرآن پاک کی تفسیر لکھتے ہیں تو کلام الٰہی کے اندازِ بیان کو بندگی کے سانچے میں ڈھال کر ذہنِ زرخیز کے امکانات کو حُسن و دلآویزی کی مطلاّ زنجیروں میں جکڑ دیتے ہیں۔ اسی طرح مولانا آزاد اپنے اخبار ''الہلال'' اور ''البلاغ'' میں جہاں سیاسی مضامین کی کثرت ہے، زبان و بیان کی مرصع کاری کے ساتھ ساتھ جوش وخروش اور شاعرانہ علوئے مرتبت کا جلوہ بکھیرتے جاتے ہیں۔ ''غبارِ خاطر'' شاعرانہ نثر کا شاہکار ہے اور یہ مدّتِ اسیری میں لکھے ہوئے وہ فرضی خطوط ہیں جو حقیقی شخص کے نام ہیں اور کبھی بھیجے نہیں گئے۔ بلکہ کتابی صورت میں قید کی زندگی میں لکھے جاتے اور جمع ہوتے رہے۔ مولانا آزاد کی پیدائش مکہ معظّمہ میں ہوئی۔ عربی گویا اُن کی مادری زبان تھی، والد کی زبان اردو تھی ایامِ طفولیت کے چند سال عرب میں گزرے اور جب والد نے سرزمینِ عرب کی سکونت ترک

کر کے ہندوستان واپس آنے کا فیصلہ کیا تو مولانا کی زندگی میں لسانی ماحول کے اعتبار سے نمایاں تغیرات ہوئے۔ ان کا حافظہ غیر معمولی تھا اردو زبان سے قریب تو وہ پہلے ہی سے تھے لیکن جب والد نے کلکتہ میں سکونت اختیار کی تو بالکل ایک بدلا ہوا ادبی ماحول ملا جہاں پیری مریدی تھی شعر و شاعری کے چرچے تھے، مشاعروں کا بازار گرم تھا لیکن اطراف میں جو بول چال تھی وہ اردو زبان ہوتے ہوئے بھی بنگالی ماحول سے اثر پذیر تھی۔ ایسے عالم میں مولانا کا اردو پر عبور، عربی میں مہارت اور فارسی کی لیاقت کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کا حصول اُن کی خداداد غیر معمولی ذہانت کا ایک کرشمہ ہی کہا جائیگا۔ کمسنی میں مسلسل چھپتے رہنے سے دور دراز کے لوگوں پر ایسا رعب طاری ہوا کہ لوگ اُنھیں معمر سمجھنے لگے اور جن لوگوں نے اُنھیں دیکھا نہیں تھا، وہ اُنھیں بزرگ ہستی سمجھ بیٹھے تھے۔ مشہور واقعہ ہے کہ مولانا شبلی نے جب اُنھیں پہلی بار دیکھا تو یہ سمجھے کہ یہ مولانا ابوالکلام کے صاحبزادے ہیں۔ مہدی افادی جیسے رنگین اسلوب نگارش کے حامل اور نیاز فتح پوری جیسے شاعرانہ ادب کی تخلیق کرنے والے اور نثر میں شاعری کا جادو جگانے والے نیاز فتح پوری تک کو مولانا آزاد کی نثر نگاری پر رشک آتا رہا۔ حسرت موہانی جیسے اعظیم المرتبت شاعر نے بھی کہہ دیا۔

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر　　شعرِ حسرت میں کچھ مزہ نہ رہا

عبدالمنان طرزی صاحب نے یہ سارے واقعات اشاروں کنایوں میں نہایت اختصار کے ساتھ بیان کر دئے ہیں۔ اس کے بعد نظم کے اسی حصّے میں طرزی صاحب نے مولانا کے ایثار اور ذاتی زندگی کو ملک کی آزادی اور اُس کی خاطر جدّ وجہد پر قربان کرنے کے واقعات بیان کئے ہیں۔ مولانا آزاد نے کلکتہ میں بیمار بیوی کی بیماریوں کی خبر ملنے کے بعد بھی انگریزوں سے بیوی کو دیکھنے کے لئے وقتی طور پر چھوڑے جانے کی بھیک نہیں مانگی اور صبر واستقلال کے ساتھ قید و بند کی زندگی گوارا کی۔ یہاں تک کہ بیوی کی موت کے بعد بھی۔ جب جیلر (جیل سپر نٹنڈنٹ) نے ریڈیو پر خبر ملنے اور حکومت کی جانب سے حکم دئے جانے پر مولانا آزاد سے پیش کش کی کہ وہ اگر درخواست دیں تو اُن کو بذریعہ ہوائی جہاز احمد نگر سے کلکتہ پہنچا کر بیوی کے جنازے میں شریک ہونے کی سہولت پہنچائی جاسکتی ہے تو انہوں نے یہ درخواست دینی بھی غیرت کے خلاف سمجھی اور پوچھا کہ کیا جیل میں بند دیگر سیاسی عمائدین مانند جواہر لال نہرو بھی چھوڑ دئے جائنگے۔ ظاہر ہے جواب نفی میں تھا۔ مولانا آزاد صبر وشکر کے ساتھ قید میں رہ گئے اور ایک مدّت کے بعد جب سارے سیاسی قیدی چھوٹ گئے تو مولانا آزاد بھی بذریعہ ٹرین کلکتہ گئے اور بیوی کی قبر پر جا کر آنسوؤں کے چند قطرے بطور نذرانہ پیش کئے۔ مولانا آزاد نے اپنی مختلف صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے شعر وادب کا وہ ذخیرہ چھوڑا ہے جو اُنھیں جاوداں کر گیا۔ وہ شاعر بھی تھے جیسا اُنھیں سطروں میں لکھا جا چکا ہے، لیکن شاعری ان کے لئے ذریعہء شہرت نہیں بنی۔ ہندوستان کی آزادی کا حصول جو مقصود تھا، مولانا

ISSN. 2582 - 3612

آزاد کے لئے کچھ زیادہ دل خوش کن بات نہیں ہوئی، اس لئے کہ ملک تقسیم ہوگیا اور اس کے منفی اثرات دیر پا دور رس اور خون آشام ثابت ہوئے۔ نظم کے پہلے حصّے میں مولانا طرزی نے یہ منفی اثرات بیان نہیں کئے ہیں اور نظم کی تان اس بات پر توڑی ہے کہ آزاد ہندوستان کی وزارتِ تعلیم کا قلمدان مولانا کو ملا جس میں اپنی فراست، لیاقت اور مہارت کا ایسا ثبوت دیا جو اُنھیں ہمیشہ زندہ رکھے گا۔

نظم کے دوسرے حصّے میں تقسیمِ ملک کے بعد کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس حصّے میں طرزی صاحب نے مولانا کی جملہ صفات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہوئے یہ صاف صاف لکھ دیا ہے کہ متحدہ قومیت کے داعی مولانا آزاد کو خود اُن کی جماعت کانگریس کے چند افراد سے صدمہ پہنچا۔ دوسری جماعتوں اور تنظیموں کے مبلّغین اپنی جگہ مولانا سے نبرد آزما تھے۔ طرزی صاحب نے محسوس کیا کہ عہدِ حاضر کے تناظر میں اس ہندو مسلم اتحاد کی اشد ضرورت ہے، مولانا جس کے مبلغ تھے اور آج بھی ایسے حالات پیدا ہوگئے ہیں کہ مولانا کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ طرزی صاحب کے چند شعر آپ دیکھئے۔

عاشقِ ملک و وطن کے کیسے کیسے خواب تھے آہ لیکن خواب جو محروم ہیں تعبیر سے
اُن کے احساسات اعلیٰ، بے بہا افکار کی اک مقدس اور عظیم ہم کو وراثت ہے ملی
بڑھ گئی جس ورثے کی ہے معنویت اور بھی اُن کے ارشادات کی ہے قدر و قیمت اور بھی
اتحادِ باہمی کی ہے ضرورت اور بھی کار آمد ہے وہ فکری صالحیت اور بھی

پروفیسر عبدالمنان طرزی کی یہ نظم جو دو حصوں پر مشتمل ہے، اُن کی شاعرانہ کوششوں میں بڑی باوقعت اور حاملِ اہمیت ہے جیسا پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے حضرتِ طرزی کے اس کلام میں حُسنِ بیان اور کمالِ شاعرانہ اپنے عروج پر ملتا ہے۔ یہ بات صرف قابلِ تذکرہ ہی نہیں، مدلل بھی ہے۔ اپنے اس بیان کو طرزی صاحب کے چند اشعار نقل کرنے پر میں ختم کرتا ہوں تاکہ یہ مضمون مدلّل اور موّثر ہو سکے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں اور ان ہی کو اس مضمون کا اختتامیہ تصور کیا جائے۔

جس کی انشاء میں بہارِ جاں فزا کا ہے سرور
ہے نشاطِ روح کا ہی موجزن جس میں وفور
جس کی انشاء میں ہے غنچوں کے تبسم کا جمال
جس کی انشاء میں نمودِ صبح کا رنگیں مآل
جس کی انشاء آگہی کا ایک اظہار حسیں
جس کی انشاء میں ہے لطف و انبساطِ صدیقیں

جس کی انشاء میں نگارِ علم ہے قامت دراز
جس کی انشاء مہوشی فکر کا شوقِ نیاز
جس کی انشاء کی لطافت، کیفِ موجِ سلسبیل
جس کی انشاء اپنے ہر دعوے کی ہے خود ہی دلیل
جس کی انشاء مہو شانِ گُل کا رنگیں پیرہن
جس کی انشاء لفظ و معنی کا شگفتہ سا چمن

مزید ؎

مرحبا ایسی خطابت جیسے اک دریا رواں
صبح دم مرغِ چمن گلشن میں جیسے نغمہ خواں
وہ خطابت جو بتادے رازِ برق و آشیاں
وہ خطابت جس میں لطفِ عظمتِ صوتِ اذاں
وہ خطابت جو حیاتِ نو کا بنتی ہے پیام
جو خطابت توڑ دے زنداں کے در، دیوار و بام
وہ خطابت جس کا ہر پہلو ہے تنظیمِ حیات
ایسی شرحِ زندگی جس سے ہو تفہیمِ حیات
فرد کو اُس کا بتادے مرتبہ، منصب، مقام
برگِ گُل شعلہ بیانی سے ہو تیغِ بے نیام
حق و باطل کے لئے اک آئینہ اُس کا خطا
رفعتِ افلاک ہو تسخیر جس سے وہ نصاب

Dr. Shah Zillullah Fateh
Asstt. Professor
Deptt. of Urdu
Adarsh College, Jeewachpur
Ghailarh, Madhepura
Mob. - 94707 03344

ڈاکٹر محمد فضل الرحمٰن

اُردو فکشن اور انتظار حسین

ادبی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس بات سے آشنا ہوتے ہیں کہ ترقی پسند عہد اردو ادب کا عہد زریں تھا،لیکن جدیدیت کے زمانے میں کئی اہم نام انور سجاد، خالدہ حسین، بلراج مین را، سریندر پرکاش، جوگندر پال، رام لال، احمد یوسف، اقبال مجید انتظار حسین ادبی منظر نامے کے اہم دستخط تسلیم کئے گئے۔ انتظار حیسن کے کئی افسانوی مجموعے ''گلی کوچے''، ''کنکری''، ''آخری آدمی''، ''شہرافسوس''، ''کچھوے''، ''خیمے سے دور'' اور ''خالی پنجرہ'' منظر عام پر آکر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ''بستی''، ''تذکرہ'' اور ''آگے سمندر ہے'' آپ کے ناول ہیں۔ آپ نے اردو فکشن کے فروغ میں اپنے قلم کو رواں دواں رکھا۔

ادبی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ اردو فکشن کا دائرہ عمل شروع ہی سے وسیع رہا ہے۔ اس ضمن میں سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ قومی تحریک کے دوران پریم چند نے جس طرح اردو فکشن میں حقیقت پسندی کی اہمیت وافادیت پر فکشن نویسوں کو غور وفکر کی دعوت دی آج اس پیش رفت کا مثبت پہلو یہ ہے کہ آج ایک صدی مکمل ہو جانے کے باوجود اردو فکشن اس امر میں اپنی اہمیت کا لوہا منوانے میں کامیاب ہے کہ اسے اپنے عہد کی حقیقت کی پیشکش میں سرفہرست کا مقام حاصل ہے۔ عہد کے اعتبار سے دیکھا جائے تو پریم چند کے بعد ترقی پسند تحریک کے زمانے میں اس ضمن میں ادیب وفنکار کی بڑی تعداد نے اس ضمن میں اپنی فعالیت کا احساس دلایا۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ترقی پسند تحریک کی صف اول کے فکشن نگاروں کے یہاں واقعتاً ادب زندگی کا آئینہ تسلیم کیا گیا۔

ادبی تاریخ اس پہلو کا بھی انکشاف کرتی ہے کہ کہانی کی پہلی قسم داستان تھی، لیکن جب ادب نے ترقی کے زینے طے کئے تب داستان گوئی نے ناول کی ہیئت اختیار کی۔ اسی طرح اردو ناول کے بطن سے مختصر افسانہ نویسی نے جنم لیا اور اردو فکشن کا رشتہ حقیقت پسندی سے اور زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ اردو فکشن کی اہمیت وافادیت فن اور فکر دونوں اعتبار سے تسلیم کی جانے لگتی ہے۔ یہاں مشاہدے کی گہرائی اور معاشرتی حقیقت کی پیشکش پر خصوصی توجہ دی جانے لگی۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی زندگی اور زمانے کے نامساعد حالات کی تصویر کشی میں ایک فکشن نویس کا قلم رواں دواں رہا۔ لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ اردفکشن سماجی، معاشی، تہذیبی، ثقافتی اور سیاسی صورتحال کی بہترین ترجمانی کرنے لگا۔ کیوں کہ فکشن نویسوں زمانے کے

نامساعد حالات کا انسانی زندگی پر کیا منفی اثر پڑا اس کی پیشکش بھی اپنی نگارشات میں تھی۔

عہد جدید کے معتبر فکشن نگاروں میں انتظار حسین کا مقام اپنی جگہ قائم ہے۔ آپ نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ اردو فکشن کو فن اور فکر دونوں اعتبار سے نئے امکانات سے ہمکنار کیا۔ اس پر اضافہ یہ کہ آپ نے اردو فکشن کا رشتہ داستان حکایت اور مذہبی روایتوں سے استوار کرنے میں بھی اپنی فنی ہنرمندی کا ثبوت فراہم کیا۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے اردو فکشن میں داستانوی فضا کو نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ پیش کرنے میں بھی اپنے فنی اختصاص کا قارئین ادب کو احساس کرایا۔ اس باعث آپ کے فکشن میں فلسفیانہ مزاج اور اساطیری جمالیات اس طرح جلوہ نما ہے کہ قارئین ادب یہ کہنے پر مجبور ہے کہ آپ کے یہاں شعور اور لاشعور دونوں کی کارفرمائی دیکھنے کو ملتی ہے۔

آپ کے فکشن کے حوالے سے یہ بھی کہا جائے گا کہ آپ اساطیری دیومالائی جاتک کتھاؤں استعاروں، علامتوں تمثیلوں اور حکایتوں کے حوالے سے زمانے کی افراط وتفریط اور انسانی زندگی کی بے بسی کو پیش کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا فکشن اس بات کا ثبوت وفراہم کرتا ہے کہ انتظار حسین حساس ذہن کے مالک ہیں یہی وجہ ہے کہ آپ کی تخلیقات پڑھنے والوں کو اپنا گرویدہ بنانے میں کامیاب رہتی ہے۔ یہاں پورا معاشرہ دکھائی دیتا ہے اور پوری انسانی زندگی سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ انتظار حسین کے فکر وفن کے حوالے سے گوپی چند نارنگ فرماتے ہیں :

> ''انتظار حسین کا فن آج کے کھوئے ہوئے یقین کی تلاش کا فن اس لئے ہے کہ مستقبل کا انسان اپنی آگہی کر سکے اور اپنی ذات کو برقرار رکھ سکے۔ اس کے لئے انہیں پُرانے عہد نامے، انجیل، قصص الانبیا، دیومالا، بودھ جاتکا، پرانوں داستانوں اور صوفیا کے ملفوظات سب سے استفادہ کرنا پڑا ہے اور نتیجتاً ایسا انداز اظہار وجود میں آیا ہے جو خاص ان کا اپنا ہے۔ انتظار حسین کا فن خاصہ تہہ دار اور پُر پیچ ہے۔ جہاں ایک طرف اس کی سادگی فریب نظر فراہم کرتی ہے وہیں دوسری طرف اس کی ہشیاری اور پرکاری سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ انتظار حسین کا ذہن ایک متحرک ذہن ہے اور اس کا سیال سفر جاری ہے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ آگے چل کر اس کا رخ کن زمینوں کی طرف ہوگا۔''
>
> (اردو ناول کا تنقیدی جائزہ ۱۹۸۰ء کے بعد، ڈاکٹر احمد صغیر، ص-۱۳۶)

آپ کے فکشن کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ جس طرح آپ نے اردو فکشن میں داستانی طرز تحریر کا انتخاب کیا وہیں ہندوستانی دیومالا طبقاتی کشمکش سیاسی سماجی تہذیبی وثقافتی قدروں کی پامالی کے

ISSN. 2582 - 3612

ساتھ ساتھ مذہب اسلام کے حوالے سے بھی اپنے نظریے کی بہترین ترجمانی کی۔آپ کی تحریروں میں آپ کا نظریہ حیات صاف طور سے عیاں ہے۔ میں یہ بھی عرض کردوں کہ آپ نے اپنے فکشن کے حوالے سے نئے تکنیکی تجربے کرتے ہوئے مشرقیت پر خصوصی توجہ دی ہے۔دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے اردو فکشن کا رشتہ صوفیانہ اور فلسفیانہ رنگ و آہنگ سے استوار کیا ہے۔

جہاں تک علامت کی بات ہے تو ان علامتوں کا رشتہ بھی آپ کے گہرے شعور اور ہندوستانی تہذیب و ثقافت سے ہے۔مختصر یہ کہ معاشرتی زندگی پر آپ کی گہری نظر تھی اور اس طرح انسانی اقدار کی پامالی عورتوں کی محرومی صارفیت انسانی رشتوں کا زوال ہجرت کے مسائل تہذیبی وثقافتی زوال ایسے ان گنت مسائل تھے جو انتظار حسین کے ذہن کو جھنجھور کر رکھ دیا تھا لہٰذا آپ زمانے کے حالات سے اس قدر افسردہ تھے کہ آپ نے اس افسردگی کی پیشکش کے لئے فکشن کو سہارا بنایا یہی وجہ ہے کہ آپ کی تحریروں میں پورے حالات کو اس طرح سمونے کی کوشش ملتی ہے کہ آپ کا نظریہ فکر مکمل طور سے عیاں ہوجاتا ہے۔ناول بستی کے حوالے سے یہ اقتباس دیکھئے :

> ''بستی انتظار حسین کا پہلا بڑا ناول تھا اور ان کے تخلیقی سفر میں اسے نمایاں
> مقام حاصل ہے۔ یہ ناول ۱۹۸۰ء میں منظر عام پر آیا۔اس ناول کا بنیادی
> مسئلہ یا بنیادی تجربہ ہجرت کا ہے۔اس ناول میں ہجرت کے تجربے کو وسیع
> تہذیبی پس منظر میں برتنے اور سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔''
>
> (اردو فکشن میں ہجرت، خان شاہد وہاب، ص-۱۸۶)

تمام باتوں کی روشنی میں ہم یہ کہیں گے کہ آپ کا فکشن فن اور موضوعات کی پیشکش دونوں اعتبار سے اپنی منفرد شناخت رکھتا ہے۔خصوصی طور سے ہیئتی اور تکنیکی تنوع کے اعتبار سے آپ کا فکشن آپ کے فنی اختصاص کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔لہٰذا آپ کا فکشن فکری وفنی جہات کے اعتبار سے ادبی منظرنامے پر اپنی مثال آپ کی حیثیت رکھتا ہے۔مختصر یہ کہ موضوع اسلوب اور تکنیک ہر اعتبار سے آپ کا فکشن قارئین ادب کو اپنا گرویدہ بناتا ہے۔

Dr. Md. Fazlur Rahman
Asstt. Professor
Deptt. of Urdu
J. L. N. M. College
Sursand, Sitamarhi
Mob. - 72500 34458

ڈاکٹر ذاکر حسین (ذکی ہاشمی)

اردو کی ادبی نثر میں اقبال کا مقام

شاعری اور نثر میں بڑی حد تک افتراق پایا جاتا ہے،لیکن ایک مقام ایسا بھی آتا ہے کہ شاعری اور نثر میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ہوتا، اور ایسی صورت حال تب ہوتی ہے جب نثر خالص ادبی ہو، اور جب نثر ادبی صورت اختیار کرلیتی ہے تو اس کی انفرادیت بڑھ جاتی ہے اور اس کی تخلیق بالکل شاعری کی ہو جاتی ہے جس کے کچھ بنیادی اصول اور معیار ہیں، ان اصولوں اور معیاروں کو برتنے والا ہی صحیح معنوں میں تخلیقی فنکار ہوتا ہے۔

علامہ اقبال کی نثر نگاری میں یہ اصول اور معیار بدرجہ اتم موجود ہے،لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ علامہ اقبال بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں اور ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے پوری دنیا میں تسلیم کئے جاتے ہیں اور یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ شاعری نے انھیں اتنا وقت نہیں دیا۔ جتنا نثر نگاری کے لئے درکار ہے، ورنہ نثر کی طرف زیادہ مائل ہوتے اور پوری دنیا انھیں ایک عظیم نثر نگار کی حیثیت سے بھی جانتی۔پھر بھی انھوں نے اپنے خیالات ونظریات کے اظہار کے لئے کئی مضامین و مقالات لکھے جو اس زمانے کے مخزن، اخبار وطن، وکیل اور دیگر اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے، جسے بعد میں کئی ترجمے اور کئی خطبات کی اضافت کے ساتھ مضامین اقبال، مقالات اقبال، گفتار اقبال اور انوار اقبال کے نام سے یکجا کیا گیا ہے۔بعض مقدمے اور دیباچے بھی ہیں جو انھوں نے اپنی شعری تصانیف پر تحریر کئے ہیں۔البتہ ان کے خطوط کا اچھا خاصا سرمایا ہے جو خطوط اقبال، مکاتب اقبال، مکتوبات اقبال، نشاد اقبال، نوادر اقبال اور اقبال نامہ جیسے مختلف مجموعات میں پھیلا ہوا ہے۔

علامہ اقبال کی نثری تصانیف میں "علم الاقتصاد" ایک کامل تصنیف ہے جو 1903ء میں شائع ہوئی۔ جسے اردو زبان میں علم معاشیات پر پہلی کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔گویا اس کے بعد ہی پروفیسر الیاس برنی، پروفیسر حبیب الرحمٰن اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی مختلف کتابیں اس موضوع پر اشاعت پزیر ہوئیں۔ لیکن "علم الاقتصاد" کی اوّلیت اپنی جگہ مسلم رہی جس کے دیباچے میں علامہ اقبال لکھتے ہیں :

> "اس میں شک نہیں کہ تاریخ انسان کے سیل رواں میں اصول مذہب بھی
> بے انتہاں موثر ثابت ہوتے ہیں مگر یہ بات بھی روزمرہ کے تجربے اور

مشاہدے سے ثابت ہوتی ہے کہ روزی کمانے کا دھندا ہر وقت انسان کے
ساتھ ساتھ ہے اور چپکے چپکے اس کے ظاہری اور باطنی قویٰ کو اپنے سانچے
میں ڈھالتا رہتا ہے۔غریبی قوائے انسانی پر بہت برا اثر ڈالتی ہے بلکہ بسا
وقات انسانی روح کے مجلسی آئینے کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی
اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود عدم برابر ہو جاتا ہے۔"

علامہ اقبال کی "علم الاقتصاد" ایک ایسی کتاب ہے جو اپنے قومی و ملّی فرائض کو پورا کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہے۔اور اس کتاب کی خوش قسمتی یہ ہے کہ اردو نثر ایک نئے علمی موضوع سے آشنا ہو گئی، جسکا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں :

"علامہ اقبال نے "علم الاقتصاد" لکھ کر اردو میں علمی نثر لکھنے کا ایک نیا تجربہ کیا
اور ایک ایسے اسلوب نثر کی داغ بیل ڈالی جو انھیں کے ساتھ مخصوص ہے۔

علامہ اقبال نے اقتصادیات جیسے خشک موضوع کو وسعت مطالعہ اور زبان و بیان پہ قدرت حاصل ہونے کی وجہ سے عالمانہ اسلوب میں پیش کر کے اپنی تخلیقی صلاحیت کا جوہر دکھایا، مگر کہیں بھی خشکی اور پھیکا پن پیدا نہیں ہونے دیا۔بقول سید عبدالواحد :

''علامہ اقبال کی پہلی تصنیف "علم الاقتصاد" ایک فنی کتاب ہونے کی وجہ
سے ادبی چٹخاروں اور شوخیوں سے خالی ہے، مگر اس فن پر اردو زبان میں
پہلی تصنیف ہونے کی وجہ سے ایک منفردانہ حیثیت کی حامل ہے۔اور ہم اس
کو ہر لحاظ سے ایک معیاری تصنیف قرار دے سکتے ہیں۔''

اردو نثر نگاری میں اقبال کا مقام متعین کرنے سے قبل اب دیکھنا یہ ہے کہ علامہ اقبال کے زمانے میں اردو نثر کے کیا رجحانات تھے اور کن نثر نگاروں کے اثرات ان پر پڑے۔ تو آیئے اس عہد کے نثری رجحانات کا مختصر جائزہ لیں۔علامہ اقبال نے جب اپنی ادبی آنکھیں کھولیں تو "سر سید تحریک" کے اثرات شباب پر تھے۔اور ہندوستان کی اسلامیات کی زندگی کا قافلہ سرسید ہی کا دامن پکڑ کر آگے بڑھ رہا تھا، گویا سر سید احمد اور ان کے رفقاء الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی۔مولانا ذکاء اللہ، نواب محسن الملک اور مولوی چراغ علی وغیرہ اردو نثر کو تصنع اور تکلف سے نجات دلا کر اسے عام اجتماعی زندگی کا ترجمان اور علمی مطالب کے اظہار کا وسیلہ بناتے ہوئے کئی تصانیف کے خالق بن گئے جنکے موضوعات سیاست، ثقافت، تعلیم، دین، مذہب، معاشرت، تاریخ اور زبان و ادب پر مبنی ہیں۔

ظاہر ہے کہ علامہ اقبال نے بھی سرسید کے افکار و خیالات کا اثر قبول کیا اور یہ اثر ان کی شاعری

اور نثر نگاری دونوں میں پڑا۔ یوں تو شروع میں وہ سرسید اور ان کے رفقاء کے نقش قدم پر ہی چلے مگر آگے چل کر انھوں نے نثر نگاری میں بھی اپنی انفرادیت منوالی۔علامہ اقبال کا پہلا مضمون بعنوان "بچوں کی تعلیم و تربیت" اس زمانے کا مقبول رسالہ "مخزن" جنوری 1902ء میں شائع ہوا۔جس میں اقبال کا فکر و خیال اور علمی رنگ و آہنگ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔پیش ہے یہ اقتباس :

"پڑھے ہوئے شاگردوں کو پڑھانا ایک آسان کام ہے، مگر انجان بچوں کی تعلیم
ایک ایسا دشوار امر ہے کہ ہمارے ملک کے معلم اس کی دقتوں سے ابھی پوری طور
پر آشنا نہیں۔جو لوگ بچوں کی تعلیم و تربیت کے صحیح اور علمی اصولوں کو مد نظر نہیں رکھتے
وہ اپنی نادانی سے سوسائٹی کے حقوق پر ایک ظالمانہ دست درازی کرتے ہیں۔''

اس مضمون کی مقبولیت کے بعد علامہ اقبال کی مضمون نگاری کا جو سلسلہ شروع ہوا تو 1905 تک جاری رہا اور انکے مضامین و مقالے گھر گھر پڑھے جانے لگے۔کیوں کہ اقبال کی نثری تحریروں میں ابہام یا پیچ و خم نہیں بلکہ نثر نگاری کے تمام جزئیات آئینے کی طرح صاف اور شفاف ہیں۔گویا اس میں صفائی بھی ہے اور صاف گوئی بھی، وہ ایک طرف قومی و ملّی یا دینی و مذہبی موضوعات پر علمی گفتگو کرتے ہیں تو دوسری طرف تاریخ کی روشنی میں ایک پیغام بھی دیتے ہیں۔وہ ایک مضمون میں لکھتے ہیں :

"ایک زمانہ تھا کہ اقوام دنیا کی باہمی معرکہ آرائیوں کا فیصلہ تلوار سے ہوا کرتا تھا
اور یہ فولاد کا حربہ دنیائے قدیم کی تاریخ میں ایک زبردست قوت تھی، مگر حال کا
زمانہ ایک عجیب زمانہ ہے جس میں قوموں کی بقا، ان کے افراد کی تعداد، ان
کے زور بازو اور ان کے فولادی ہتھیاروں پر انحصار نہیں رکھتی بلکہ ان کی زندگی
کا دارومدار اس کاٹھ کی تلوار پر ہے جو قلم کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔''

اقبال کے دل میں مسلمانوں کی بدحالی و پامالی اور انکی زبوں حالی کی کچھ تصویریں بھی تھیں جو ان کی نثری تحریروں میں رقص کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ایسی تصویریں اتارنے میں علامہ اقبال کو کامل فن حاصل ہے اور یہ خصوصیت دراصل ان کے شاعرانہ مزاج ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ پیش ہے تصویر کشی کا نثری نمونہ ایک مضمون سے :

"غریب مسلمان کی اقتصادی حالت نہایت ہی افسوس ناک اور قابل رحم ہے
شہروں جہاں کی آبادی کا جزو غالب مسلمان ہیں، معمولی درجے کے مسلمانوں کی
قلیل اجرت، غلیظ مکان اور انکے پیٹ بھر روٹی کو ترستے ہوئے بچوں کا حسرت
ناک نظارہ کس نے دیکھا ہے۔کبھی الم زدہ گھروں کے اندر جا کر دیکھو صدہا مرد

ISSN. 2582 - 3612

اور عورتیں ایسی پاؤ گے جنھوں نے کبھی اچھے دن دیکھے تھے، لیکن آج فاقہ کر رہی ہیں۔ کئی دن سے اناج کا ایک دانہ تک منھ میں اڑ کر نہں گیا لیکن غیرت اور خودداری اجازت نہیں دیتی کہ خیرات کے لئے کسی کے آگے ہاتھ پھیلائیں۔"

علامہ اقبال کی بصیرت کا یہ عالم ہے کہ انکی نثری تحریروں میں بھی تخیل کی تصویر بالکل بولتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور یہ خصوصیت انکے خطوط میں بھی پائی جاتی ہے جس کی اچھی خاصی تعداد ہے جو انھوں نے کبھی محمد علی جناح، اکبر الہٰ آبادی، مولوی عبدالحق، سید نذیر نیازی، عطیہ فیضی، مولانا گرامی، خواجہ حسن نظامی، اور دیگر ہم عصروں کے نام لکھے ہیں۔ ان خطوط کے مطالعے سے اقبال کی سیرت و شخصیت نمایاں ہوتی ہے اور کہیں کہیں ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے کاغذ پر دل ہی نکال کر رکھ دیا ہے۔ پیش ہے ایک خط، جو انھوں نے اپنے دوست خواجہ حسن نظامی کے نام 26/جنوری 1917 کو لاہور سے لکھا تھا۔

مخدومی جناب خواجہ صاحب۔۔۔۔اسلام علیکم

میں آپ کے انداز بیان کا عاشق ہوں اور مجھی پر کیا موقوف ہے، ہندوستانی دنیا میں کوئی دل ایسا نہیں جس کو آپ کے اعجاز نے مسخر نہ کرلیا ہو، اگر مجھ کو یقین ہوتا کہ ایسا انداز تحریر کوشش سے حاصل ہوسکتا ہے، تو قافیہ پیمائی چھوڑ کر آپ کے مقلدین میں شامل ہوجاتا۔ اردو لکھنے والوں میں آپ کی روش سب سے نرالی ہے اور مجھ کو یقین ہے کہ نثر اردو کے آئندہ مورخین آپ کی ادبی خدمات کا خاص طور پر اعتراف کریں گے۔

مخلص

محمد اقبال بیرسٹر (لاہور)

اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کے اندر کتنی خاکساری تھی اور وہ اہل قلم کی کتنی قدر کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے خطوط میں کہیں اختصار کے ساتھ اور کہیں تفصیل کے ساتھ خامہ فرسائی کی ہے، ان میں کہیں سیاسی باتیں ہیں، تو کہیں زندگی کے لطیف پہلوؤں کا ذکر بھی ہے، کہیں علمی گفتگو ہے، تو کہیں مزاج کی شادابی اور رومانیت کی جلوہ گری بھی ہے۔ مگر ہر جگہ زبان و بیاں کی وہی سادگی اور روانی ہے جس میں وحدت جھلکتی ہے۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی :

"زبان کے استعمال میں اقبال کے یہاں تنوع اور رنگارنگی ضرور ہے لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس میں ایک وحدت کا احساس ہوتا ہے اور یہ وحدت زبان کے صحیح استعمال الفاظ کی موسیقیت جملوں کی روانی، عبارت کے بہاؤ، تصویروں کی تخلیق، تشبیہات واستعارات کی مرقع کاری اور اسلوب نثر کی رنگینی سے ہم کنار کرنے کی خواہش میں نظر آتی ہے۔"

المختصر موضوع کے اعتبار سے بھی اور اسلوب کے لحاظ سے بھی علامہ اقبال کی نثری نگارشات امتیازی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ جس پائے کے نثر نگار تھے، اس سے بھی آگے کے وہ نثر نگار ہوتے، لیکن ان کا زیادہ تر وقت گیسوئے شاعری کی مشاطگی میں گزرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ناقدین ادب کی نظریں صرف اور صرف ان کی شاعری پر جمی ہوئی ہیں، لیکن اقبال کی نثری تخلیقات کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نثری تحریریں بھی فکری اور فنی محاسن سے مالا مال ہیں، ان میں عصری اسلوب کی بیشتر خوبیاں موجود ہیں اور وہ ایک عظیم شاعر کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ نثر نگار بھی ہیں۔ بقول عطا کاکوی ؎

اور کیا کہئے کہ روشن تر ترا احوال ہے
تو بلند اقبال و خوش اقبال و سر اقبال ہے۔

Dr. Zakir Hussain (Zaki Hashmi)
Gopalganj
Bihar - 841428
Mob. 9934479225

کیا آپ اپنی کتاب یا رسالہ عالمی اردو قارئین تک پہنچانا چاہتے ہیں؟
سہ ماہی ''ساغرِ ادب'' میں رعایتی نرخ پر اپنی کتاب یا رسالے کا اشتہار دیجئے۔
''ساغرِ ادب'' کی گلوبل ریڈرشپ، کتب و رسائل کی نکاسی کا ایک مؤثر ترین ذریعہ۔

شرح اشتہار

General Full page Space	10,000
General Half page Space	5,000

پتہ :
حُسینا ہاؤس، زکریا کالونی، محلّہ۔ سعد پورہ، پوسٹ۔ رَمنہ، مظفر پور (بہار) پن کوڈ 842 002
موبائل نمبر : 90062 53903 / 94300 84261

ایڈیٹر

ISSN. 2582 - 3612

ڈاکٹر سیّد محمد حبان الحق

ظہیر غازی پوری کا انتقادی شعور ''غزل اور فنِ غزل'' کے حوالے سے

ظہیر غازی پوری کا پورا نام ظہیر عالم انصاری ہے۔ والد کا نام حاجی عبدالحئیٔ انصاری ہے۔ ان کی پیدائش ۸/ جون ۱۹۳۸ء کو ہوئی۔ جیسا کہ نام کے لاحقہ سے ظاہر ہے کہ یوپی کا غازی پور ان کا آبائی وطن ہے۔ محکمہ ٹرانسپورٹ کے آفس سپرنٹنڈنٹ کے عہدے سے ۱۹۹۶ء میں سبکدوش ہوئے۔ جھارکھنڈ کے ہزاری باغ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہیں ۲۰۱۶ء میں ان کا انتقال ہوا۔

ظہیر غازی پوری کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا ہے۔ ان کی پہلی غزل رسالہ ''معاون'' کلکتہ سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی۔ اس غزل کا مطلع ملاحظہ فرمائیں۔

غم کی ظلمت میں مسرت کی ضیا کرتی ہے
صبح ہونے کے لئے شام ہوا کرتی ہے

ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ جن میں ''الفاظ کا سفر'' ۱۹۷۶ء، تثلیث فن، نظموں کا مجموعہ ۱۹۷۲ء، ''آشوب نوا'' غزلوں کا مجموعہ ۱۹۷۸ء، ''کہرے کی دھول''، نظموں کا مجموعہ ۱۹۸۶ء، ''سبز موسم کی صدا'' غزلوں کا مجموعہ ۱۹۹۰ء، ''دعوت صد نشتر'' رباعیوں کا مجموعہ ۱۹۹۷ء ''لفظوں کے پرند'' نظموں کا مجموعہ ۱۹۹۸ء وغیرہ موصوف کی قیمتی، عمدہ اور گراں مایہ تخلیقات ہیں۔ اور نثری تصنیفات ''مطالعہ اقبال کے بعض پہلو'' ۲۰۰۳ء، ''اردو دوہے : ایک تنقیدی جائزہ'' ۲۰۰۵ء ''بہار و جھارکھنڈ کے اہم اہل قلم'' ۲۰۰۹ء ''غزل اور فنِ غزل'' ۲۰۱۵ء وغیرہ ان کی تنقیدی بصیرت کی غماز نگارشات ہیں۔

ظہیر غازی پوری پر کئی خصوصی نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ بیرونِ ملک پاکستان میں بھی ایک رسالہ ''روشنائی'' (کراچی) نے اسی ۸۰/ صفحات پر مشتمل گوشہ بھی شائع کیا تھا۔ ڈاکٹر حنیف ترین نے موصوف کی شخصیت اور فن پر ۱۹۹۸ء میں ایک کتاب شائع کی تھی۔ ڈاکٹر انور مینائی اور منہاج محروم نے ان پر تحقیقی مقالے بھی لکھے ہیں۔ ظہیر غازی پوری نے شاعری کے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اور اپنی شناخت بحیثیت نظم نگار، غزل گو اور رباعی نگار قائم کی ہے۔ شاعری کے علاوہ انہوں نے تنقیدی میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ جو قابلِ قدر بھی ہیں اور ان کی تنقیدی بصیرت کے غماز بھی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فاروق احمد صدیقی کا خیال ملاحظہ فرمائیں :

''ظہیر غازی پوری کی تنقیدی بصیرت ان کی شعری صلاحیتوں سے کم نہیں۔ وہ بہت عمدہ ادبی نثر لکھتے ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اچھی نثر لکھنا اچھا شعر کہنے سے دشوار تر ہے۔ انہوں نے مختلف شعری اصناف میں اپنی فتوحات کا پرچم بلند کیا ہے۔ اور بحیثیت تنقید نگار بھی اپنی علمیت، وسعت مطالعہ، ژرف نگاہی اور دانش وری کا ثبوت فراہم کیا ہے۔''

(غزل اور فن غزل مرتبہ ظہیر غازی پوری صفحہ کتاب کی جلد)

ظاہر ہے ظہیر غازی پوری نثر نگاری میں بھی اپنی زبان دانی، تنقیدی بصیرت، علمیت اور گہرے مطالعے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ اس سے ان کی شخصیت کی ایک جہت اور آشکار ہو جاتی ہے۔ وہ اچھے شاعر کے ساتھ ساتھ ایک ناقد بھی شمار کئے جا سکتے ہیں۔

ان کی تنقیدی نگارشات میں متوازن تنقیدی شعور کارفرما ہے۔ موصوف تنقید نگاری کے فکر و فن سے پوری واقفیت رکھتے ہیں جو ان کے بلند ناقد ہونے کی راہ ہموار کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی تصنیف ''مطالعہ اقبال کے بعض اہم پہلو'' میں موصوف نے اقبال کے تعلق سے جو انکشافات کئے ہیں وہ بالکل مختلف زاویہ نگاہ کے افکار و نظریات کی ترجمانی پیش کرتے ہیں اور یہ حقیقت پر مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے اردو دوہے کے تعلق سے تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ وہ نہایت علم افزا ہے اور دوہا کے صنف پر اپنی نوعیت کی پہلی جامع اور مبسوط تنقیدی جائزہ ہے۔ جو دوہا کے تعلق سے ایک اہم تصنیف کا درجہ رکھتا ہے۔ موصوف کا ایک اور اہم تنقیدی کارنامہ ''جھارکھنڈ اور بہار کے اہل قلم'' بھی ہے۔ جو ان کی تحقیقی اور تنقیدی ذہنی میلان کو آشکار کرتا ہے۔ اور ان کے محنت شاقہ کی دلیل فراہم کرتا ہے اور ان کی وسعت مطالعہ کی گہرائی اور گیرائی واضح کرتا ہے۔

موصوف کی ایک اور تنقیدی تصنیف ''غزل اور فن غزل'' ہے۔ اس تنقیدی مضامین کے مجموعہ میں ان کے مختلف وقتوں میں لکھے گئے مضامین یکجا کئے گئے ہیں۔ جو تمام غزل کے فکری اور فنی اور زبان و اسلوب کے تعلق سے الگ الگ عنوان قائم کر کے لکھے گئے ہیں جو روایتی غزلوں سے جدید غزل اور مابعد جدید غزل کا احاطہ پیش کرتا ہے۔ اس کتاب میں کل گیارہ مضامین ہیں۔ جن کے عنوانات یہ ہیں۔ ''جدید اردو غزل کا دوسرا رخ''، ''غزل ایک جاندار صنف سخن''، ''نیم وحشی صنف شاعری''، ''اکیسویں صدی کی غزل''، ''نئی غزل......اجتہادیت کی غماز''، ''صنف غزل پر مسلسل یلغار''، ''نئی غزل میں تخلیقی لفظ و زبان''، ''اشعار غزل میں عروضی و فنی معائب''، ''ایطا کوئی بڑا عیب نہیں''، ''اردو غزل میں ردیف و قوافی کے مسائل''، ''غزل چہرہ آئینہ در آئینہ''۔ یہ تمام مضامین غزل کے تعلق سے بڑے عالمانہ شعور کے ترجمان ہیں۔ پہلا مضمون ''جدید اردو غزل کا دوسرا رخ'' میں موصوف نے جدید اردو غزل کا دوسرا رخ جو بیان کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں :

ISSN. 2582 - 3612

جدید غزلوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ بیشتر قاری اسے سمجھنے سے بھی قاصر رہ جاتے ہیں۔ بہت سارے اشعار تو دانشورانِ ادب کی سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں۔ اگر نیا ادب، نئی غزل عوامی سطح سے اوپر کی چیزیں ہیں تو یہ کبھی شرف قبولیت حاصل نہ کر سکیں گی۔ اس مشینی عہد نے جہاں انسان کو انسان سے بیزار کر دیا ہے، غم وافکار، کرب وبلا اور اقتصادی مسائل میں الجھا دیا ہے وہیں اس سے فرصت کے لمحات بھی چھین لئے ہیں۔ کسے اتنی مہلت اور فراغت نصیب ہے کہ معمّوں کی گتھیاں سلجھائے۔''

(غزل اور فن غزل مصنفہ ظہیر غازی پوری ۱۵،۱۶)

ایسا نہیں ہے کہ وہ جدید غزلوں کے معترف نہیں ہیں بلکہ وہ کہتے ہیں کہ جدید غزل سے تخلیق و تخیل کے کینوس میں وسعت آتی ہے۔ نئے محاورے نئی علامتیں اور معنویت سے بھرے پیکر تراشے گئے ہیں۔ اور اس سے غزل نئے جذبہ وآہنگ سے ہم کنار ہوتی ہے لیکن جدید غزل کو سب سے زیادہ نقصان ان لوگوں سے ہوا ہے جو شعری اور فنی تقاضوں سے پوری واقفیت نہیں رکھتے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ظہیر غازی پوری اعتدال وتوازن اور غیر جانب داری سے اپنی بات مدلل انداز میں رکھتے ہیں اور مختلف حوالوں اور اشعار سے اپنی بات واضح کرتے ہیں۔

موصوف نے ایک اور مضمون ''نیم وحشی صنف شاعری'' میں بھی نہایت عالمانہ گفتگو کی ہے۔ جس میں مختلف انگریزی زبان کے ناقدوں کے حوالے درج کر کے کلیم الدین احمد کے خیال کی تردید پیش کی ہے اور بتایا ہے کہ کلیم الدین احمد نے جو غزل کے تعلق سے اپنا ہنگامہ خیز جملہ پیش کیا تھا وہ دراصل انگریزی ناقد پوپ کاک اور سنتیانا کے جملے ہیں جو انہوں نے شاعر کے متعلق کہا تھا کہ سائنسی سورج کی چمک کے سامنے شاعری کا چراغ جلنا مشکل ہے اس لئے شاعر مہذب دنیا میں ''نیم وحشی'' کی طرح ہے۔ جو سائنس کے سورج کے سامنے شاعری کا چراغ جلانا چاہتا ہے۔ اس مضمون سے بھی موصوف کے مطالعہ کی گہرائی و گیرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور ان کے شعور نقد ونظر کی باریک بینی، موضوع اور نفسِ موضوع پر گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اس طرح کے مضمون کوئی سطحی ذہنیت والا نہیں لکھ سکتا ہے۔ بلکہ یہ کام وہی کر سکتا ہے جو انتقادی ادب سے گہری وابستگی رکھتا ہو۔

ظہیر غازی پوری نے عظمت اللہ خاں کے ایک بیان کی بھی نکتہ چینی کی ہے۔ جس میں انہوں نے یہ حکم صادر کیا تھا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ خیال کے گلے سے قافیہ کے پھندے کو نکالا جائے اور اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ غزل کی گردن بے دریغ مار دی جائے۔ جو حکم کسی بازگشت کی طرح خود اپنی آواز میں

گم ہو گیا۔ ایک دوسرے مضمون میں ''صنف غزل پر مسلسل یلغار'' میں بھی اسی طرح کے خیالات کا اظہار ہوا ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر ستیہ پال آنند کے ذریعہ ہو رہے صنف غزل پر لگاتار حملے کا دفاع موصوف نے جس طرح خود ستیہ پال آنند کی تحریروں کو پیش کر کے کیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے ملاحظہ فرمائیں :

''گویا ڈاکٹر صاحب کا مطمح ہے کہ اگر اردو کے شعراء غزل گوئی ترک کر کے نظم لکھنے لگیں تو ان کی رسائی دنیا کی زبانوں کی گیلری میں ہو جائے گی۔ لیکن اردو کے تمام شعراء غزل گو تو نہیں ہیں۔ ان کی معتد بہ تعداد مدت دراز سے نظم نگاری میں مصروف ہے اور عہد رواں کے پچاس فیصد شعراء غزل اور نظم دونوں صنف پر یکساں قدرت رکھتے ہیں، پھر ایسا کیوں ہوا کسی ایک شاعر کے لئے غزل کو موردِ الزام ٹھہرانے کی بجائے ڈاکٹر ستیہ پال آنند (ادب کے ڈاکٹر) کو خود اپنا جائزہ لینا چاہئے کہ انہوں نے اپنی نظموں کو پروپگنڈے کے سوا بھی تک اردو زبان میں تخلیق کی جانے والی کتنی معیاری نظموں اور نظموں کے معیاری مجموعوں کے تراجم انگریزی میں پیش کئے ہیں۔ یہ کام تو صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے مزاج داں ہیں۔''

(غزل اور فن غزل مصنفہ ظہیر غازی پوری ص ۵۰۔۵۱)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ظہیر غازی پوری کی تنقید، ایک اعلیٰ تنقیدی شعور رکھتی ہے۔ جو حقیقت کے انکشاف سے تعبیر کی جا سکتی ہے ان کی زبان نہایت سلیس اور سادہ ہے۔ اظہار خیال نہایت آسان طریقہ سے کرتے ہیں جس سے مضمون کے کسی حصے میں تشکیک کا رنگ نہیں ابھرتا ہے۔ ان کی تنقید پر کئی نقادوں نے قلم فرسائی کی ہے۔ سبھی نے اعتراف کیا ہے کہ موصوف کے اندر شاعری کے ساتھ ساتھ تنقیدی شعور پختہ ہے۔ ان کا مطالعہ نہایت عمیق ہے۔ وہ موضوع اور نفسِ موضوع کو نہایت حسن وخوبی سے واضح کرتے ہیں۔ ان کا مطالعہ اور مشاہدہ ہے جس کی کسوٹی پر وہ تخلیق اور تخلیق کار کو پرکھتے ہیں۔ وہ تنقید کرتے وقت جلد بازی سے کام نہیں لیتے ہیں۔ روایت اور جدیدیت دونوں کا پاس رکھتے ہیں۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے ان کی تنقید معیاری اور توجہ کی متقاضی ہے۔

Dr. S. M. Hibbanul Haque
Principal,
A. Z. Academy
At./Po. Chainpur Bangra
Muzaffarpur

ڈاکٹر تحسین فاطمہ

فیض کی نظم ''ہم دیکھیں گے'' ایک مطالعہ

فیض احمد فیضؔ (۱۹۱۱ء-۱۹۸۴ء) اردو شعر و ادب کی ایک بہت ہی محبوب و محترم شخصیت کا نام ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر منظر عام پر آئے اور تھوڑے ہی دنوں میں اپنے نرم و شیریں لہجے، خود کلامی کی صفت، الفاظ کی نغمگی و موسیقیت اور اشاراتی اسلوب و انداز کے سبب سب پر چھا گئے۔ اردو کے تمام ادیبوں اور ناقدوں نے خواہ ترقی پسند ہوں یا غیر ترقی پسند ان کی شاعرانہ عظمت و انفرادیت کو تسلیم کیا۔ اور آج ان کے انتقال کے تقریباً چالیس برسوں بعد بھی ان کے بلند پایہ فکر و فن کے اعترافات کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ آج اسی غیر معمولی مقبولیت کا نتیجہ ہے کہ ان کی ایک عام اور سادہ سی نظم ''ہم دیکھیں گے'' علمی و ادبی حلقوں میں تفہیم و تجزیہ کا موضوع بنی ہوئی ہے۔ بلکہ سیاسی حلقوں میں بھی اس کی گونج سنائی دے رہی ہے۔ حالانکہ اس کا ادبی و فنی مرتبہ بہت بلند نہیں ہے۔ تاہم اس کی انقلابی فکر اور احتجاجی لَے سب کو مست و بیخود کئے ہوئے ہے۔ آج اردو ہندی کی نئی نسل بھی اس نظم سے بطور خاص متاثر ہے۔ یہ فیض احمد فیضؔ کے فکر و فن کی ادبی اور آفاقی اپیل کی بین دلیل ہے۔

یہ تو طے ہے کہ فیضؔ اشتراکیت کے فلسفہ اور مارکسی فکر کے علم بردار رہے ہیں۔ ان کی پوری شاعری سرمایہ دارانہ نظام، ظلم و جبر کی قوت، طبقاتی کشمکش اور بھوک اور جنگ کے خلاف صدائے احتجاج ہے۔ انہوں نے حکمراں طبقہ سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ اور ہمیشہ غریبوں، مجبوروں، اور ضعیفوں کے حقوق کی حمایت کرتے رہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ ؎

عاجزی سیکھی غریبوں کی حمایت سیکھی ... یاس و حرمان کے دکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھے ... سرد آہوں کے رُخِ زرد کے معنی سیکھے

(نقش فریادی، رقیب سے)

اس کے برعکس ظالم حکمراں طبقہ کے خلاف وہ ہمیشہ مورچہ بندی کرتے رہے۔ اور ان کے تعلق سے کبھی نرم گوشہ اپنے دل میں نہیں پیدا ہونے دیا۔ زنداں نامہ، کی ایک غزل کے یہ دو اشعار ملاحظہ ہو ؎

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن نہ تھی تیری انجمن سے پہلے ... سزا خطائے نظر سے پہلے، عتاب جُرمِ سخن سے پہلے
ادھر تقاضے ہیں مصلحت کے، ادھر تقاضے ہیں درد دل کے ... زبان سنبھالیں کہ دل سنبھالیں، اسیر ذکر وطن سے پہلے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

اس طرح اپنے وطن (پاکستان) میں حکمرانوں کی طرف سے بڑھتے ہوئے ظلم و زیادتی اور بیجا دارو گیر کے خلاف یوں اپنے غم و غصے کا اظہار کرتے ہیں ؎

نثار میں تری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے

(دست صبا)

جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے

زیر تبصرہ نظم ''ہم دیکھیں گے'' بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ بھی اپنے موضوع اور مواد کے لحاظ سے حکومتوں کے ظالمانہ رویّے کے خلاف صدائے احتجاج ہے۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ اقتدار ملتے ہی ایک حکمراں آمر مطلق اور فرعون صفت بن جاتا ہے۔ یہ بات کسی ایک ملک یا مملکت کے صاحبان اقتدار تک محدود نہیں۔ اقتدار و حکومت کی عام روش و مزاج ہی یہی ہے۔

زیر تبصرہ نظم ''ہم دیکھیں گے'' انہیں حالات کی پیداوار ہے۔ یہ ۱۹۷۹ء میں وجود میں آئی۔ جب پاکستان میں جنرل ضیاء الحق کی حکومت تھی اور ان کے طرز حکمرانی سے بیزار ہو کر فیضؔ صاحب امریکہ میں مقیم تھے۔ یہ نظم فیضؔ کے ساتویں مجموعہ ''میرے دل میرے مسافر'' میں ہے۔ اور اس کا عنوان ہے۔ ''ویبقیٰ وجہ ربّ'' (یہ قرآن پاک کی سورۂ رحمان کی مشہور آیت ہے) اس کے ذریعہ وہ ساری دنیا کو یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ خدائے ذوالجلال کی ذات پاک کے سوا کائنات کی ہر شئے آنی و فانی ہے۔ کسی کو یہاں ثبات و قیام نہیں خواہ وہ بلند و بالا محلات میں تعیش پسندانہ زندگی گزار رہا ہو یا جھونپڑی میں مصائب و آلام کی زندگی بسر کرتا ہو اور جب حیات و کائنات فنا پذیر و ناپائیدار ہے تو ہم دیکھیں گے کہ ظالم حکمراں طبقہ بھی ایک روز اپنے کیفر کردار کو پہنچ جائے گا اور اس کے بعد خلق خدا آرام و چین کی زندگی بسر کرے گی۔

نظم ''ہم دیکھیں گے'' آزاد نظم کی ہیئت میں ہے اور اس میں چھوٹے بڑے ۲۴ مصرعے ہیں اس کا آغاز یوں ہوتا ہے ؎

ہم دیکھیں گے، ہم دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے

ان مصرعوں کے ذریعہ شاعر یہ تاثر دے رہا ہے کہ ماضی میں ہم نے فرعون بے سامان کو سمندر میں غرق ہوتے دیکھا ہے۔ چنگیز و ہلاکو جیسے انسانیت دشمنوں اور خونخواروں کے انجام بد کو دیکھا ہے۔ دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ء-۱۹۴۴ء) کے بانی و ہیرو، نازی جرمنی کے ہٹلر کی تباہی اور ہلاکت بھی تاریخ عالم کا ایک

ISSN. 2582 - 3612

عبرتناک باب ہے۔ جو تمام تر قوت و شوکت کے باوجود شکست فاش سے دوچار ہوا۔ تو آج کے ظالموں اور جابروں کی کیا اوقات ہے۔ وہ بھی ایک روز دھرتی کا بوجھ ہلکا کریں گے۔ کیونکہ یہ اُن کا مقدر ہے۔ درج بالا افتتاحیہ مصرعوں کے بعد نظم یوں ارتقا پذیر ہوتی ہے۔

وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوحِ ازل میں لکھا ہے
جب ظلم و ستم کے کوہِ گراں
روئی کی طرح اُڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے
یہ دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی
اور اہلِ حکم کے سر اوپر
جب بجلی کڑ کڑ کڑکے گی

یہ تو طے ہے کہ لوح محفوظ میں یہ باتیں تفصیل سے لکھی ہیں ایک روز قیامت آئے گی۔ ساری دنیا فنا ہو جائے گی لیکن خاص بات یہاں سمجھنے کی یہ ہے کہ مذہبی صحیفہ یا صحائف میں جن ہولناک قیامت کے وقوع کی اطلاع دی ہے وہ یہاں مراد نہیں ہے۔ ان کو محض بطور پس منظر استعمال کیا گیا ہے کہ کائنات کی ہر شئے فانی ہے۔ بقا صرف خدائے ذوالجلال کو ہے۔ اس طرح سرمایہ دارانہ نظام جو قیامت کی سختیوں سے کم نہیں، وہاں اپنے بھیانک انجام کو پہنچے گا اور اِک نئے جمہوری نظام کی ابتدا ہوگی۔ جس میں ہر طرف امن و مسرت کے شادیانے بجیں گے۔ اس نظم کے درج ذیل مصرعے زیادہ توجہ طلب ہیں۔

جب ارضِ خدا کے کعبے سے
سب بُت اُٹھوائے جائیں گے

کعبہ اور بت دونوں الفاظ بطور استعارہ لائے گئے ہیں۔ کعبہ سے کائنات اور بت سے ظالم حکمراں مراد ہیں۔ مندروں یا گھروں میں پوجے جانے والے اور پتھر یا مٹی کی مورتیاں مراد نہیں۔ یہاں استعارے سے کام لیا گیا ہے۔ نظم میں پھر ایک انقلابی موڑ آتا ہے۔ اور یوں آگے بڑھتی ہے۔

ہم اہلِ صفا مردودِ حرم
مسند پہ بٹھائے جائیں گے
سب تاج اُچھالے جائیں گے
سب تخت گرائے جائیں گے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

بس نام رہے گا اللہ کا
جو غائب بھی ہے حاضر بھی
جو ناظر بھی ہے منظر بھی

یہاں بھی اہل صفا سے مراد خدا کے سادہ لوح بندے ہیں جو صدیوں سے محکوم و مجبور کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور مردود حرم سے اہلِ اقتدار و حکومت کی طرف سے ٹھکرائے ہوئے افراد و اشخاص مراد ہیں۔ یقیناً ان کے بھلے دن جب آئیں گے تو یہ مسند حکومت پر براجمان ہوں گے اور تخت و تاج والے دھول چاٹنے پر مجبور ہوں گے۔ ان کے ناپاک وجود سے دنیا پاک ہو جائے گی۔ بس ایک اللہ عزوجل کی ذات پاک سے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی وہ اپنے انوار و تجلیات کے اعتبار سے ظاہر بھی ہے اور پوشیدہ بھی نظم کا آخری ٹکڑا یوں ہے۔

اُٹھے گا انا الحق کا نعرہ
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو
اور راج کرے گی خلقِ خدا
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے

یہاں ''انا الحق'' کی ترکیب تلمیح کے طور پر لائی گئی ہے۔ مقصد ہے عوام کے دلوں میں یہ اعتماد و یقین پیدا کرنا کہ ہم اہل حق ہیں۔ باطل کو سرنگوں ہونا تھا جو ہو گیا۔ اب خلق خدا ہر طرف اپنی حقانیت و صداقت کا پرچم بلند کرے گی۔ یعنی جمہور کی حکومت ہوگی۔ یہ زریں انقلاب آ کر رہے گا۔ ہم تصور کی آنکھوں سے یہ تماشا دیکھ رہے ہیں اور آنے والی نسلیں بھی دیکھیں گی۔ ''لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے'' کا ٹکڑا بڑا جاندار اور زوردار ہے۔ حق یہ ہے کہ ظلم و جبر کی قوتوں کے خلاف آواز بلند کرنے میں یہ ایک اہم استعارہ بن گئی ہے۔ اسی لئے آج کے سیاسی ماحول میں بھی اس نظم کی بڑی پذیرائی دیکھی جا رہی ہے۔ اور اب تو اس نظم کی اہمیت پر پورے آفاق نے مہر توثیق لگادی ہے۔

Dr. Tahsin Fatma
Maharaja Road
Near Moqarri Masjid
Muzaffarpur - 842 001

ISSN. 2582 - 3612

ڈاکٹر دستگیر احمد

اردو مثنوی میں نسوانی کردار کا عمومی جائزہ

اردو میں عشقیہ مثنویوں کی معتد بہ تعداد ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں صنف مثنوی میں ایک شاعری اور دوسرے داستان پر مشتمل دو سطح ہوتی ہے۔ جس طرح ہماری داستانوں کو دلچسپ بنانے کے لیے مافوق الفطرت عناصر کی کارفرمائی سے ہمارے داستان گو کام لیتے رہے ہیں اسی طرح مثنویوں میں بیان ہونے والی کہانی میں بھی مافوق الفطرت عناصر شامل کیے جاتے تھے۔ ان میں جن و پریوں کا کردار کہانی میں تجسس اور سنسنی پیدا کرتا ہے۔ عشقیہ مثنویوں میں داستان کی طرح ہیرو اور ہیروئن کا کردار ہوتا ہے اور یہی دراصل کہانی کا مرکزی کردار ہوتا ہے۔ البتہ بعض مثنویوں میں ہیرو کا کردار غیر متحرک نظر آتا ہے۔ نسوانی کردار ہی مرکزی کردار کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اس کی مثال میں ''زہر عشق'' کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ بہر کیف عشقیہ مثنویوں میں عموماً کسی شہزادے کو مرکزی کردار میں پیش کیا جاتا تھا۔ اور اس کی منزل مقصود کوئی مہ جبین اور بے مثال حسن کی شہزادی ہوتی تھی۔ جس کے فراق میں شہزادہ آہ بھرتا ہوا اور نالہ و فریاد کرتا ہوا اس کے کوچے کا طواف کرتا تھا۔ یا اس کے وصال کے لیے بڑی بڑی مصیبتیں اٹھاتا تھا اور آخر میں اس محبوب کے وصال سے اپنی مراد کو پاتا تھا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ عشقیہ مثنویوں میں نسوانی کردار کو ایک نمایاں مقام حاصل رہا ہے۔ اس مرکزی نسوانی کردار کے علاوہ اور بھی بہت سے نسوانی کردار مثنوی کے قصے کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتے رہے ہیں۔ جیسے وزیر زادی جو شہزادی کا ہمراز و خیال ہوتی ہے اور شہزادی کے جدائی اور فراق کے دنوں میں نہ صرف یہ کہ اس کی دل جوئی اور دادرسی کرتی ہے بلکہ محبوب سے وصال کے لیے مشکلیں دور کر کے راہ بھی ہموار کرتی ہے۔ یا کوئی پری زادی رحمت کا فرشتہ بن کر ہیرو کی مدد کرتی ہے۔ بعض مثنویوں میں شہزادے پر پری کو بھی فریفتہ دکھایا گیا ہے۔ اسی طرح دوسرے نسوانی کردار بھی کثرت سے مثنویوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مثنویوں میں نسوانی کردار بڑی اہمیت کا حامل ہے اور اس کا ایک علاحدہ باب کے طور پر ذکر کرنا ایک اہم کام ہے۔

یوں تو عشقیہ مثنویوں کے طور پر خصوصیت کے ساتھ سحر البیان، زہر عشق، سوز و گداز، گلزار نسیم اور قطب مشتری وغیرہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ بھی بہت سی مثنویاں ہیں جو عشقیہ ہیں اور ان میں نسوانی کرداروں کی کارفرمائی بھی قابل توجہ اور قابل ذکر ہے۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خصوصیت

کے ساتھ مذکورہ بالا مثنویوں کے نسوانی کرداروں پر تنقیدی نظر ڈالنے کے ساتھ اختصار میں ہی سہی دوسری عشقیہ مثنویوں کے نسوانی کردار پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں۔ اس کے لیے ہمیں سب سے پہلے دبستان دکن پر نظر ڈالنی ہوگی۔ کیونکہ دیگر اصناف شاعری کی طرح مثنوی کا آغاز بھی سب سے پہلے دکن میں ہی ہوا۔ اور دکن میں کئی یادگار اور تاریخی مثنویاں تخلیق کی گئیں۔ ان میں قطب مشتری، چندر بدن و مہیار، سیف الملوک و بدیع الجمال، طوطی نامہ، بہرام و حسن بانو، پھول بن، ہشت بہشت، گلشن عشق، یوسف زلیخا، بہرام و گل اندام وغیرہ خصوصیت کی حامل ہیں۔

مثنوی، چندر بدن اور مہیار، مقیمی کی مثنوی ہے۔ اس مثنوی کی داستان یہ ہے کہ شہر چندرئین کی چندر بدن نامی شہزادی نہایت حسین و جمیل ہے۔ اسے ایک میلے میں دیکھ کر ایک تاجر کا بیٹا جس کا نام مہیار ہے دل و جان سے فریفتہ ہو جاتا ہے اور وصال کا طالب ہوتا ہے۔ لیکن چندر بدن اسے ٹھکرا دیتی ہے۔ دل گرفتہ مہیار کی مدد انجم نگر کا بادشاہ کرتا ہے لیکن چندر بدن کا باپ مہیار سے اپنی بیٹی کا رشتہ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کی بنیادی وجہ مذہب ہے۔ آخر کار ہجر و فراق کی صعوبتیں جھیلتے جھیلتے نزار ہو جاتا ہے۔ وہ ہجر کی تاب نہ لا کر ایک دن مر جاتا ہے۔ اس کا جنازہ چندر بدن کے محل کے قریب سے گزرتا ہے تو چندر بدن وہاں آتی ہے اور دین اسلام قبول کر لیتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ مہیار کے جنازے کے پہلو میں لپٹ جاتی ہے اور اس کی بھی موت ہو جاتی ہے۔ مقیمی نے اس مثنوی میں عشق کے اس شدت کو دکھایا ہے کہ مرنے کے بعد دونوں کی لاشیں آپس میں اس طرح متصل ہو جاتی ہیں کہ دونوں کو جدا کرنا مشکل ہے۔ نتیجے میں ایک ہی قبر میں دونوں کو دفن کر دیا جاتا ہے۔

نصرتی کی مثنوی ''گلشن عشق'' ایک عشقیہ مثنوی ہے۔ اس مثنوی میں موہر کنور اور مل مانسی کے عشق کو بیان کیا گیا ہے۔ لیکن دکن کی سب سے مشہور مثنوی ''قطب مشتری'' ہے جس میں قطب شاہ اور مشتری کے عشق کی داستان ہے۔ قطب مشتری کی ہیروئن نہایت حسین و جمیل ہے۔ تاہم ایک شہزادی ہونے کے باوجود اس میں وہ وقار اور سلیقہ نہیں پایا جاتا جو ایک شہزادی میں ہونا چاہئے۔ وہ عقل سے کم ہی کام لیتی ہے بلکہ دل کے ہاتھوں مجبور ہے۔ اس کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وہ ایک الھڑ دوشیزہ کی طرح ہے اور جوانی کی امنگوں پر قابو نہیں رکھ پاتی۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قطب مشتری کے ہیرو قطب شاہ کے مقابلے میں معاملات عشق میں بہتر ہے۔ محبوب کی جدائی میں نالہ و فریاد کرتی ہے اور اس کے وصال کی متمنی ہے۔ تاہم وہ جذباتی ہے۔ اسے اس بات کا احساس نہیں کہ وہ شہزادی ہے اور اسے دوسروں سے خود کو ممتاز بھی رکھنا ہے۔ عام دوشیزاؤں کی طرح وہ جذبات سے بے قابو نظر آتی ہے۔ حتیٰ کہ جنسی جذبات کو بھی وہ قابو میں رکھنے میں ناکام نظر آتی ہے۔ بلکہ خود کو اس کے حوالے کر دیتی ہے۔ قطب مشتری میں ایک دوسرا

ISSN. 2582 - 3612

کردار یعنی ہیروئن کی خادمہ جو اس کی غمگسار بھی ہے، ایک متحرک کردار بن کر سامنے آتی ہے۔ وہ نہ صرف شہزادی کے راز سے واقف ہے بلکہ اسے تسلیاں بھی دیتی ہے اور ایک ماں کی طرح نصیحت بھی دیتی ہے۔

قطب مشتری میں ایک اور نسوانی کردار شدت کے ساتھ قاری کو متوجہ کرتا ہے۔ وہ ہے مہتاب پری جو شکل وشباہت میں مشتری جیسی ہے۔ ابتدا میں وہ قطب شاہ پر فریفتہ ہو جاتی ہے لیکن جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہ کسی اور پر فدا ہے تو وہ اس سے دستبردار ہو جاتی ہے بلکہ اسے اپنا بھائی تسلیم کر لیتی ہے۔ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ جن یا پری جب کسی انسان کے پیچھے پڑتی ہے تو بڑی مشکل سے ہی اسے چھوڑنے پر آمادہ ہوتی ہے۔ اور یہ دردمندی اس کی بے لوث محبت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔

شمالی ہند کی بات کریں تو سب سے پہلے نظر میر کی مثنویوں پر پڑتی ہے۔ میر نے ۳۲ مثنویاں لکھی ہیں جن میں چھ مثنویاں عشقیہ ہے۔ میر کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی مثنویوں میں معاملات عشق اور جنسی بے راہ روی نہیں پائی جاتی۔ وہ حد اعتدال سے نہیں گزرتے اور بے حیائی کی باتوں سے گریز کرتے ہیں۔ ان کی عشقیہ مثنویوں میں دریائے عشق مشہور ہے۔ اس مثنوی کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک نوجوان جو خود خوبرو ہے ایک مرتبہ ایک مکان کی کھڑکی پر ایک حسین وجمیل لڑکی کو بیٹھے ہوئے دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ یہ فریفتگی اس قدر بڑھی کہ اس کی یاد میں تڑپنے اور آہ بکا کرنے لگا۔ یہاں تک کہ اس کا ذکر عام ہوا۔ اور معاشرے میں بات پھیل گئی۔ لڑکی کے گھر والوں نے اپنی عزت وآبرو بچانے کے لیے لڑکے کو باز رکھنے کی کوشش کی۔ اس کے لیے لڑکے کو اذیتیں بھی دی گئیں۔ لیکن وہ باز نہ آیا۔ آخر کار ایک دایہ کے ساتھ لڑکی کو دریا پار کسی مقام پر بھیجا گیا۔ لڑکے کو اس کی خبر ہوگئی اور وہ بھی پیچھے پیچھے ہولیا۔ اور جب لڑکی کشتی پر سوار ہوئی تو عاشق بھی سوار ہو گیا۔ دایہ گرگ باراں دیدہ تھی۔ اس نے جب دیکھا کہ لڑکا بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہے تو اس نے ایک حیلہ نکالا۔ اور لڑکی کی جوتی دریا میں پھینک دی۔ اور عاشق سے کہا کہ تمہاری محبوبہ کی جوتی دریا میں گر گئی ہے۔ وہ بہہ رہی ہے۔ اسے نکال کر لا دو۔ اپنی محبوبہ کو برہنہ پا مت چھوڑو۔ عاشق یہ دیکھ کر بغیر سوچے سمجھے دریا میں کود جاتا ہے۔ اور غرق ہو جاتا ہے۔ دایہ لڑکی کو لے کر منزل مقصود تک پہنچتی ہے اور کچھ دنوں قیام کرتی ہے لیکن اس کی طبیعت گھبرانے لگتی ہے اور گھر جانے کی ضد کرنے لگتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ عاشق تو ڈوب گیا ہے۔ اس کی طرف سے اب کوئی خوف نہیں ہے اس لئے اب گھر چلو۔ دایہ لڑکی معشوقہ کو لے کر واپس آتی ہے۔ دریا پار کرنے کے دوران معشوقہ بھی اسی مقام پر دریا میں چھلانگ لگا دیتی ہے جہاں عاشق غرقاب ہوا تھا۔ غوطہ خور بلائے گئے اور لڑکی کی لاش نکالی گئی لیکن ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ لڑکی کی لاش جب نکالی گئی وہ تنہا نہیں تھی بلکہ اس کی لاش کے ساتھ عاشق کی لاش بھی لپٹی ہوئی تھی۔ میر کی یہ مثنوی محض دو سو اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں نہ تو معاملات عشق ہے اور نہ ہی جنسی بے راہ روی۔ اس مثنوی کی

نسوانی کردار پوری مثنوی میں جاندار نہیں ہے۔ البتہ جب وہ عاشق کی محبت میں دریا میں چھلانگ لگا دیتی ہے تو اس کا کردار ابھر کر سامنے آتا ہے اور نمایاں ہو جاتا ہے۔

سب سے مشہور مثنوی میر حسن کی سحر البیان ہے۔ جو بدر منیر کے نام سے بھی مشہور و معروف ہے۔ یہ ایک داستان عشق ہے اور ۲۲ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی میں تین اہم نسوانی کردار ہیں۔ ایک بدر منیر کا کردار جو اس کہانی کی ہیروئین ہے۔ دوسرے ماہ رخ پری اور تیسرا نسوانی کردار نجم النساء کا ہے۔ اس کہانی کا ہیرو ایک شہزادہ ہے جس کے متعلق نجومیوں نے پیشن گوئی کی ہے کہ بارہ سال کی عمر میں مصیبت آئے گی۔ اور سب کچھ برباد ہو جائے گا۔ شہزادہ یعنی بے نظیر ایک دن چھت پر سویا ہوا تھا کہ ادھر سے ماہ رخ پری کا گزر ہوا اور وہ شہزادہ پر عاشق ہوگئی اور اسے اڑا کر پرستان لے جاتی ہے۔ لیکن پرستان کے تمام تر حسن اور جاذبیت کے باوجود شہزادہ بے نظیر اداس اور ملول رہتا ہے۔ اس کی دل بستگی کے لیے ماہ رخ پری اسے فلک سیر نام کا ایک گھوڑا دیتی ہے تاکہ ادھر ادھر گھوم پھر کر وہ اپنا دل بہلائے۔ ماہ رخ چونکہ اس پر فریفتہ ہے اس لیے اسے خوش رکھنے کے لیے ہر جتن کرتی ہے۔ اور اسے ملتفت اور متوجہ کرنے کے لیے بناؤ سنگار کرتی ہے۔ تاہم شہزادہ سیر کو گھوڑے پر سوار ہو کر نکلتا ہے اور ایک سفید محل کے پاس پہنچتا ہے وہاں ایک خوبصورت باغ ہے۔ وہ باغ کی خوبصورتی کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوتا ہے اور وہاں چلا جاتا ہے۔ محل میں اسے ایک دوشیزہ نظر آتی ہے جو نہایت حسین وجمیل ہے۔ اس کا نام بدر منیر ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور فدا ہو جاتے ہیں۔ اب بے نظیر اس کی ملاقات کو روزانہ جانے لگتا ہے۔ بے نظیر دن بھر بدر منیر کے ساتھ رہتا ہے اور رات کو ماہ رخ کے پاس لوٹ آتا ہے۔ لیکن یہ بات پوشیدہ نہیں رہ پاتی۔ ایک دن دیو اس معاشقے کے بارے میں ماہ رخ کو بتا دیتا ہے۔ ماہ رخ کو اس پر غصہ آتا ہے اور وہ مارے حسد کے بے نظیر کو ایک کنوئیں میں قید کر دیتی ہے جو اندھیرا ہے۔ ادھر بے نظیر کے نہیں آنے سے بدر منیر کا بھی برا حال ہے۔ اسی حالت جدائی میں ایک رات وہ خواب دیکھتی ہے کہ اس کا عاشق بے نظیر کوہ قاف کے ایک کوئیں میں قید ہے اور اس کی حالت ابتر ہے۔ وہ زندگی کے دن گن رہا ہے۔ اس درمیان اس مثنوی کا تیسرا نسوانی کردار ابھر کر سامنے آتا ہے۔ یہ کردار وزیرزادی نجم النسا کا ہے۔ جو بدر منیر کی رازدار، ہمدم اور دوست ہے۔ بدر منیر اس سے اپنا خواب بیان کرتی ہے۔ وہ بدر منیر کی روپ اختیار کرتی ہے اور بیابان کی طرف نکل پڑتی ہے۔ اسی بیابان میں جنوں کے بادشاہ کا بیٹا فیروز شاہ سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ فیروز شاہ جو اس بیابان سے گزر رہا تھا نجم النسا کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ اور اسے پرستان لے جاتا ہے۔ نجم النسا موسیقی کی ماہر ہے۔ پرستان میں وہ اپنی موسیقی کے سہارے جنوں کے بادشاہ کے ساتھ دوسرے جنوں کو بھی اپنی موسیقی کا غلام بنا لیتی ہے۔ اسی درمیان حالات سازگار دیکھ کر نجم النسا اسے اپنے جوگن بننے کا راز بتاتی ہے۔ اور یہ

ISSN. 2582 - 3612

شرط رکھتی ہے کہ اگر وہ بےنظیر کو ڈھونڈ نکالے تو وہ بھی اس کی مراد پوری کردے گی۔ فیروز شاہ جلد ہی اس بات کا پتہ لگا لیتا ہے کہ بےنظیر کہاں ہے۔ پری زادوں کے ذریعہ اسے یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کی بہن ماہ رخ نے بےنظیر کو قید کر رکھا ہے جو اس پر فریفتہ ہے۔ فیروز شاہ، کوڑا دھمکا کر بےنظیر کو آزاد کراتا ہے۔ اور بدرمنیر اور بےنظیر کا وصل ہوجاتا ہے۔ بےنظیر، بدرمنیر کے باپ مسعود شاہ کو شادی کا پیغام بھیجتا ہے۔ جو قبول کیا جاتا ہے اور دونوں کی شادی ہوجاتی ہے۔

اس مثنوی میں سب سے جاندار کردار نجم النسا کا ہے۔ اسی کی بدولت عاشق اور معشوق کو مصیبت سے نجات ملتی ہے اور وصال ہوتا ہے۔ دوسرا جاندار کردار ماہ رخ کا ہے۔ تیسرے درجے پر بدرمنیر کے کردار کو رکھا جاسکتا ہے۔ بدرمنیر کا کردار زیادہ متحرک نہیں ہے۔ اور وہ کمزور دل کی عورت ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک جذباتی عورت ہے۔ جو پہلی ہی نظر میں بےنظیر کو دیکھ کر اس پر عاشق ہوجاتی ہے۔ اور اس کی جدائی میں بار بار غش کھاتی ہے۔ اس پر غضب یہ ہے کہ وہ ایک عامیانہ کردار یا نچلے درجے کی عورت کی طرح ہر رات وصل کی خواہش مند ہے۔ جس سے اس کا کردار مجروح ہورہا ہے۔ نجم النسا ایک سلیقہ شعار نظم وضبط والی ہی نہیں ایک ایثار وقربانی کا جذبہ رکھنے والی عظیم لڑکی بھی ہے۔ اس میں وفا شعاری اور ایثار کا جذبہ ہے۔ وہ کسی مقام پر جذباتی نہیں بلکہ جب بدرمنیر جدائی کے نالے کھینچتی ہے تو نجم النسا اسے صبر سے کام لینے کی تلقین کرتی ہے۔ اور یہ کہتی ہے کہ تو اس کے غم میں گھلی جارہی ہے۔ شہزادہ تو پری کے ساتھ دادِ عیش دے رہا ہوگا۔ اور آخرکار جب شہزادہ پر ان باتوں کا بھی اثر نہیں ہوتا تو وہ اکیلے جوگن کا روپ اختیار کرکے اس کی تلاش میں نکل پڑتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کردار میں ایک خامی بھی آگئی ہے۔ وہ یہ کہ شہزادی بدرمنیر کو جنسی لذت حاصل کرنے کیلئے ابھارتی ہے حالانکہ وہ خود دوشیزہ ہے۔ ایسے میں اس کے کردار میں تھوڑا سا ابتذال بھی پیدا ہوگیا ہے۔

اس مثنوی میں جب بےنظیر کو دیکھ کر منیر بےہوش ہوجاتی ہے تو وزیر زادی یعنی نجم النسا اس کے منھ پر عرق گلاب چھڑک کر اس کو ہوش میں لاتی ہے۔ لیکن ہوش میں آنے کے بعد بدرمنیر، بےنظیر کی طرف التفات نہیں کرتی اور وہاں سے اٹھ کر دالان کی طرف چلی جاتی ہے۔ حالانکہ اسکے دل میں بھی محبت ہے۔ لیکن بظاہر منھ موڑنا اس کا ناز ونخرہ ہے۔ مثنوی نگار نے اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے ؂

ادائیں سب اپنی دکھاتی چلی
چھپا منھ کو اور مسکراتی چلی
غضب منھ پہ ظاہر و لے دل میں چاہ
نہاں آہ آہ اور عیاں واہ واہ

وزیرزادی اس کی یہ دلبری دیکھ کر اس کے پاس پہنچتی ہے اور کہتی ہے ؂

مجھے چوچلے تو خوش آتے نہیں
ترے ناز بے جا یہ بھاتے نہیں
کیا ہے اگر تو نے گھائل اسے
تو مت چھوڑ اب نیم بسمل اسے

اور یہیں پر نجم النسا پر بدرمنیر سے جوانی کا مزہ اور زندگانی کا حظ اٹھانے اور دادِ عیش دینے کی بات کہتی ہے۔ یہ سن کر بدرمنیر اسے چھیڑتی ہے اور کہتی ہے کہ اچھا یہ معلوم ہوا کہ تمھارا دل اس پر آگیا ہے اور تو مجھ پر رکھ کر بہانے کررہی ہے۔ اس پر نجم النسا طنز کرتے ہوئے کہتی ہے ؂

لگی کہنے ہنس ہنس کے وہ ماہ وش
ہوئی تھی اسے دیکھ میں ہی تو غش
تمھیں نے تو چھیڑ کا تھا مجھ پر گلاب
بھلا میری خاطر بلالو شتاب

نسوانی کرداروں میں جہاں محبت کا جذبہ بھرپور انداز میں پایا جاتا ہے وہیں ان میں بعض اوقات جنسی لذت حاصل کرنے کا بھی ایک بڑھا ہوا جذبہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ تاہم کچھ اہم مثنویوں میں نسوانی کردار یادگار اور بےمثال ہیں جن کی بدولت اردو مثنوی کی تاریخ میں ان کا نام آج تک زندہ ہے بلکہ سنہرے حروف میں لکھا جاتا ہے۔ کچھ ایسی مثنویوں کا بھی پتہ چلتا ہے جو عاشقانہ ہیں اور ان میں عشقیہ جذبات کا بیان ہوا ہے۔ تاہم یہ مثنویاں بہت اہم نہیں ہیں اور بجا طوالت کے خوف سے انھیں احاطہ تحریر میں لانے سے قلم انداز کیا جاتا ہے۔

Dr. Dastagir Ahmad
Asstt. Professor
Deptt. of Urdu
B. R. A. Degree College
Barharia, Siwan
Mob. : 82719 17922

ڈاکٹر تسنیم فاطمہ

اردو افسانے کی معتبر نسوانی آواز

ادبی تاریخ کا مطالعہ اس پہلو کی وضاحت کرتا ہے کہ صنف افسانہ کی اہمیت ابتدا سے رہی ہے۔اس پر اضافہ یہ کہ یہ صنف ابتدا تا حال ترقی کے منازل طے کرنے میں کامیاب رہی ہے۔اس کی اہمیت اس پہلو میں پنہاں ہے کہ ایک کہانی انسانی زندگی کی حقیقت کو سامنے لانے میں معاون رہتی ہے۔ یہی وجہ کہ افسانہ کو فکری اور فنی دونوں اعتبار سے اہمیت حاصل رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک بہترین افسانہ زندگی اور معاشرے کی بہترین عکاسی کرنے میں اپنی اہمیت درج کرانے میں کامیاب رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس صنف کا دائرۂ عمل ابتدا تا حال وسیع رہا ہے۔اس کی اہم وجہ ادب میں آفاقی تصور کو اہمیت حاصل رہی ہے۔ افسانوی فن کے سلسلے سے ڈاکٹر وقار عظیم رقم طراز ہیں:

''انسان کو اپنے تفریحی مشاغل میں کثیر بیونت اور کاٹ چھانٹ کرنا پڑی تو اس کا مزاج جسے کہانی سننے کا چسکا ہمیشہ سے ہے افسانے کی ایک صنف کا طلبگار رہا جو زندگی اور فن کو اس طرح سموئے کہ انسان کو اس سے ذہنی سرور و مسرت کا سرمایہ بھی ہاتھ لگے اور زندگی کے مسائل کو حل کرنے اور اپنے ماحول کو حسین ترین بنانے کی آرزو بھی پوری ہو اور اس کے باوجود اتنی مختصر ہو کہ وقت پر اس کی گرفت مضبوط رہے اور ایسے بے شمار مشاغل میں سے بھی کہانی پڑھنے کا وقت نکال سکے۔ زمانے کے یہ سب تقاضے اور ان کی یہ سب ضرورتیں مختصر افسانہ کی تخلیقی بنیاد ہیں۔''

(فن افسانہ نگاری، سید وقار عظیم، ص-۱۵)

مندرجہ بالا اقتباس کے حوالے سے اردو افسانے کی فنی خصوصیات سے بخوبی آشنائی حاصل ہو جاتی ہے۔ اردو افسانے کے سلسلے سے ڈاکٹر عبدالمغنی کا یہ قول بھی کافی اہمیت رکھتا ہے ملاحظہ کیجئے:

''افسانہ ایک وسیع لفظ ہے اور اس کے مختلف معنی مختلف سطحوں پر ہوتے ہیں۔ اصطلاحی طور پر اردو تنقید میں افسانہ ایک خاص صنف ادب کا نام ہے جسے پورے طور پر افسانہ کہا جاتا ہے۔ یہ دراصل انگریزی لفظ

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

Short Story کا ترجمہ ہے۔ چھوٹی یا بڑی کہانی کے مفہوم میں چند دوسرے الفاظ بھی اردو میں مستعمل ہیں۔''

(تشکیل افسانہ، عبدالمغنی، ص-۱۷)

اس طرح اردو افسانہ کے سلسلے سے مذکورہ بالا اہل قلم نے بہترین معلومات فراہم کی ہیں۔

جہاں تک خواتین افسانہ نگاروں کی بات ہے تو اردو افسانے کو وسعت عطا کرنے میں ان کا اہم رول رہا ہے۔جن میں نذر سجاد حیدر، رشید جہاں، صالحہ عابد حسین، پروین شیر، عصمت چغتائی، شکیلہ اختر، قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور، بانو قدسیہ، ہاجرہ مسرور، جیلانی بانو، ذکیہ مشہدی، قمر جہاں، کہکشاں انجم، صادقہ نواب سحر، ثروت خان، ترنم ریاض، امتیاز فاطمی، اشرف جہاں، تسنیم کوثر، عصمت آرا، افسانہ خاتون، نگار عظیم کے نام زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ہندو پاک کی سرزمین سے منسلک بیشتر خواتین افسانہ نگاروں کی کہانیاں اپنے عہد کی ترجمانی میں بیش بہا کی اہمیت رکھتی ہیں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہاں زندگی کے مختلف شیڈس کو سمیٹنے کی بھرپور کوشش دیکھنے کو ملتی ہے جس میں مذکورہ بالا تمام خواتین افسانہ نگار کامیاب نظر آتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیاں بڑی ہی دلچسپی کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں۔لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ ابتدا تا حال کی تمام خواتین افسانہ نگاروں نے زندگی اور معاشرے سے جڑے تمام احوال و مسائل کو پیش کرنے پر خصوصی توجہ دی ہے۔

موضوعاتی سطح پر دیکھا جائے تو ان خواتین افسانہ نگاروں نے قدروں کی پامالی رشتوں کی پامالی جنسی کجروی معاشرتی بدحالی مشینی زندگی کی اذیتیں، صارفیت کے منفی اثرات عورتوں کی محرومی و بے بسی جیسے متعدد مسائل پر اپنی کہانیوں کی عمارتیں کھڑی کی ہیں۔ اس پر اضافہ یہ کہ نسائی حسیت پر خصوصی طور سے فوکس دیکھنے کو ملتا ہے۔خواتین افسانہ نگاروں کی کہانیاں کس حد تک کامیاب ہیں اس سلسلے سے پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا یہ قول بہت ہی کارآمد ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

''یہ افسانے زندگی کے بارے میں ان کے گونا گوں مشاہدات کا ماحصل ہیں۔ ان کا مواد گرد و پیش کی زندگی میں بکھرا پڑا ہے............ یہ سب افسانے فنی اعتبار سے حقیقت نگاری کے ضمن میں آتے ہیں۔ ان افسانوں کا موضوع بیشتر صورتوں میں خاندانی زندگی کی اکائی ہے جس میں فرد کے تمام اعمال اور رشتے پیوست اور گتھے ہوئے ہیں۔''

(رسالہ معاصر اردو ادب، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ص-۲۷۰)

مختصر یہ کہ جب ہم خواتین افسانہ نگاروں کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہیں تب اس بات کی

ISSN. 2582 - 3612

وضاحت ہوتی ہے کہ ان کے افسانوں میں زندگی کو داخلی احساس اور فن کی سطح پر برتنے کی بھرپور کوشش ملتی ہے۔ بہت ہی حوصلہ مندی کے ساتھ زندگی کے حقائق کو بیان کرنے میں ان کے قلم کو کامیابی حاصل ہے۔

خواتین افسانہ نگار اس پہلو سے بخوبی آشنا ہیں کہ افسانہ کا مقصد تعمیری ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سماجی، اخلاقی، مذہبی، تہذیبی، تعلیمی او سیاسی ہر پہلو سے منسلک افسانے قارئین کو اپنا گرویدہ بنانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ شکیلہ اختر نے اپنے افسانوں میں گھریلو زندگی کے واقعات کو بڑی ہی سنجیدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ آپ کے افسانے کا پلاٹ کردار ماحول اور زبان سبھی گھر کی چہار دیواری سے متعلق ہے۔ قرۃ العین حیدر کے افسانے مخصوص اسلوب کی بنیاد پر خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ مختصر یہ کہ آپ اجتماعی شعور کی بازیافت کرتی نظر آتی ہیں۔

جہاں تک ذکیہ مشہدی کی افسانہ نگاری کی بات ہے تو آپ کا یہ فنی اختصاص ہے کہ آپ جس موضوع پر قلم اٹھاتی ہیں اس پر سیر حاصل گفتگو کرتی نظر آتی ہیں۔ مختصر یہ کہ گھریلو زندگی طوائفوں کی زندگی اور دیگر پہلوؤں کی عکاسی میں آپ کے افسانے اپنی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلے سے یہ بھی کہا جائے گا کہ آپ ایک مصور کی آنکھوں سے دیکھتی ہیں۔ آپ کے افسانوں کی سب سے اہم خوبی کردار نگاری ہے۔ آپ کے کردار سیدھے سادے عیار، مکار، شاطر اور سیاست داں کی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں اور زندگی اور معاشرے کی عکاسی میں اپنی اہمیت درج کرانے میں کامیاب رہتے ہیں۔ آپ کی افسانہ نگاری سے متعلق یہ اقتباس دیکھئے:

> ''ذکیہ مشہدی دراصل مصور کی آنکھ سے دیکھتی ہیں۔ Events کو خوبصورت فریم میں جڑنے میں انہیں مہارت حاصل ہے۔ ان کے یہاں سب سے بڑی چیز ہے کردار نگاری۔ کردار نگاری جو منٹو اور بیدی سے اردو ادب میں تقریباً ختم ہو چکی تھی ذکیہ فنی چابک دستی سے ایسے ہر کردار کو بھرپور زندگی کے ساتھ پیش کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔''

(اردو کی اہم خواتین افسانہ نگار، ڈاکٹر رخسانہ جمیل، ص-۱۳۲)

آپ کے افسانوی مجموعے ''پرائے چہرے'' ۱۹۸۴ء ''تاریک راہوں کے مسافر'' ۲۰۰۳ء ''صدائے بازگشت'' ۲۰۰۳ء اور ''نقش ناتمام'' ۲۰۰۸ء ہیں۔ جنہیں ادبی دنیا میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان مجموعے کے تمام تر افسانے بیش بہا کی اہمیت رکھتے ہیں۔

خواتین افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام ترنم ریاض کا ہے۔ آپ نے بہت ہی کم وقفے میں افسانوی ادب کے منظرنامے پر اپنا مقام درج کرانے میں کامیابی حاصل کی۔ ''یہ تنگ زمین'' ۱۹۹۸ء

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

''ابابیلیں لوٹ آئیں گی'' ۲۰۰۰ء ''یمبرزل'' ۲۰۰۴ء اور ''میرا رخت سفر'' ۲۰۰۸ء آپ کے افسانوی مجموعے ہیں۔ آپ نے اپنی کہانیوں میں علاقائیت کو زیادہ فوقیت عطا کی ہے۔ آپ کا تعلق چوں کہ کشمیر سے ہے لہٰذا آپ نے بیشتر افسانوں میں کشمیر کے پس منظر کو پیش کرنے پر خصوصی توجہ دی ہے۔ اس سلسلے سے آپ کے افسانے ''کشتی''، ''ایک پہلو یہ بھی تصویر کا''، ''تعبیر''، ''کانچ کے پردے''، ''چھوئی موئی'' زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ آپ کی افسانہ نگاری کے تعلق سے پروفیسر ابوالکلام قاسمی فرماتے ہیں:

> ''ترنم ریاض کا اظہار اور بیانیہ ان کی اپنی ذات کے ساتھ تہذیب و ثقافت اور اعلیٰ اقدار پر مبنی ہوتا ہے۔ روایت کے بھرپور شعور کے ساتھ تجربہ کا رنگ بھی شامل نظر آتا ہے وہ صورت حال کو کہانی بنانا جانتی ہیں اور اپنے زمانے کے اسلوبیاتی رویوں سے واقفیت کے باعث کسب فیض بھی کرتی ہیں۔''

(جدید خواتین افسانہ نگار نظریہ اور تجزیہ، صالحہ زریں، ص-۱۵۲)

تمام باتوں کی روشنی میں کہا جائے گا کہ صنف افسانہ نگاری کو نئی معنویت عطا کرنے میں خواتین افسانہ نگاروں نے اہم رول ادا کیا ہے۔ یہ سلسلہ آج بھی قائم ہے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی ہماری خواتین افسانہ نگار اپنی فعالیت کا احساس کراتی رہیں گی۔

DR. Tasneem Fatma
D/O Md. Tahir Hussain
Sadar Gali
Patna City
Patna - 800008

ISSN. 2582 - 3612

ڈاکٹر محمد نثار عالم

عبدالغفور شہبازؔ کی رباعیوں کا تنقیدی جائزہ

عبدالغفور شہبازؔ کی شخصیت مختلف جہات سے اردو ادب میں اپنی شناخت رکھتی ہے۔ ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں رنگ شاعری ہے۔ انہوں نے غزلیں، نظمیں اور رباعیات وقطعات، ہجویات اور مرثیے بھی کہے ہیں۔ ان کی شاعری میں حالؔی کی فکر اور اکبرؔ الہ آبادی کی طنز وظرافت خاص اہمیت رکھتی ہے۔ موصوف سرسید احمد کی اصلاحی تحریک سے بھی بہت متاثر ہیں۔ ان کی شاعری میں ندرت وجدت ان کا وصف خاص ہے۔ وہ مشرق ومغرب کی انتہا پسندی کے شکار نہیں ہیں بلکہ دونوں میں توازن برقرار رکھتے ہیں اردو کی بیشتر اصناف سخن میں انہوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ انہوں نے رباعیات میں بھی اپنا زورِ قلم آزمایا ہے اور کامیاب وکامران رہے ہیں۔ انہوں نے یہاں بھی اپنا وصف خاص قائم رکھا ہے۔ رباعی کی روایت کا پاس رکھتے ہوئے انہوں نے جدت وندرت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے کل تین سوستائیس ۳۲۷ / رباعیاں کہی ہیں۔ جن میں فکری اور فنی چابک دستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا مخصوص انداز بیان وضع کیا ہے۔ عام طور سے ان کا اسلوبِ بیان نہایت موثر اور پُر اثر ہوتا ہے۔ لفظوں کے انتخاب میں بھی وہ نہایت شعور مندی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ فکر میں پیچیدگی پیدا ہونے نہیں دیتے ہیں۔ شہبازؔ کی رباعیوں کے سلسلے میں ان کی رباعیوں کا مجموعہ ''رباعیات شہباز'' کے مقدمے میں نواب سید محمد آزاد یوں رقم طراز ہیں :

''حضرت شہبازؔ کی رباعیوں کی مجموعی قوت، دل نشیں اثر پُر منفعت، دل فریبی اور نتیجہ بخش، دل چسپی ایسی نہیں ہے کہ کوئی کوڑھ سے کوڑھ طبیعت بھی ان کی لذّت سے محروم رہ سکے اور گلشن معانی کی سیر کے بعد اپنے دامن امید کو پھولوں سے خالی پائے۔ اس گلستانِ دانش واخلاق فشاں کے ترتیب، آراستہ بنانے اور رونق بخشنے میں مصنف کی نہایت خوش سلیقہ و باغبان طبیعت کو بھی مشقّت، پلّے سرے کی تلاش اور بڑی کاوش ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں سب سے زیادہ رعایت اس کی کی گئی ہے کہ ہر مذاق، ہر خیال، ہر روش اور ہر رنگ کے آدمی کا اس کی گلگشت سے جی بہلے اور ہر مزاج کو اس

کی سیر سے تفریح حاصل ہو۔''

(رباعیات شہبازؔ: نواب سید محمد آزاد ص ۴۔۵)

شہبازؔ نے رباعیات میں خیالات وافکار کا بڑا دل کشا منظر پیش کیا ہے اور سادہ یا افتادہ مضامین کو قدرت کلام اور حسن بیان سے زندگی بخش دی ہے۔ رباعیات میں موضوع اور زبان کی ہم آہنگی بھی فنکارانہ ہے۔ جس موضوع کے لئے جن لفظوں کی ضرورت ہے موصوف ایسے ہی الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مذہب کے تعلق سے کل بارہ رباعیاں لکھی ہیں۔ مناظر قدرت کے موضوع پر ۸۳ / تیراسی، اخلاقی پہلو پر ۲۷ / رباعیاں ہیں۔ اس طرح مختلف موضوعات پر انہوں نے رباعیاں کہی ہیں۔ تمام رباعیوں میں ان کا انداز واسلوب نہایت موثر اور پُر قوت ہے۔ مذہب کے تعلق سے دو رباعیاں ملاحظہ فرمائیں۔

دنیا میں نوید حسنِ انجام ہے دیں　　اس غمکدے میں پیام آرام ہے دیں
دیں داروں کو لازم ہے بزرگوں کا ادب　　ان کی ہر بزرگ داشت کا نام ہے دیں

ہیں اہلِ صفا جو قید مذہب رکھتے　　عادات وخصائل ہیں مہذب رکھتے
ہوتے ہیں وہ حسنِ عملِ سے غافل　　ہر دم ہیں خیال فرضِ منصب رکھتے

ایک رباعی میں شہبازؔ کی حقیقت بیانی ملاحظہ فرمائیں۔

تن عیش کا گھر ہے اس کا اسباب ہے روح　　مینا ہے یہ اور بادۂ ناب ہے روح
یا چنگ مغنّی ازل میں شہباز　　یہ تن ہے رباب اس کی مضراب ہے روح

عبدالغفور شہبازؔ نے رباعیات کی روایت پر چلتے ہوئے اخلاق کے تعلق سے بھی اشعار کہے ہیں۔ چونکہ اخلاقیات کا اردو شعر وادب سے گہرا رشتہ رہا ہے مولانا حالؔی نے بھی اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''مقدمہ شعر وشاعری'' میں اس موضوع سے بحث کی ہے اور مختلف دلائل سے شاعری میں اخلاقی مضامین پیش کرنے کی وکالت کی ہے اگر چہ ہمارے بعض ناقدین کو شاعری میں اخلاقی مضامین کے پیش کش سے کامل اتفاق نہیں ہے تاہم اردو کے رباعی نگار شاعروں نے اخلاقی مضامین وموضوعات کو ہمیشہ اہمیت دی ہے۔ چنانچہ عبدالغفور شہباز نے بھی اخلاقیات کو اپنی رباعیوں کا موضوع بنایا ہے اور اعلیٰ اخلاقیات کا درس بھی سکھایا ہے۔ اس سلسلے کی ایک رباعی ملاحظہ فرمائیں۔

کچھ شئے نہیں اشرف خدائی ہونا　　یا رستم عقل آزمائی ہونا
ہوجاتا ہمارے دم سے ہر گھر میں فروغ　　لازم تھا ہمیں دیا سلائی ہونا

اس طرح کے خیالات وافکار کی ترسیل ان کی رباعیوں سے ہر جگہ ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں شہبازؔ کا مشاہدہ بہت ہی تیز اور باریک ہے۔ وہ سامنے کی چھوٹی سے چھوٹی چیزوں کو دیکھ کر بھی اخلاقی تعلیم کا

کوئی نہ کوئی گوشہ تلاش لیتے ہیں۔اس کے پسِ پشت ان کا مقصد دنیا کو صحیح اور اعلیٰ درجہ صفات کا حامل بنا دیتا ہے۔اسی لئے وہ ایسے ایسے گوشے تراشتے ہیں اور اس میں اخلاقی پہلو کی آمیزش کر کے متذکرہ گوشوں سے بہتر اخلاقی پہلو کو پیش کرتے ہیں اس سلسلے میں ایک اور رباعی ملاحظہ فرمائیں۔

وحشت ہے کہاں جو یہ کسی سے بھڑکیں	غصّہ ہے کہاں جو یہ کسی پر کڑکیں
بتلاتی ہیں ٹھیک ٹھیک منزل کا نشاں	ہیں جادۂ راستی پہ سیدھی سڑکیں

واضح ہے کہ عبدالغفور شہبازؔ اپنی رباعیوں میں موضوعات اور نفس موضوعات کی جزیات سے مکمل آگاہی رکھتے ہیں۔اس طرح وہ ہر ہر رباعی میں کوئی نہ کوئی عمدہ اخلاقی تعلیم کو بروئے کار لاتے ہیں۔ ان سب کا یہاں احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے اس لئے چند رباعیوں کو اپنے دعوے میں پیش کر رہا ہوں ملاحظہ فرمائیں۔

ہر بزم میں اخلاق کا گلدستہ ہو	ہر رزم میں مرہم دل خستہ ہو
گر صحنِ خیال کی صفائی ہے غرض	جھاڑو کی طرح ابھی کمر بستہ ہو
ہو ڈینگ نہ شیخی نہ تعلّی ہم میں	ہر طرح ہو اخلاق کی خوبی ہم میں
ہو کوہ کی طرح اپنی ہمت عالی	چشموں کی طرح ہو سیر چشمی ہم میں
گر چاہے کہ دل سے دور ہو جہل کا میل	گو شمع مطالعہ ہے تاریکی لیل
جنگل سے گزر، دشت میں پھر، کوہ کو پھاند	ہو علم کے قلزم کے لئے شوق کا سیل

مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ عبدالغفور شہبازؔ کی رباعیوں میں موضوعات کا تنوع ہے اور ان کا انداز جدت آمیز بھی ہے۔ان کی رباعیوں کا مجموعہ ''رباعیات شہبازؔ'' میں بے مثل اور لاجواب رباعیاں ہیں۔ان کی تمام رباعیاں فکر انگیز ہیں اور ہمیں دعوت فکر دیتی ہیں کہ ہم اپنے قول و فعل کا محاسبہ کریں اور زندگی میں اعلیٰ اقدار و معیار کی مثال پیش کریں تاکہ دنیا جنت نظیر بن جائے اور انسانی زندگی بلکہ زمین پر تمام ذی روح کی زندگی خوشگوار اور آسان ہو جائے مقالہ کی طوالت کا خوف پیش نظر ہے اس لئے آخر میں تہذیب و تمدن سے متعلق موصوف کی چند رباعیوں کو نقل کر کے اپنی بات کو سمیٹنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ملاحظہ فرمائیں۔

ایرانی فصاحت اور حجازی غیرت	یونانی بلاغت اور رومی حکمت
ترکانہ جلاوت اور چینی صنعت	جس قوم میں عام ہو، ہے قومی عزت
ہے یہ جو ہزار طاق کا قصد بلند	جس پر کہ ہے نہ رواق کا قصر بلند
آتی ہے ہر اک سنگ سے اس کے آواز	یارو یہ ہے اتفاق کا قصر بلند

تمام اصناف سخن کی طرح رباعی میں عبدالغفور شہبازؔ نے اپنی قادر الکلامی اور فنکارانہ صلاحیت کا اظہار کیا ہے۔ بیشتر شعرا اس میدان میں قدم نہیں رکھتے۔لیکن یہ موصوف کی قادر الکلامی اور شاعرانہ مشاقی کا بیّن ثبوت ہے کہ انہوں نے اس مشکل فن کو اپنی کہنہ مشق شعری صلاحیت سے اپنے قابو میں رکھ کر رباعی کی روایت کو آگے بڑھایا ہے اور اس فن میں اپنی انفرادی پہچان بھی بنائی ہے اور اپنا نام بحیثیت رباعی نگار شاعروں میں درج کرا کر وقار و احترام بھی پایا ہے جسے پوری اردو دنیا ہمیشہ یاد رکھے گی۔اور جب بھی رباعی کی روایت لکھی جائے گی تو موصوف کا نام نہایت قدر و احترام کے ساتھ لیا جائے گا۔اور ان کی فقید المثال اور گراں مایہ خدمات کا بخلوص اعتراف بھی کیا جائے گا۔اور انہیں بحیثیت رباعی نگار ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ آنے والی نسلیں بھی ان سے تحریک حاصل کریں گی۔

Dr. Md. Nesar Alam
+2 Teacher
Tilak Maidan Road
Muzaffarpur - 842 001

قلم کار حضرات سے گذارش

سہ ماہی ''**ساغرِ ادب**'' اُردو کا ایک تحقیقی و ریفرڈ مجلّہ ہے۔براہِ کرم تخلیقات بھیجتے وقت اس کے معیار اور مزاج کا خاص خیال رکھیں۔

نوٹ : ادباء وشعراء سے مؤدبانہ گذارش ہے کہ اپنی تخلیقات اِن پیج اُردو (Inpage Urdu) سافٹ ویئر میں کمپوز شدہ مسودے کا پروف پوری توجہ سے دیکھ لیں تاکہ غلطی کا امکان نہ ہو اور درج ذیل ای۔میل۔آئی ڈی پر بھیجنے کی زحمت گوارہ کریں۔ساتھ ہی تخلیقات کی پرنٹ کاپی بھی ڈاک سے مُدیر کے پتہ پر ارسال کر دیں۔

Website : saghareAdab.in

Email-syedalayzafar@gmail.com

saghareadab@gmai.com

مضمون کی ابتداء میں نام اردو میں اور آخر میں نام و پتہ انگیریزی میں مع پن کوڈ وموبائل نمبر ضرور تحریر کریں۔

قلم کاروں سے درخواست ہے کہ وہ غیر مطبوعہ مضامین ہی اشاعت کے لئے بھیجیں۔

زیادہ طویل مضمون ہونے کی صورت میں حسبِ ضرورت ایڈٹ کر کے شائع کیا جائے گا۔اس امر میں مدیر اپنے حقِ ادارت کا استعمال کرے گا۔

ایڈیٹر

ISSN. 2582 - 3612

ڈاکٹر مرزا صبا عالم بیگ

فیضؔ : ایک عالمی آواز

فیض جدید اُردو شاعری کا سب سے معتبر و مستند اور محبوب و مقبول نام ہے۔ جس کی شاعری نے پوری ادبی دنیا میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ فیضؔ، اقبالؔ کے بعد اردو کا سب سے اہم اور بڑا نام بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ بھی ایک حُسن اتفاق ہے کہ دونوں عظیم شعراء کا تعلق سیالکوٹ سے ہے۔ مگر یہاں اس کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اقبالؔ غلام ہندوستان میں پیدا ہوئے اور غلام ہندوستان ہی میں سپردِ خاک ہوئے۔ فیضؔ غلام ہندوستان میں پیدا تو ضرور ہوئے مگر ملک کی آزادی کو لہولہان اور خون سے لبریز دیکھا۔ تقسیم ہند نے فیضؔ کے ضمیر وذہن کو جھنجھوڑ دیا ''یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر'' فیضؔ کی آواز ایک عالمی آواز بن کر دنیا کے سامنے آتی ہے۔ جیل کی سلاخوں نے بھی فیضؔ کے عزم وحوصلوں کو پست نہیں ہونے دیا۔ ظلم وزیادتی اور ناانصافی کے خلاف ایک صدائے احتجاج بن کر فیضؔ کی شاعری نے نہ صرف اردو بلکہ عالمی ادب کو بھی اپنی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کردیا۔ فلسطین پر ہونے والے جبر وظلم ہوں یا پھر بیروت اور کوئی اور جگہ فیض خاموش نہیں رہتے۔ ع

''بول کہ لب آزاد ہیں تیرے''

فیضؔ کی پوری شاعری ادبی عبادت سے عبارت ہے۔ فیضؔ کی شخصیت وسیرت اور شاعری کے حوالے سے اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اردو نثر کی آبرو ''مشتاق احمد یوسفی اپنی پانچویں اور آخری کتاب ''شامِ شعریاراں'' کے مضمون میں ''ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے۔'' کے صفحہ ۵۸ پر لکھتے ہیں :

''فیض صاحب کی طبیعت میں صبر وتحمل، قوتِ برداشت اور بردباری کوٹ کوٹ کر بھری تھی بلکہ بلحاظ اقدار ایسا لگتا تھا کہ کوٹ کوٹ نہیں سالم بھر دی ہے۔ بعض باتیں ایسی ہیں جو فیضؔ صاحب کے مزاج اور مسلک کے خلاف تھیں۔ مثلاً انہیں روپے کا ذکر کرتے نہیں سنا۔ اپنی کسی ضرورت کا ذکر کرتے نہیں سنا۔ زمانے کی شکایت یا اپنے سیاسی مسلک کے بارے میں بھی گفتگو کرتے ہوئے نہیں سنا۔ کسی کی غیبت اور برائی نہیں سُن سکتے تھے۔''

فیض احمد فیضؔ کی شاعری جہاں فکری سطح پر رومان اور انقلاب دونوں ہیولیٰ رکھتی ہے وہیں اظہار بیان

کی سطح پر روایت اور جدت کے دلکش امتزاجی وصف خاص فیضؔ کی شاعری کے اسلوب وآہنگ کی انفرادیت سامنے لاتا ہے اور فیضؔ کی غیر معمولی مقبولیت کا بنیادی سبب قرار پاتا ہے۔ یعنی رومان وانقلاب اور روایت وجدت کے درمیان امتزاج کی جو ہنرمندی فیضؔ کے یہاں ہے، وہ امتیازی شان کی حامل ہے یہ وہ امور ہیں جن کے سبب فیضؔ کی شہرت ومقبولیت آج بھی قائم ہے ڈاکٹر سیّد اعجاز حسین فیضؔ کی شہرت کے بارے میں لکھتے ہیں :

''پنجاب کیا پوری اردو شاعری میں کلام کی اتنی قلیل ضخامت پر کسی نے اتنا نام نہیں پیدا کیا جتنا فیض احمد فیضؔ نے۔''

فیض کی شاعری کے ضمن میں پروفیسر رشید احمد صدیقی رقمطراز ہیں :

''.................جب تک کوئی شاعر اپنا ہوتے ہوئے سب کا شاعر نہ ہوگا، بڑا یا اچھا شاعر نہ کہلائے گا............''

یہاں سب کا شاعر ہونے سے مراد یقیناً ایسے شاعر سے ہے جن کے اشعار میں سب کے یعنی اجتماعی وارداتِ قلب کے آئینہ دار ہوں۔ یہی بات فیضؔ کی شاعری میں پائی جاتی ہے۔ یعنی سب کو اپنا بنانے یعنی اجتماعیت کو فیضؔ اپنا نصب العین مانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فیضؔ عموماً ''میں'' کے بجائے ''ہم'' کا استعمال کرتے ہیں۔ ودستِ تہہ سنگ، میں فیضؔ از فیضؔ کے تحت وہ لکھتے ہیں :

''...........مجھے اپنے بارے میں قیل وقال بُری لگتی ہے بلکہ میں تو شعر میں بھی حتیٰ الامکان واحد متکلم کا صیغہ استعمال نہیں کرتا اور ''میں'' کے بجائے ہمیشہ سے ''ہم'' لکھتا ہوں۔''

اسی تحریر میں آگے چل کر فیضؔ اپنی ذاتی واجتماعیت سے وابستگی کی اہمیت یوں ظاہر کرتے ہیں :

''اس دبستان میں سے پہلا سبق جو ہم نے سیکھا تھا کہ اپنی ذات باقی دنیا سے الگ کر کے سوچنا اور تو ممکن ہی نہیں، اس لئے کہ اس میں بہر حال گرد وپیش کے سبھی تجربات شامل ہیں اور اگر ایسا ممکن ہو بھی تو انتہائی غیر سودمند فعل ہے کہ ایک انسان فرد کی ذات اپنی سب محبتوں اور کدورتوں، مسرتوں اور رنجشوں کے باوجود بہت ہی چھوٹی بہت ہی محدود اور حقیر شئے ہے۔''

اسی بات کو بہت واضح انداز میں فیضؔ نے ''دستِ صبا'' کے ابتدائیہ میں یوں لکھا ہے :

''مجھے کہنا صرف یہ تھا کہ حسیات انسان کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسب توفیق شرکت، زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے۔''

فیضؔ کے ساتھ اردو شاعری کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ حکومت وقت کے تمام ظلم وزیادتی، حق تلفی و ناانصافی اور مصائب وآلام کو فیضؔ نے بخوبی قبول کیا مگر اپنے ضمیر کا سودا اور جابر حکمران سے کوئی سمجھوتہ کرنا گوارہ نہ کیا۔ جیل کی خوفناک راتوں اور تمام سازشوں اور بندشوں کے باوجود بھی فیضؔ کا قلم خاموش نہیں رہا۔ اپنی انگلیوں کو خونِ دل میں ڈبو کر فیضؔ نے عوام کے درد و داغ کو اپنی شاعری کا نہایت خوبصورت و دلکش جامہ پہنایا۔ فیضؔ عہد حاضر کا ایک عظیم اور بڑا شاعر ہے۔ نئی تکنک، نیا لب ولہجہ اور موضوع ومعیار کے اعتبار سے فیضؔ کی آواز اپنے تمام ہم عصروں میں سب سے مخصوص ومنفرد اور مستند ومعتبر ہے۔ فیضؔ کی شاعری میں آفاقیت اور عالمگیریت کا رنگ ورامش ہم آسانی سے تلاش کر سکتے ہیں۔ فیضؔ کا کمال یہ ہے کہ دنیا کے عظیم شاعروں کی طرح انہوں نے اپنی ایک الگ راہ نکالی اور راستے بھی نئے ہموار کیے۔ فیضؔ کی پوری شاعری انسان دوستی اور بنی نوع انسان کی محبت سے عبارت ہے۔ فیضؔ کی شاعری ہماری ادبی تاریخ کا نہایت ہی قیمتی سرمایہ ہے اور آنے والی نسلوں کے لئے مشعلِ راہ بھی۔ فیضؔ کی نثر اور ان کے خطوط بھی ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی پوری شاعری کو سمجھنے اور ان کی گہرائی میں جانے کے لئے یہ نہایت معاون ثابت رہے ہیں۔ فیضؔ کی عالمی مقبولیت وشہرت کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ فیضؔ انسانی نفسیات کے کرب و اضطراب کو نہایت ہی شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ ایک ذمہ دار اور زندہ شاعر ہونے کا ثبوت ہر منزل ومقام پر دیتے ہیں۔ مصلحت پسندی فیضؔ کا مزاج نہیں۔ وہ آخری دم تک عوام کے دکھ درد، ان کے مسائل ومعاملات اور ان کے خلاف ہونے والے تمام سیاست وسازش کو بے نقاب کرتے رہے۔ فیضؔ کی شاعری دل و دماغ اور دھڑکنوں پر حکمرانی کرتی ہے۔ فیضؔ کو یاد کرنا گویا ادبی عبادت سے موسوم ہے۔ بقول میرؔ ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں   تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

Dr. Mirza Saba Alam Baig
C/o Mirza Noorain Baig
Dal Colony, Mohalla - Shahsupan
P.o. - Lal Bagh
Darbhanga - 846 004

ڈاکٹر مہ جبیں خاتون

علامہ اقبالؔ کے نعتیہ اشعار کی معنویت

علامہ اقبال اپنی نظموں اور غزلوں کے لئے خصوصی طور پر جانے جاتے ہیں، لیکن انہوں نے نعتیہ اشعار بھی کہے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ تخلیق، تسوید اور تقدیر وہدایت سب اللہ کی جانب سے ہے، لیکن ایمان کی روشنی کے لئے اور عالم انسانیت کی بہبودی کے لئے آخری پیغمبر رسول اکرمؐ کے افکار واعمال امکانی وسعتوں کی قوت ہیں، اسی لئے انہیں محبوب خدا کہا گیا ہے۔ غلاموں، بے سہاروں، بے کسوں اور آفت نصیبوں کے لئے وہ نوید جانفزا تھے۔ کائنات کے لئے رحمت اور نوازشات کا سرچشمہ تھے، انہوں نے اتحاد واتفاق کی ہدایت فرمائی تھی عورتوں کے حقوق کی یاددہانی کرائی تھی اور تاریخ اور علم کے میزان کو عام کیا تھا۔ آپ کی روشنی سے قوم کی تاریکی دور ہوتی تھی اور محروموں اور مایوسیوں کو اُمید کا نور مل جاتا تھا، حضورؐ کی ایسی خوبیوں کو علامہ اقبالؔ نے بھی بیان کیا ہے۔

اقبالؔ کے نعتیہ اشعار میں جہاں فکر کی بلندی ہے اور موضوعات میں تنوع کے ساتھ گہری معنویت کا جذبہ کارفرما ہے وہیں فرد اور عہد کے المیے کو بیان کرنے کا کمال فن بھی ہے۔ انہوں نے انسانی اقدار کی شکست وریخت اور تصادم کا گہرا احساس دلایا ہے، اور کائنات میں پھیلے انتشار کو بہ نظر غائر دیکھا ہے۔ اس لئے صداقت کے رمز کو قرآن کی روشنی میں جانچا پرکھا ہے اور اشعار کا جامہ پہنایا ہے۔ ساتھ ہی رمز، ایما، اشارہ اور کنایہ سے کام لے کر مجموعی طور پر اخلاقی قدروں کو عملی اور نظری موضوع قرار دیا ہے۔ ذات وصفات کو ایمان کی آنکھ سے دیکھتے ہوئے انہوں نے حضور کی حکمت وقدرت کو پیش نگاہ رکھا ہے۔ اور نئی جہات حیات سے آشنا کرایا ہے، جس میں عشق، عقیدت، اطاعت، تسلیم اور معنیاتی حسن سبھی کچھ ہیں۔ ایمان وایقان کے حقیقی تصور کو اقبالؔ نے نعت کی لفظیات سے معطر کیا ہے، احادیث کو پیش نظر رکھ کر ثنا خوانی کی ہے اور بندے کے احساسات کی دہکتی آگ کے لئے نور ونکہت بھری دعاء کی ہے۔ ان کے یہاں صرف عقیدت نہیں ہے بلکہ وجود پذیر مقصدیت ہے۔ اور محاسبہ کے ذریعہ روحِ عصر کا تعین ہے۔ نازک اور محتاط رخ اختیار کر کے بے سمتی کے شکار لوگوں کو حقائق سے روبرو ہونے کی ترغیب دلائی ہے۔ کیونکہ آپؐ ہی منبع انسانیت اور مبداء حیات ہیں۔ آپ کو ''نور'' اور ''سراج منیرا'' قرآن حکیم میں کہا گیا ہے۔ اور رحمۃ اللعلمین

کے وصف سے یاد کیا گیا ہے۔اسی لئے اقبالؔ نے فہم قرآنی کے وسیلے سے اس طرح کا نعتیہ شعر کہا ہے۔

خیمہ افلاک کا ایستادہ اسی نام سے ہے
نبض ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

اقبالؔ نے اپنے زمانے کے انتشار کو دیکھتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

کرم اے شہہ عرب و عجم کہ کھڑے منتظر کرم
وہ گدا کہ جن کو عطا کیا ہے دماغ تو نے سکندری

اس تاثیری فکر میں سچائی کی تہذیب ہے کیونکہ حضور اکرمؐ مینارۂ نور ہیں۔اقبالؔ کہتے ہیں۔

وہ دانائے سبل ختم الرسل ، مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادیِ سینا

اقبالؔ جذب وکیف سے کام لے کر راہ نجات کے روشن پہلو تلاش کرتے ہیں اور عشق کے ہفت خواں طے کرتے ہیں۔

عشق دم جبرئیل ، عشق دل مصطفےٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

اسی عشق سے اسرار خودی اور رموز بے خودی کا وسیلہ اقبالؔ بناتے ہیں تا کہ بصیرت اور استقامت عطا ہو اور تکریم آدمیت سامنے آئے۔

یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاش مصطفیٰ است

یعنی تہذیب انسانی کی ساری حقیقی ارتقائی منزلیں یا تو نور مصطفوی کی روشنی میں طے ہوئی ہیں یا بھٹکی ہوئی انسانیت اس نور کی تلاش میں ہے، اقبالؔ کی فکر کا ہر زاویہ اور شعور کا ہر گوشۂ اسی جذبہ عشق سے معمور ہے، وہ حضورؐ سے اس طرح بھی مخاطب ہوتے ہیں۔

حضورؐ دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزار غنچہ و گل ہیں ریاض ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی

رسولؐ کی عظمت کو اقبالؔ نے اس طرح بھی بیان کیا ہے تا کہ کثیر المعنویت کا تناظر نگاہ میں رہے۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط ہیں حباب
عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّہ ریگ گو دیا تو نے طلوع آفتاب

پوری اُمت کے لئے خود آ گاہی کے شعور کی بیداری، امانت، حفاظت، اعتماد اور حقوق کے چراغ روشن کرنے کے لئے اقبالؔ نے یہ بھی کہا تھا۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اقبالؔ کی شاعری کی کئی جہتیں ہیں جن میں نعتیہ اور تقدیسی جہت بھی روشن اور تابندہ ہے۔اس میں فکر و شعور کے ساتھ عشق رسول پاک سے سرشاری ملتی ہے اور جذبات کی دانائی کے عنصر نمایاں ہیں۔

Dr. Mahjabeen Khatoon
D/o. Abdul Qaiyum Ansari
Vill. - Momin Tola (West Azimganj)
At.-Haveli Kharagpur - 811 213
Munger (Bihar)

ڈاکٹر اصغری بیگم

افتخار راغبؔ کی غزل گوئی

زمانہ قدیم سے صنف غزل ہر خاص و عام میں مقبول رہی ہے۔ غزل امیر خسروؔ، ولیؔ، میر تقی میرؔ، مومنؔ، غالبؔ، اقبالؔ، شادؔ، فراقؔ، ندا فاضلی، سلطان اختر، منور راناؔ، وغیرہ شعراء کی مزاج داں بنی اور رنگ و آہنگ بدلتی رہی ہے اسے ہر دور میں سر بلند اور سرخرو ہونے کا شرف حاصل ہوتا رہا ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے تنوع اور رنگارنگی غزل کا خاصا رہا ہے۔ کبھی کلیم الدین احمد جیسے ناقدوں نے اسے نیم وحشی صنف کہا تو رشید احمد جیسے لوگوں نے اسے اردو شاعری کی آبرو قرار دیا۔ غزل تمام تاریخی شیرینی اور تلخیاں اپنے دامن میں سمیٹتی ہوئی۔ آج بھی جس قدر اپنی ضوفشانیاں بکھیر رہی ہے اس سے کوئی بھی ادب شناس ناواقف نہیں ہے۔ بلکہ یہ کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ دیگر اصناف شاعری کی مناسبت میں غزل آج بھی سرِ فہرست ہے۔ اسی روایت کی آبیاری میں نوّے کی دہائیوں میں ابھرنے والا ایک نام افتخار راغب کا بھی ہے۔ افتخار راغبؔ کے اب تب پانچ مجموعاتِ غزل منظر عام پر آچکے ہیں۔ پہلا مجموعہ غزل ''لفظوں میں احساس'' ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا۔ اسکی دوسری اشاعت ۲۰۱۱ء میں ہوئی۔ اس مجموعہ کی اشاعت ہندی زبان میں بھی ۲۰۰۶ء میں ہوئی۔ ان کا دوسرا مجموعہ ''خیال چہرہ'' ۲۰۰۷ء، میں اشاعت کے مرحلے طے کر پایا۔ تیسرا مجموعہ ''غزل درخت'' ۲۰۱۴ء میں ادبی دنیا میں روشناس ہوا، چوتھا مجموعہ غزل ''یعنی تو'' ۲۰۱۷ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ اور پانچواں مجموعہ غزلیات ''کچھ اور'' کے نام سے قارئین سے ۲۰۱۹ء میں متعارف ہوا۔

افتخار راغبؔ بنیادی طور پر غزل گو شاعر کی حیثیت سے برصغیر میں روشناس ہوئے ہیں۔ ان کی غزل گوئی روایت اور جدیدیت کا ایک حسین امتزاج ہے۔ ان کی پیدائش بہار کے ضلع گوپال گنج میں ۳۱/مارچ ۱۹۷۳ء میں ہوئی۔ انہوں نے شعر گوئی کی ابتدا اسکول کے ہی زمانے میں شروع کر دی تھی۔ شاعری میں ان کے استاد مزؔ عظیم آبادی کا نام لیا جاتا ہے۔ قیام دہلی کے دوران انہوں نے اپنے کلام کی اصلاح استاد ڈاکٹر آفاق احمد صدیقی سے کرائی۔ جب تلاش معاش کے سلسلے میں ان کا گذر قطر ہوا تو وہاں وہ ۱۹۹۹ء کے سالانہ طرحی نعتیہ مشاعرے میں شریک ہوئے۔ اب یہاں ان کے روابط مختلف خطہ ارض سے آئے شاعروں اور ادیبوں سے قائم ہوئے۔ ان کے شوق ادب کے سلسلے میں ظفر کمالی کے چند جملے ملاحظہ فرمائیں :

''انہیں ادبی مجلس آرائی کا بہت شوق ہے۔ وہ فیس بک پر بھی مسلسل اپنی

غزلیں پوسٹ کرتے رہتے ہیں اور واٹس ایپ کی دنیا میں بھی بہت معروف ہیں۔ چھوٹی بڑی محفلوں اور مشاعروں میں کلام سُنانا انہیں نہایت مرغوب ہے۔ موقع محل ہو تو وہ زیادہ سے زیادہ اشعار سنانے سے نہیں چوکتے۔''

(کچھ اور : ظفر کمالی ،ص ۱۹)

افتخار راغبؔ قطر میں انجینئر کے عہدے پر سرفراز ہیں اس کے ساتھ شاعری کے شوق کو پروان چڑھانے میں بھی لگے ہیں ''بزم اردو قطر'' کے وہ ۲۰۱۰ء سے تا حال جنرل سکریٹری ہیں اور وہاں کی تمام ادبی سرگرمیوں میں روح رواں کی حیثیت سے ادبی محفلوں کی رونق بڑھاتے رہے ہیں۔

افتخار راغبؔ کی غزل گوئی موضوعات کے اعتبار سے بھی تنوع رکھتی ہے۔ فکری اعتبار سے ان کی غزل گوئی میں جدیدیت کا رنگ نمایاں ہے۔ اسلوب کے اعتبار سے ان کا انداز کلاسیکل ہے۔ ان کی غزل گوئی کے سلسلے میں کلیم عاجزؔ کے چند جملے ملاحظہ فرمائیں :

''تو میں افتخار راغبؔ صاحب کا کلام سن کر چونکا کہ اس عہد میں یہ آواز، یہ لہجہ اور یہ تیور اور یہ کلاسیکل اسلوب اس نوجوان کے ذوق شعر میں کیسے داخل ہو گیا؟ اکیسویں صدی کے نقارہ خانے میں یہ طوطی کی آواز کیسے سما گئی؟ یہ ہمّت اسے کیسے ہوئی کون سا اعتماد اُسے اُس دور میں سہارے دے رہا ہے۔ میں سمجھا کہ یہ سہارا خارجی نہیں داخلی ہے۔ یہ اعتماد اس کی روح میں مسند نشیں ہے کہ اردو کا اصلی لہجہ اور تیور ہے۔ یہی دوامی ہے۔ یہی جاودانی ہے۔ چالو لہجہ کرتب ہے پینترہ ہے وقتی ہے اور ہنگامی ہے۔ مگر یہ لہجہ اور تیور بہت مشکل ہے اس کے لئے کلاسیکل دور کے مطالعوں میں ڈوبنا پڑتا ہے اور ڈوب کر نکلنا پڑتا ہے۔ ڈوبنا کون چاہتا ہے سطح پر تیرنا سب چاہتے ہیں۔ لیکن تیرنے سے گوہر کہاں ملتا ہے۔''

(غزل درخت : کلیم عاجز ص ۱۲۔۱۳)

افتخار راغبؔ ایک فطری شاعر ہیں۔ ان کی غزل گوئی میں ان کا اپنا کرب و سوز اور اس سے سینہ سپر کرنے کا حوصلہ بھی موجود ہے۔ ان کی فکر رجائی ہے وہ نا مساعد حالات کو مساعد ہونے تک اپنی ہمت اور کاوش کو مسلسل جدوجہد کرنے کو مجبور کرتے رہتے ہیں۔ ان کی داخلی قوت ہمیشہ انہیں ثابت قدم رکھتی ہے وہ پرانی روش پر چل کر نئی منزل کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ نہایت حساس انسان ہیں آنکھیں کھلی رکھتے ہیں۔ زمانے میں ہو رہے تغیرات کا انہیں بہ نظر غائر مشاہدہ ہے۔ اچھائی اور برائی میں واضح امتیاز رکھتے ہیں۔ انہیں مصلحت پسندی بھی بہت پسند ہے۔ زمانے کے تمام معاملات و

ISSN. 2582 - 3612

مسائل میں مصلحت کو دخیل رکھتے ہیں۔فکری اور فنی دونوں اعتبار سے ان کے کلام لائق تحسین ہیں۔صنائع بدائع کی بیشتر صنعتوں کا ان کے یہاں استعمال بہ حسن وخوبی ہوا ہے۔زبان و بیان میں اسلوب سادہ، سلیس ،عام فہم رکھتے ہیں روزمرّ ہ میں استعمال ہونے والے محاورات بھی اشعار میں برمحل پیوست ہوجاتے ہیں۔ ان کی شخصیت کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ انسانی فطرت کو بہ آسانی پڑھ لیتے ہیں۔ وہ ایک بہترین نباض بھی ہیں۔ان کا مزاج غزل کے عین مطابق وموافق ہے۔ان کے یہاں عشق ومحبت کے جذبات واحساسات بھی ایک مختلف انداز میں پائے جاتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے درپیش مسائل بھی ان کے کلام میں جگہ پالیتے ہیں۔اس سلسلے میں پروفیسر احمد سجاد کے چند جملے ملاحظہ فرمائیں :

''فطرت میں جو سادگی و بے ریائی کے ساتھ حسن آفرینی ہوتی ہے۔ وہی خصوصیات ایک فطری شاعر کے یہاں پائی جاتی ہے۔افتخار راغبؔ کی خوش نصیبی کہ وہ ان خوبیوں سے متصف ہیں۔کبھی کبھی تو یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ان کی پوری شاعری سہل ممتنع کی شاعری ہے۔صاف سادہ، سلیس وفصیح مگر معنیٰ خیز اور فکر انگیز۔ ہوا اور پانی کس قدر سہل الحصول ہیں مگر انہیں اپنی مٹھی میں قابو کرنا ناممکن ہوتا ہے۔یہی حال راغبؔ کی شاعری کا ہے۔کہ ہر شعر دل کو چھو لیتا ہے۔مگر اس کی چوپہل کیفیات کو قابو میں کرنا مشکل ہے۔''

(غزل درخت ؛ پروفیسر سجاد ص ۱۷)

مندرجہ بالا مباحث اور حوالوں سے واضح ہے کہ افتخار راغبؔ کی غزل گوئی رفتہ رفتہ شہرت ومقبولیت اور اعتبار ووقار حاصل کرتی جارہی ہے۔امید قوی ہے اسی طرح وہ اپنے فن کی آبیاری کرتے رہے تو یقیناً اردو ادب میں خصوصاً غزل گوئی میں وہ ایک رتبہ ومقام حاصل کرلیں گے۔اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی غزلوں سے چند منتخب اشعار پیش کردئے جائیں تا کہ تمام خصوصیات غزل بروئے کار آجائیں اور دعوے کو دلیل اور ثبوت بھی میسر آجائے۔

جڑ گیا شیشہ بھروسے کا مگر — رہ گئے ہیں بال کچھ باریک سے

بے سبب راغبؔ تڑپ اٹھتا ہے دل — دل کو سمجھا نا پڑے گا ٹھیک سے
کہا کہ آیئے بس جایئے مرے دل میں — وہ بولے آپ کے دل کا مکان ایسا ہے؟

کہا کہ پھولوں لوں میں کیا خوب دل ربائی ہے — وہ بولے کیوں نہ ہو جب باغبان ایسا ہے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

میں اپنے بدن میں بے ٹھکانہ — مل جائے مجھے پناہ کوئی

میں سب کی بھلائی چاہتا ہوں — ہے میرا بھی خیر خواہ کوئی

زندگی کا عظیم مقصد ہے — یہ کسی گلستاں کی سیر نہیں

ساری کرنیں وہی لپیٹے گا — جس نے بخشی حیات سورج کو

مرکوز توجہ ہے فقط کام پہ راغبؔ — انعام سے واقف نہ میں اکرام سے واقف

حال کیا ہو گیا ساعت کا — میری باتیں تھیں سنگ یا کچھ اور

دل میں ہے آس، آرزو، وحشت — بے قراری امنگ یا کچھ اور

اور کر لوں میں نرم دل اپنا — سیکھ لو تم ستم گری کچھ اور

دیر لگتی ہے جس کو جلنے میں — آگ وہ دیر تک دہکتی ہے

جلنے والوں سے کوئی کیا پوچھے — کیوں انہیں روشنی کھٹکتی ہے

افتخار راغبؔ کے کلام سے واضح ہے وہ شعر کہنے کے مراحل میں لفظوں کے انتخاب میں نہایت احتیاط اور التزام کو مرکوز رکھتے ہیں۔مضمون کی ادائیگی میں جزیات پر ان کی گہری نظر ہوتی ہے۔وہ کلام میں سلاست وروانی کا بطور خاص خیال رکھتے ہیں۔ان کی فکر اجتہادی پہلو کی تلاش میں ہمیشہ سعی کرتی رہتی ہے۔ان کے کلام میں ذاتی کرب بھی جگہ جگہ نمایاں ہوتا ہے۔فکر وفن میں بلندی وپختگی دونوں ہے۔

افتخار راغبؔ کی شعری کائنات میں بے شمار موتی بکھرے پڑے ہیں۔وہ ایک ہمدرد انسان کا دل رکھتے ہیں۔جس میں اچھائی کی طرف راغب ہونے کا مستحکم ارادہ نظر آتا ہے اور برائی سے بچنے کی تلقین بھی ہے۔انہیں دینی احکام کا پاس بھی ہے اور دنیاوی ضرورتوں کی اہمیت کا بھی اندازہ ہے۔وہ عصر حاضر کی تقاضوں سے بھی واقفیت

ISSN. 2582 - 3612

رکھتے ہیں۔ وہ درپیش مسائل اور ان سے نکلنے کا شعور بھی رکھتے ہیں۔ ان کی نظر ملک نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر ہو رہے واقعات و حادثات پر بھی ہے۔ اس لئے ان کی شاعری کا کینوس پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ انسانی زندگی کن کن مصائب و آلام سے دوچار ہے۔ اور اس سے ذرائع ابلاغ کے مثبت اور منفی رویوں کا بھی عرفان رکھتے ہیں۔

افتخار راغب کی غزل گوئی اسلوب بیان کے اعتبار سے بھی نہایت سہل و آسان ہے۔ ان کے کلام میں شکست و ریخت کا کہیں بھی شائبہ نظر نہیں آتا ہے۔ وہ اپنے کلام میں فلسفہ بیان نہیں کرتے ہیں۔ ان کے اشعار کی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی خاص و عام کے ذہن پر گراں بار نہیں ہوتے ہیں۔ ان کی غزلوں کے اشعار فکر لطیف اور تغزلیت کے زیور سے آراستہ نظر آتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

مٹی کے ہیں مٹّی میں مل جائیں گے / رہ جائے گا چاندی سونا، سمجھے نا

جھوٹے کا انجام بُرا ہے سچ بولو / سچائی کا سر اونچا ہے سچ بولو

اللہ دیتا ہے عزت بھی ذلت بھی / جھوٹی شان میں کیا رکھا ہے سچ بولو

پر دیس میں رہ کر کوئی کیا پاؤں جمائے / گملے میں لگے پھول کی قسمت ہی الگ ہے

دل میں بیٹھے ہوں وہ کہ دلّی میں / مشغلہ اہلِ ظلم کا ہے ظلم

یہ ننھے پودے ہی کل ہوں گے سایہ دار درخت / ملا جو ٹھیک سے موقع انہیں پنپنے کا

جب ثمر بار تھی میری شاخیں / مستقل مجھ پہ سنگ باری تھی

مجموعی طور پر میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ افتخار راغبؔ غزل گوئی کے منظر نامے پر ابھرتا ہوا ایک نام ہے جن کی غزل گوئی جملہ خصوصیات کی حامل ہے ان کی غزلیں بہترین فکری اور فنی صلاحیتوں کی مظہر ہیں اور ادب میں احترام و وقار کی مستحق ہیں۔

Dr. Asgari Begum
W/o. Md. Imteyaz Alam
Near. Urdu College
Gopalganj - 841428

ڈاکٹر محمد عثمان انصاری

رشید احمد صدیقی کی تمدنی تنقید میں رعایت لفظی کا عروج

پروفیسر رشید احمد صدیقی طنز و ظرافت کے آئینہ ساز ہیں۔ ان کی طرز تحریر میں بلا کا جادو نہاں ہے جب کہ طنز کے نظریہ کو بلاغت بخشی ہے۔ جو بیحد پر تکلف ہے۔ اور بجا تکلم ہے۔ جذبات کی پیچیدگیوں میں مختلف نظریے پیش کیے گئے ہیں۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کی رعایت لفظی کا نقطہ عروج و کمال ایک مبہم نوع پر مقدم ہے۔ رعایت لفظی کے تقدس کو والہانہ طور پر نہیں لینا چاہیئے بلکہ ان کی رعایت لفظی کے نقطہ افہام کو اس قدر تجزیہ کرنا چاہیئے کہ طنز و مزاح کے آئینہ میں اگر ہم دیکھیں تو یہ اندازہ ملے کہ انسان جذبات سے کس قدر کھیلتا ہے۔ حالانکہ ادب میں طنز و مزاح کا رواج بہت پہلے سے رائج ہے لیکن پروفیسر رشید احمد صدیقی کی کتاب ''گنج ہائے گراں مایہ'' اور ''مضحکات و طنزیات'' شائع ہوا تو طنز کے صنف پر ایک خاص نظریہ کا وجود دیکھنے میں آیا۔ طنزیات کے چند پہلو میں سماجی بندھنوں میں اور معیشت کی کار بندوں میں اور تمدن کے اصولوں میں سرایت کر گئی تھی جبکہ تمدنی تنقید کی باتیں قابل ادب ٹھہرائی گئیں تھیں۔ یوں تو ادب میں تمدنی تنقید کا عملی رواج اس کی ریاعت لفظی کی مناسبت سے کی گئی ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے تمدنی تنقید کے ذریعہ ادب کے ہر گوشے پر نظر ڈالی ہے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کا مزاج اصلاح پسند تھا۔ اور ادبی رجحان و میلان نے ایک وصف سے متصف کر رکھا تھا یوں تو ادب کے مختلف گوشوں میں ہم اس کے پس منظر سے استنباط اخذ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ تمدنی تنقید کے زاویہ ثلاثہ کے انکشاف میں مدد ملتی ہے۔ ادب کے چند پہلو ہیں جن کا اپنا نظریہ مختص ہے۔ البتہ اس کے جز و کل سے ہم اس کو مراد نہیں لے سکتے بلکہ ہمارا مزاج ادب کے رجحان سے ہی ملتا ہے۔ ادب کی نگارش نے کئی وجوہات کی تقدیم و تاخیر کی ہے جس سے ہم اس کی منزل تلاش سکتے ہیں۔ جہاں تک کہ ہماری نظر جاتی ہے اس سے اس کے حسن اور قبح کا انداز ملتا ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے رعایت لفظی میں عروج و کمال کے پس منظر میں جو جزیات قائم کی ہیں اس کا تجزیہ کرنا ہر ادیب کا کام ہے اس لئے کہ تمدنی تنقید کی ضرورت پڑتی ہے جس سے تمدن و معاشرت کا اندازہ لگایا جا سکے۔ جو جذبات حالات کے اعتبار سے موقع پر وارد ہوتے ہیں اس کا پس منظر بھی بہتر ہوتے ہیں جب کہ ہم اس کی تلاش اور جستجو کرتے ہیں تو معاشرتی زندگی پر اور اس کی طرز معاشرت پہ کافی اثر

ہوتی ہے۔ مضامین رشید میں مختلف نظریے پیش کیئے گئے ہیں اور ہر مضمون کا اپنا لائحہ عمل ہوتا ہے اور اس کے نقطہ افہام سے بہت زیادہ علمی کفالت کر سکتے ہیں۔ یوں تو جذبات کے پیش رو میں مقصد کا حاصل کرنا ایک مشکل امر ہے جبکہ اس کی جزئیات کی تمہید میں بہت سارے نکتے نکل آتے ہیں جس کے ہم خواہش مند ہوتے ہیں جو ہمارے نظریے کی تائید کرتے ہیں۔ جذبات اگر پژمردہ ہو تو اس کا اثر اس کے خیال پر ہوتا ہے۔ جبکہ جذبات میں حوصلہ نہ ہو تو اسکے رموز و نکات مبہم خیالات کی ترجمانی کرتی ہیں۔

''کلیات رشید احمد صدیقی'' کی ترتیب پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کیا ہے۔ ان کی انتھک کوشش سے کلیات کی کئی جلدیں مرتب ہوئی ہیں جس سے پروفیسر رشید احمد صدیقی کی شخصیت ادب میں ظاہر ہوتی ہے حالانکہ ادب کا میدان طنز و مزاح پر تھا۔ ان کی طنز نگاری میں بہت سارے علل و اسباب کے دروازے کھل جاتے ہیں اور ادب اپنی روایت سے الگ ہو کر ایک نئی ساخت پیدا کرتی ہے جس میں طرح طرح کے ادبی اور غیر ادبی نظریے ملتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے طرز معاشرت کی تمدنی تنقید کو ایک نظریہ سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو کی نثری میلان کا انداز گولکنڈا، دولت آباد اور گجرات سے منسلک ہے۔ آج سے ۸۰۰ برس پہلے ادب کا رجحان سادہ روی پر قائم تھا جس میں مختلف اصناف سخن نے اپنی نظریات سے عروج و کمال عطا کیا۔ یوں تو دہلی اور لکھنؤ اسکول کے ذریعہ نثری میدان میں بہت سارے مرحلے آئے جس کی فروگزاشت ممکن نہ تھی لیکن ہندوستان میں حکومت بنتی اور بگڑتی رہی اور دوسری طرف اجارہ داری ختم کی گئی۔ اُن کی زبان و بیان میں سادہ مزاجی ہے جس سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ رشید احمد صدیقی نے تمدنی تنقید کی تکمیل آرائی میں اپنی مناسبت کی سعی ترجمانی کی ہے۔ غدر کے بعد مکمل طور پر شہنشاہ مغلیہ کا تاراج ہوا تو ہر طرف بربادی، لوٹ مار ہوئی۔ بڑے لوگوں کی جانیں تلف ہوئیں اور دلّی و لکھنؤ کے شعراء اپنی جگہ کو چھوڑ کر کے چلے گئے۔ انگریزی حکومت میں ہندوستانی عوام کو نقصان اٹھانا پڑا۔ لیکن شعراء نے جدیدیت کے دور میں جب قدم رکھا تو شعر و شاعری میں کافی تبدیلیاں پیدا ہونے لگیں۔ خواجہ الطاف حسین حالی نے اردو تنقید کی بنیاد ڈالی گویا ادب اور تنقید کو باہم ربط ملا جس سے شعر و ادب کو تنگ نائے ادب سے نکل کر اپنی جگہ بنائی۔ جدیدیت کے دور میں حالؔی، سرسید شبلی نے ادب کی خدمات کی ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے حالی کی شاعری کی تمدنی تنقید کا تجزیہ اس طرح سے کیا ہے :

> ''حالی اپنی شاعری میں اسلاف اور ان کے کارناموں ہی کا واسطہ نہیں دیتے،
> بلکہ ہندوستان اور اس میں رہنے بسنے والے جس پستی اور غفلت کے شکار
> نیز بدلے ہوئے حالات میں زندگی اور زمانے کے جن مصائب و مطالبات
> سے دوچار یا غافل تھے ان سے بھی عہدہ برآ ہونے کا راستہ دکھاتے اور حوصلہ

> دلاتے ہیں۔ حالؔی نے مسلمانوں کو ''مسدس حالی'' اور ''شکوۂ ہند'' میں ان کا ماضی
> یاد دلانے کے علاوہ اپنی دوسری نظموں، تحریروں اور تقریروں میں حال کے
> تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی جس دلسوزی اور دلیری سے تلقین کی ان کے عہد
> کے کسی دوسرے شاعر نے نہیں کی۔ اور باتوں سے قطع نظر، حالی کی شاعری کو
> اس نقطۂ نظر سے بھی دیکھنا چاہیے کہ ان سے قبل اس طرح کی نظموں کا چرچا اردو
> میں نہ تھا۔''
> (آپ بیتی) جلد اول)

خواجہ الطاف حسین حالی نے تنقید کی بنیاد ''مقدمہ شعر و شاعری'' پر رکھی جو تنقید کی اولین کتاب سمجھی جاتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اسلامی فقہ و عقاید یا جمہور سلف صالحین سے حالی نابلد تھے اور خاص طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی علوم و فنون سے گہرا ربط و ضبط نہ تھا۔ اور معرفت سے نا آشنا تھے اس لئے حالی کی شاعری پر مسلم علماء کے مابین نکتہ چینی کی گئی۔ ظاہر ہے کہ تنقید کی اولین کتاب ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں حالی نے مغربی علوم و فنون سے استفادہ کیا تھا۔ اور سرسری طور پر اسلامی نکات کو بیان کیا ہے جس سے عام مسلمانوں کو ان کی شاعری سے دلچسپی تو ہوئی لیکن رغبت پیدا نہیں ہوئی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے حالی کی شاعری پر اپنا نظریہ پیش کیا ہے اور ان کی شاعری کی ردوقدح پر ''ماضی کی دھندلکوں سے یادوں کا کارواں'' میں حالی کی شاعری کا جائزہ لیا ہے جس میں مختلف نوع کے ادراکات ملتے ہیں جس سے ہر نظریے کی تصدیق ہوتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ عوامی نظریہ ان کے سامنے کھلم کھلا مظاہرہ کرتا ہے۔ جس سے ساری چیزیں عیاں ہو جاتی ہیں۔

پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کلیات رشید کے مقدمہ میں رشید احمد صدیقی کی طرز تحریر کی نمائندگی کرتے ہوئے اس بات کی پیش کش کی ہے کہ قدیم زمانے سے جو عقیدے اور مسئلے رائج ہیں اس میں تبدیلی کی گنجائش پیدا ہوتی رہی ہے۔ عباسیوں کے دور میں مغلوں کے عہد میں اور انگریزوں کے اقتدار میں اور آزادی ہند کے بعد ہندوستان کی جمہوری نظام میں مسلک پر چوٹ کی جاتی ہے۔ عرب میں دور عباسیہ کا ایک ایسا نظام رہا جس میں مختلف مسلکوں کا عمل بیجا تصور کیا گیا اور کسی ایک مسلک پر زندگی گزارنے کی چھوٹ نہیں دی گئی۔ مغل عہد میں شہنشاہ اکبر نے دین الٰہی قائم کیا اس کے خلاف بزرگان دین نے قلم اٹھایا۔ دور فرنگی میں معتقدات پر انگلی اٹھائی گئی اور حقائق سے انحراف بڑھتا گیا۔ عصر حاضر میں جمہوری نظام کے باوجود آج طلاق ثلاثہ پر بحث و مباحثہ کا دور چل رہا ہے اور آج بھی مسلم پرسنل لا بورڈ کے خلاف حکومت کی سازش چل رہی ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی ارکان کے خلاف بہت سارے جواز کی تلاش ہو رہی ہے جس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ہر دور میں مذہب کو نشانہ بنایا جاتا ہے اور اس پر طرح طرح کے الزامات عائد کیے جاتے ہیں۔

ISSN. 2582 - 3612

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے علی گڑھ تحریک کے جاںنثاروں کا تذکرہ کیا ہے۔علی گڑھ تحریک کے بانی سرسید احمد خاں ہیں اوران کے رفقاء ذکاءاللہ، حالی، شبلی اور وقارالملک تھے۔ان تمام لوگوں نے اردوزبان وادب کی خدمت کی ہے مگر مسلک کے اعتبار سے امام احمد رضا خان فاضل بریلوی نے حنفی مسلک کے تحت فتاویٰ رضویہ لکھا جو عام مسلمانوں کے لئے ہے۔ان کا مسلک اسلامی نظریہ پر مامور ہے۔ جہاں تک ہم اس بات کی توجیہہ پیش کرتے ہیں اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سرسید احمد خاں نے اسلامی نظریے میں دخل دیا اور فطری وسائل پر قلم اٹھایا تو ان کے عہد کے مفتی سرسید کے نظریات سے اختلاف کیا۔مولانا ابوالحسن علی ندوی نے مذہب وتمدن نام کی کتاب لکھ کر پوری دنیا کو باخبر کردیا۔اور تمدن کے نظریہ کو پیش کیا جس سے ہم ان کی صلاحیت کی اور ان کی کوشش کی داد دیتے ہیں۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے تمدنی تنقید کے ذریعہ ایک خاص نظریہ کی توثیق کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی طرز تحریر ادب کے لئے ضروری ہے۔

ابوالحسن علی ندوی نے جن نظریات کی تکمیل کی ہے وہ احساس خودی کو بلند کرتا ہے اور حقائق کو نمایاں کرتا ہے۔گویا جانور اور انسان میں بس یہ فرق ہے کہ ایک بولتا ہے اور سمجھتا ہے لیکن دوسرا بولتا ہے اور نہیں سمجھتا ہے۔کلیات رشید میں پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے ''ماضی کے دھندلکوں سے یادوں کا کارواں'' میں یہ انداز بیان کیا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد نے ادبی طور پر سرسید کی آخری عمر میں حمایت کی۔یوں تو سرسید کے رفقاء ان کے وصال کے بعد بھی علی گڑھ تحریک سے وابستہ رہے اور 'تہذیب الاخلاق' رسالہ باضابطہ طور پر آج تک نکالتے رہے ہیں لیکن مضامین، عنوان، نظریہ، اصول میں کافی فرق ہے۔جبکہ سرسید نے اپنی طرز تحریر میں اس بات کی کوشش کی کہ جو ہم بولتے ہیں وہی لکھتے ہیں۔ایسا نہیں کہ ہم جو لکھتے ہیں وہ نہیں بولتے۔ برعکس پہلو کے پیش نظر ہم اس نظریے پر پہنچتے ہیں کہ موجودہ صورت حال میں زبان وادب میں نمایاں فرق حائل ہوا ہے۔پروفیسر رشید احمد صدیقی نے سرسید اوران کے رفقاء کا تذکرہ کیا ہے جس سے دیکھا جاسکتا ہے :

> ''نذیر احمد کا شمار سرسید کے رفقائے ادب میں ہوتا ہے لیکن ان کی بیشتر اہم تصانیف سرسید کے حلقۂ اثر میں آنے سے پہلے شائع ہوچکی تھیں، اس لئے ان تصانیف کے موضوع اور زبان کے بارے میں یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ ان میں سرسید کا اثر کارفرما ہے۔نذیر احمد، ''علی گڑھ تحریک'' کے زبردست علم بردار صرف اپنے خطبات میں نظر آتے ہیں جس کا سلسلہ غالباً 1888ء سے شروع ہوتا ہے۔ ابتدا میں انہوں نے سرسید سے کچھ زیادہ شغف کا اظہار نہیں کیا، لیکن جلد ہی وہ سرسید کے زبردست معاون و منادبن گئے۔نذیر احمد پہلے شخص ہیں جنہوں نے عورت کو داستان طرازوں ،

> بادشاہوں اور شاعروں کے قبضے سے نکال کر روزانہ زندگی کے نشیب وفراز اور دھوپ چھاؤں میں دکھایا ہے۔عورت کی حمایت اور ہمدردی میں سب سے پہلی آواز نذیر احمد اور حالی نے بلند کی۔ دونوں کے یہاں عورت کا اخلاقی تصور (روایتی!!) ملتا ہے۔جس کی ترجمانی حالی کے مشہور طرز خطاب میں ملتی ہے۔''

(کلیات رشید احمد صدیقی (آپ بیتی) جلداول)

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے نہایت شستہ الفاظ میں شاگرد اور استاد کے مابین علمی تمدنی تنقید کو نشانہ بنایا ہے۔اور خاص طور پر رہائشی زندگی کو ترجیح دی ہے۔استاد کی حیثیت علم وہنر سے ہے جب کی شاگرد کی رہائش ماحول سے ہے۔اگر استاد اصلاح پسند نظریہ کو پیش کرتا ہے اور شاگرد من وعن قبول نہیں کرتا تو ظاہر ہے علم وعمل کا تگ ودو کسی وقت بھی ضائع ہوسکتا ہے۔اور اس کی تلافی طرز معاشرت، طرز رہائش، طرز زندگی اور طریقہ زندگی سے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔ظاہر ہے علم جاننے کو کہتے ہیں اور طالب علم جاننے والے کو کہتے ہیں۔اگر ان دونوں میں فرق نہ ہوتو ممکن ہی نہیں کہ طالب علم کو کچھ حاصل ہو۔ اگر طالب علم لاشعور ہے تو اس کی زندگی تلف ہو جائے گی اور وہ کسی لائق نہیں ہوسکتا۔رشید احمد صدیقی نے طنز کے پہلو سے تمدنی تنقید کا تجزیہ کیا ہے۔پروفیسر رشید احمد صدیقی نے سفر کے حوالے سے ایک نظریہ کو اس طرح نمایاں کیا ہے :

> ''گفتگو کرنا ایک سفر کی مانند ہے جس میں مختلف مناظر، مختلف اشخاص اور مختلف حالات وحوادث سے سابقہ ہوتا ہے۔ایک اچھا آدمی ہم سفروں کے ساتھ ہمدردی کرتا ہے اوران کے رنج وراحت کو اپنے رنج وراحت پر ترجیح دیتا ہے۔یہ شرافت ہی کی نہیں اچھے لکھنے والے کی بھی پہچان ہے۔لکھنے میں اور گفتگو کرنے میں بھی رونا، گڑگڑانا، رعب بٹھانا اور قابلیت جتانا نااہلوں کا کام ہے۔میرے مضامین، غزل کی نوعیت کے ہوتے تھے مربوط اور مسلسل نظم کی مانند نہیں۔ان مضامین میں جو باتیں غیر متعلق اور بہکی بہکی معلوم ہوتی ہیں وہ میرے فن کی شریعت کے عین مطابق تھیں۔ میں خود نہیں بہکتا تھا دوسروں کو بہکنے بہلنے کی فرصت دیتا تھا۔عقل کی باتیں دیر تک نہ سنی جاسکتی ہیں نہ سنائی جاسکتی ہیں۔''

(کلیات رشید احمد صدیقی (آپ بیتی) جلداول)

ISSN. 2582 - 3612

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے جذبات کے پیش نظر مختلف نظریوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔اورشعور کے احساس کو بلند کرنے کی ایک بلیغ کوشش کی ہے اور عظیم شخصیات کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند تھے۔ان کی انڈین نیشنل کانگریس میں بڑی عزت تھی۔وہ مسلمانوں کے رہنما تھے۔یہ پہلے مسلمان تھے جن کو کانگریس سرکار نے صدر جمہوریہ ہند کی کرسی عطا کی تھی۔وہ ایک اسکالر تھے۔حق پرست تھے۔سچائی ان کا راستہ تھا۔پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ''کلیات رشید'' میں ذاکر صاحب کے نام یہ لکھا ہے :

> ''گلاب لانے کا واقعہ ذاکر صاحب کی سیرت وشخصیت کو پورے طور پر منقح و منور کرتا ہے۔گلاب پانے کی جوخوشی مجھے ہوئی اس کا اظہار کچھ ایسا ضروری نہیں۔البتہ ذاکر صاحب کا ان گلابوں کا لانا، بجائے خود ایک مطالعہ ہے۔ دل کش بھی اور اہم بھی۔اس کی دل کشی اور اہمیت صرف ایسے لوگوں کی سمجھ میں آسکتی ہے جو زندگی کے نعائم وفضائل کے قائل ہیں نہ کہ اس کے ذمائم و رذائل کے، میں دوست کے فضائل پر مرتا ہوں نہ کہ اس کے اقتدار و اختیار پر۔اس لئے کہ اثر واقتدار حاصل کرنے کے بہت سے ذرائع ہیں جن کو سخت مذموم طریقوں سے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔یا جن کے حصول میں محض اتفاق کو دخل ہوسکتا ہے، لیکن فضائل نفس وہ نعمت ہے جو صرف خدا کے برگزیدہ بندوں کو ملتی ہے۔ذاکر صاحب نے کبھی اثر واقتدار کے حصول کی کوشش نہ کی۔ اثر و اقتدار البتہ برابر اس کی کوشش کرتے رہے (مجھے ایک ایک کا علم ہے) کہ ذاکر صاحب انہیں قبول کرلیں، لیکن انہوں نے کبھی ان کی طرف توجہ نہ کی۔''

(کلیات رشید احمد صدیقی جلد چہارم)

حاصل کلام یہ کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کی تمدنی تنقید میں رعایہ لفظی کا استعمال بھرپور طریقے سے ہوا ہے۔

Dr. Md. Usman Ansari
Assistant
J. P. University
Chapra

ڈاکٹر محمد رضوان

اختر اورینوی کی تنقید نگاری

گزشتہ صدی کے مشاہیر قلم کاروں میں اختر اورینوی کا نام بہت ہی احترام سے لیا جاتا ہے۔ان کی ولادت بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں ہوئی اور کم وبیش چھ،سات برس تک سخت اعصابی مرض میں گرفتار رہ کر، ۱۹۷۷ء میں وہ اس دنیا سے چل بسے۔ایک عام اندازے کے مطابق ،ان کی ادبی زندگی لگ بھگ چالیس برسوں کا احاطہ کرتی ہے۔اختر اورینوی اگر چہ بنیادی طور پر افسانہ نگار کہے جاتے ہیں اور یہ غلط بھی نہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے ڈرامہ، ناول اور تنقیدی مقالات بھی لکھے ہیں اور شاعری بھی کی ہے۔''حسرت تعمیر''ان کا ناول ہے''شہنشاہ حبشہ''ڈرامہ ''انجمن آرزو'' شعری مجموعہ ''منظر وپس منظر'' ''کلیاں اور کانٹے''، ''انارکلی اور بھول بھلیاں''، ''سمنٹ اور ڈائنامنٹ''، ''کیچلیاں اور بال جبریل'' او ر''سپنوں کے دیش میں'' افسانوی مجموعے۔علاوہ ازیں ان کی تحقیقی کتاب ''بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا'' بھی مشہور ومعروف ہے، لیکن اختر اورینوی کی مذکورہ بالا خدمات اور متنوع ادبی حیثیت سے قطع نظر ،یہاں ہمیں جس رخ سے ان کے کارناموں کو یاد کرنا مقصود ہے وہ ان کی ادبی وشعری تنقید نگاری ہے(۱) اختر اورینوی کی حیات وخدمات پر کئی کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں اور کئی جریدوں کے یادگار نمبر بھی شائع ہوچکے ہیں جن کے باقدعدہ مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختر اورینوی نے فکشن نویسی کی شروعات کے ذرا بعد، ایک پچیس تیس سالہ نوجوان کی حیثیت سے تنقید نگاری کے میدان میں قدم رکھا اور کم وبیش تین چار دہائیوں تک اس جہت سے ان کی خدمات کا سلسلہ جاری رہا۔اختر اورینوی، مشہور ناقد کلیم الدین احمد کے ہمعصر ہیں اور بہار کے ان ادیبوں میں نمایاں شہرت ومرتبہ کے حامل، جنہوں نے ترقی پسند تحریک کے عہد آغاز میں نقد ادب کی طرف توجہ دی۔اگر چہ یہ سچ ہے کہ ا یک ناقد کی حیثیت سے کلیم الدین احمد کی شہرت بھی نسبتاً زیادہ ہے اور ان کا کام بھی نسبتا زیادہ وسعت رکھتا ہے، لیکن اس کے باوجود، ادبی تنقید کی دنیا میں اختر اورینوی کی بہر حال اپنی ایک شان اور پہچان ہے۔وہ ہمارے ان بزرگ ناقدوں میں ہیں جنہیں جدید اردو تنقید کی ارتقائی تاریخ لکھتے وقت کبھی بھی بھلایا نہیں جاسکتا۔بلاشبہ اختر اورینوی اپنے دور کے ایک دیدہ ور اور بالغ نظر تنقید نگار گزرے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے میں مشاہیر ارباب نقد ونظر اور معتبر ومستند مورخین ومحققین نے انہیں نہایت احترام سے یاد کیا ہے اور بصد متانت وذہانت ان کی تنقیدی خدمات کے

ISSN. 2582 - 3612

اعتراف میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا ہے۔ اگر ایک طرف اردو میں تنقید نگاری کی ارتقائی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی نے لکھا ہے کہ: ''اختر اورینوی کی تنقید میں تجربہ کا رنگ ملتا ہے، وہ اپنی عملی تنقید میں ماحول اور وراثتی اثرات کا جائزہ لیتے اور ادبی ماحول و ذہنی ساخت کے اثرات دکھاتے ہیں۔''(۱) تو دوسری طرف پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر خلیل الرحمٰن اعظمی، پروفیسر عبدالمغنی، ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر وہاب اشرفی جیسے ناقدین نے بھی بتایا ہے کہ ا''ختر اورینوی ادبی تنقید کی کامیابی کے رازداں تھے،، وہ اشتراکیت سے بھی یک گونہ قربت رکھتے تھے(۲) ان کی تنقید اردو تنقید میں اعتدال اور توازن کی ایک مثال قائم کرتی ہے(۳) ان کی تنقید نگاری مثبت قدر شناسی پر مبنی ہے(۴) اور ان کا شمار ان نقادوں میں ہے جن کی کتابوں اور تحریروں میں اوریجنل فکر اور پُر خلوص مطالعہ کے نشانات ملتے ہیں۔(۵) مزید برآں ڈاکٹر سید نجم الہدیٰ اور ڈاکٹر وہاب اشرفی نے اختر اورینوی کی تنقید نگاری کے باب میں بتایا ہے کہ اختر اورینوی کی تنقید سائنٹفک ہوتی ہے، اس میں عبارت کی توانائی، ادب کی صحت مندی اور تنقید کی گراں مائیگی کا امتزاج ملتا ہے(۶)......اختر اورینوی کی بعض کتابوں یا مضامین کے مجموعوں میں، بہار یعنی عظیم آباد کے شعرا و ادبا مرکز نگاہ رہے ہیں۔ اس طرح سے کہا جا سکتا ہے کہ دبستان عظیم آباد کے استحکام میں، ان کی تنقید نگارشات بہت اہم رہی ہیں۔(۷) بیشک موخر الذکر نکتہ اختر اورینوی کی تنقیدی بصیرت اور دیدہ وری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس نکتہ کی اہمیت، اس منظر و پس منظر میں مزید روشن ہو جاتی اور قابل فہم و اعتراف بن جاتی ہے کہ ان کے ہم عصر تنقید نگار کلیم الدین احمد ہوں یا معروف محقق قاضی عبدالودود، بہر حال ان نامیان زمانہ کے یہاں اس طرح کا کوئی جذبہ، کوئی رجحان یا اس نوعیت کی کوئی واضح فکر و کاوش ہرگز نہیں ملتی ہے، جب کہ اختر اورینوی کے یہاں صورت حال یہ ہے کہ تخلیقی ادب سے، تنقیدی ادب کی طرف آتے ہوئے انہوں نے مقامیت یا صوبائیت کے تقاضوں کو خصوصیت سے سامنے رکھا اور شعر و ادب کے عام مسائل پر لکھنے کے علاوہ بہار میں اردو زبان و ادب کے ارتقا پر بہت اہم کام کیا اور بعض ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی جو اس وقت تک اندھیرے میں تھے۔(۸) بیشک اس ذہنی اور علمی و عملی وطیرہ کے لحاظ سے اختر اورینوی کو بہار کا ایک وفادار ناقد ادب کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اگر چہ یہ صحیح ہے کہ جس طرح ایک حلقہ نے اختر اورینوی کی تنقیدوں کو مذکورہ بالا پہلوؤں سے خوب خوب سراہا ہے اور اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ بہار کے ادبی و شعری سرمایہ کی پرکھ اور تحقیق و تفتیش کے معاملے میں اختر اورینوی کی تنقید نگاری اپنے معاصرین سے ممتاز و منفرد بھی رہی ہے اور متین و باشعور بھی۔ کچھ اسی طرح ایک دوسرے حلقہ نے اختر اورینوی کی تنقیدی نگارشات پر طرح طرح کی عصبیت سے کام لینے کا بھی بار بار ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ ان کی تنقید عصبیت کی عملداری سے محفوظ نہیں رہ سکی ہے۔ وہ اپنی تنقید میں عقیدت مندی، حب الوطنی اور رفاقت و دوستی کے بے جا شکار

ہو جاتے ہیں اور اسلوب و انشاء کے لحاظ سے بھی ان کی تنقید میں کئی کمزور پہلو ملتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ اختر اورینوی کی تنقیدوں میں ''عصبیت کی عملداری''(۹) ہے بلکہ ان کی کمزوری یہ بھی ہے کہ وہ اپنی انشا پردازی سے تنقید پر چھا جانا چاہتے ہیں اور ہمیں رومان کی طرف لے جاتے ہیں۔(۱۰) لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر ایک وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو کسی خاص دشواری کے بغیر یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ کہنے والوں نے جس چیز کو اختر اورینوی کی عصبیت و عقیدت کہا ہے وہ در حقیقت فی الواقع ان کی حقیقت پسندی ہے اور جس چیز کو ان کے اسلوب کی کمزوری بتایا گیا وہ دراصل، جمالیاتی قدروں سے ان کے تنقیدی رشتہ کی استواری کا ایک خوبصورت علامتی پہلو ہے۔ اختر اورینوی کی تحقیقی کتاب، ان کے شعری مجموعہ، ناول، ڈراما اور ان کے افسانوی مجموعوں کے نام لئے جا چکے ہیں، تنقیدی مضامین کے تعلق سے بھی اختر اورینوی کے متعدد مجموعے ''کسوٹی''، ''قدر و نظر''، ''مطالعہ اقبال''، ''مطالعہ نظیر''، ''سراج و منہاج''، ''تحقیق و تنقید اور ''تنقید جدید'' منظر عام پر آ چکے ہیں جن میں مختلف نوعیت کے علمی مقالوں کو جگہ دی گئی ہے۔ ان میں جیسا کہ ماہرین نے اپنے تجزیاتی مطالعہ کی رو سے بتایا ہے، نہ صرف یہ کہ، ''تصنیفی، صنفی اور علاقائی'' نوعیت کی تحریریں ملتی ہے بلکہ ''لسانیاتی اور نظریاتی'' مقالے بھی حاضر ہیں اور بحیثیت مجموعی انہیں بجا طور پر ایک ایسی اہم قلمی میراث کہا گیا ہے جو اردو میں علمی و فنی اور اصولی و نظریاتی تنقید کی نشو نما کے معاملے میں تاریخی حیثیت رکھتی ہے (۱۱) اگر چہ ایک مختصر مضمون میں تفصیلوں کی طرف جانے کا موقع نہیں ہوتا، پھر بھی اشارتاً یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ اختر اورینوی کی قلمی و انتقادی میراث جو تاریخی حیثیت و اہمیت رکھتی ہے اسے مزید عمدگی سے، اس وقت سمجھنا نسبتاً سہل ہو جاتا ہے جب کہ صرف ترقی پسند ادبی تحریک کا منظر و پسِ منظر ہی پیش نظر نہ ہو بلکہ ''تحریک ترک موالات'' کے بکھرنے کا وہ منظر نامہ بھی سامنے رہے جس کے نتیجہ میں، لازمی طور سے ادب میں صوبائیت پسندی کا وجود ہوا اور اسے فروغ ملنے لگا تھا اور کہنا چاہئے کہ ایک وسیع تناظر میں، فی الاصل اختر اورینوی کی ادبی تنقید نگاری، متذکرہ معاملوں کے اثرات کی برجستہ پیداوار ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت جو لہر چل رہی تھی اور عصبیت سے بھرپور صوبہ پرستی کا جو رجحان پنپ رہا تھا اس کا تقاضا یہی تھا کہ واضح شعور اور سنجیدہ تصلب کے ساتھ، ادب میں صوبہ پسندی کے فروغ پر باقاعدہ توجہ دی جاتی اور غلط رجحانات و اثرات کو مٹانے کی ہمہ جہت کاوشیں ہوتیں۔ چنانچہ اختر اورینوی نے اس نازک صورت حال کو سمجھا اور اپنی تنقیدی روش سے نہایت خوبصورتی، سنجیدگی اور خاموشی کے ساتھ ایک تاریخ ساز کارنامہ انجام دے گئے۔ یہ عین ممکن ہے کہ تاریخ ادب کے طالب علموں کو، جدید بہار کے ادیبوں اور شاعروں سے روشناس کرانے کے اس کام میں کہیں عقیدت مندی نے کوئی جگہ پالی ہو، کہیں دلداری اور ہمدردی کے عناصر غالب آ گئے ہوں اور رفاقت و وطنیت نے اپنے کچھ رنگ روپ دکھا دیے ہوں، لیکن اختر اورینوی

ISSN. 2582 - 3612

کے واضح شعور اور مخلصانہ عمل سے بہرصورت انکار نہیں کیا جا سکتا۔''ان کا رویہ بہرحال مثبت اور تعمیری'' ہے ۔ان کے یہاں بت شکنی نہیں بلکہ قدر شناسی اور افہام وتفہیم کا جذبہ ہے اور اس پر عملاً توجہ اور یہی وجہ نکتہ ہے جواختر اورینوی کی تنقید کو کلیم الدین احمد سے امتیازی شان عطا کرتا ہے (۱۲) اختر اورینوی نے ظاہر ہے کہ ایک ایسا زمانہ پایا تھا جب کہ مغربی افکار نقد ونظر کے چکا چوند نے آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا اور حالی وشبلی کی روایتیں نگاہوں سے اوجھل ہونے لگی تھیں، لہذا اقتضائے زمانہ کے بموجب ایک بالغ نظر فنکار کی طرح انہوں نے صوبائی محبت وتصلب کے ساتھ اعتدال پسندانہ تنقیدی روش اپنائی اور مغربی اصول تنقید سے مناسب آگہی اور مشرقی روایات نقد سے مناسب ہم آہنگی کے ساتھ اس تنقیدی روایت کو آگے بڑھایا جو حالی وشبلی اور ان کے نزدیکی پیروکاروں کی روایت تھی۔ یہ اصل میں انتہا پسندی اور اعتدال پسندی ہی کا فرق ہے، جو دنیائے تنقید میں، ایک ہی زمانہ کا فنکار ہونے کے باوجود، کلیم الدین احمد اور اختر اورینوی کو دو الگ الگ راہوں کا مسافر بنا دیتا ہے۔ کلیم الدین احمد کا جوش بت شکنی مشہور ہے اور وہ اس جوشیلے وطیرے کے ساتھ مغربی افکار ونظریات سے از بس مرعوبیت ہو کر، اپنی تنقید کی دنیا بساتے ہیں جب کہ اختر اورینوی کے یہاں مغربیات کے گہرے اور وسیع مطالعہ کے باوجود نہ تو اس نوعیت کی مرعوبیت ملتی ہے، نہ ہی انتہا پسندی اور بت شکنی جو اردو شاعری اور اردو تنقید پر ایک نظر ڈالنے والے کے یہاں سرتاسر موجود ومعروف ہے۔ اختر اورینوی کی تنقید نگاری کا امتیاز یہ ہے کہ وہ مشرقی اقدار کو بھی اہم سمجھتی اور عزیز رکھتی ہے اور مغربی اقدار سے بھی حسب دیانت فائدے اٹھانے میں کسی قسم کے اگر مگر سے کام نہیں لیتی ہے۔ اگر یہ کہا گیا ہے تو غلط نہیں کہا گیا ہے کہ اختر اورینوی کے یہاں مغرب سے تاثر پذیری کا عمل متوازن اکتسابات کی حدوں تک ہی رہا ہے۔''وہ اپنی تنقید میں فنی اور افادی دونوں ہی پہلوؤں کو اہمیت دیتے ہیں اور ان کی تنقید میں جمالیات کے بھی زاویے پائے جاتے ہیں اور لطف بالائے لطف یہ ہے کہ ان کے یہاں جو جمالیاتی قدریں ملتی ہیں وہ بہرحال مخصوص ومتوازن ادبیاتی تصور سے بیگانہ نہیں۔ اختر اورینوی نے جمالیات کو ادب وفن کی اساسی قدر ہی نہیں بتایا ہے بلکہ ان کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے اسے اردو والوں کے سامنے لایا ہے تو بہرصورت ایک خاص تہذیب ومزاج سے آراستہ کر کے لایا ہے۔ اس سے ہمارا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اختر اورینوی صرف مغربی جمالیاتی قدروں کے دلدادہ نقاد نہیں ہیں بلکہ ان کے انتقادی میلان وعمل میں، مذہبیات واخلاقیات سے اثر پذیری کا بھی واضح ثبوت ملتا ہے انہوں نے اپنی تنقیدات میں، بہرحال اسلام ادبی نقطۂ نظر کی اہمیت تسلیم کی ہے، انہوں نے اپنی کتاب ''تنقید جدید'' میں ادبیات عالم کے موضوع پر جو کچھ لکھا ہے اور اپنی کتاب ''کسوٹی''، میں ''افسانے میں مقصد'' پر جس انداز سے اظہار خیال کیا ہے۔ پھر ان کے مقالہ ''میرا نظریہ فن'' میں جو باتیں آئی ہیں ان سے بہت سارے مفید معنی نظریاتی پہلو

اجاگر ہو جاتے ہیں۔ اختر اورینوی نے صاف صاف لکھا ہے اسلامی انقلاب بہ حیثیت فلسفۂ حیات ہمیشہ تہذیبوں اور انقلابوں کو متاثر کرتا رہا ہے۔ اختر اورینوی کی نگاہ میں، فن کے اندر فکری پہلو کا پایا جانا بھی ضروری ہے۔ ادب کے لئے کوئی اور مقصد ہو یا نہ ہو، صحیح ادب ہونا ہی ایک مقصد ہے (۱۳) انہوں نے مزید لکھا ہے کہ تنقید کا کام بڑا آزمائشی کام ہے، یہ صلاحیت کی بھی آزمائش اور ایمان کی بھی۔'' (۱۴) اپنے نظریۂ فن کی وضاحت کرتے ہوئے اختر اورینوی نے ایک اور بڑے پتہ کی بات کہی کہ ''میرا عقیدہ لا اکراہ فی الدین بھی ہے اور لا اکراہ فی الفن بھی۔'' (۱۵) اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ فن کے معاملے میں، کسی نظریاتی جبر واکراہ کے قائل نہیں ہیں بلکہ وہ سرتاسر ایک اعتدال پسند ناقد ہیں اور یہی وہ بات ہے جو انہیں عملی تنقید کا ایک اہم فن کار بناتی ہے۔ اختلافات علمیہ کا امکان کہاں نہیں ہوتا؟ لیکن اختر اورینوی جیسے ارباب علم ونقد کی خدمات کے وزن ووقار اور اثرات سے انکار بہرصورت دانشوری کے موافق نہیں۔

Dr. Md. Rizwan
Post Graduate Teacher (Urdu)
Zakaria Colony (Near Masjid)
Mohalla - Sadpura
P.o. - Ramna
Muzaffarpur - 842 002

ڈاکٹر عابدہ ناز

کلیم الدین احمد اور عبدالمغنی (اقبالیات کے تناظر میں) : ایک تقابلی جائزہ

اردو زبان وادب کے ممتاز ناقد ڈاکٹر عبدالمغنی کی کتاب ''اقبال اور عالمی ادب'' اردو ادبیات پر بہترین تصنیف قرار دی جاسکتی ہے۔واقعہ یہ ہے کہ اپنے عالمانہ انداز، ناقدانہ بصیرت اور ماہرانہ اقبال شناسی کی وجہ سے یہ کتاب اپنے موضوع پر بڑی منفرد اور دانشورانہ تصنیف ہے۔عبدالمغنی گذشتہ پانچ دہائی سے اردو تنقید پر مسلسل مضامین لکھتے رہے،جس نے اردو میں تنقید کو ایک نیا نقطہ نظر دیا ساتھ ہی اردو تنقید کو افراط وتفریط سے ہٹ کر ''جادہ اعتدال'' پر لانے کی بڑی اچھی کوشش کی۔اس طرح اردو زبان وادب کی ''تشکیل جدید'' کے ساتھ ساتھ اس کے معیار واقدار میں اضافہ ہوا ہے۔

جدید اردو تنقید میں وہ اخلاقی نقطہ نظر اور اعلیٰ معیار واقدار کے نمائندے اور نقیب رہے ہیں۔اس لحاظ سے اردو تنقید میں عبدالمغنی اپنے منفرد اسلوب اور صحت مند نقطہ نظر کی وجہ سے ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں اور پھر اقبال کے فکر وفن پر ان کی ماہرانہ صلاحیت اور تخصص کے پیش نظر یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اس کتاب میں ڈاکٹر عبدالمغنی نے نہ صرف یہ کہ جناب پروفیسر کلیم الدین احمد کے اردو میں تنقیدی کارناموں کا بھرپور جائزہ لیا ہے بلکہ خاص طور پر ''اقبال۔۔۔۔ایک مطالعہ'' میں جناب کلیم الدین احمد نے اقبال کا جو ناقص مطالعہ اور فریب کارانہ نظر اختیار کیا ہے،اس کا تحلیل وتجزیہ کرکے جلوۂ ادب فرنگ سے ان کے خیر کو نمایاں کیا ہے۔اقبال کا یہ معروضی مطالعہ ایک طرف عالمی ادب میں اقبال کے فکر وفن اور اس کے مقام کا تعین کرتا ہے تو دوسری طرف کلیم الدین احمد کی مغربی ادب وتہذیب سے ذہنی مرعوبیت،مشرقی شعریات اور ادبیات سے ان کی واجبی واقفیت کے باعث اقبال کے سلسلہ میں ان کا معاندانہ انداز فکر اور محکومانہ فکر کا پتہ چلتا ہے،کتاب کا انداز بیان،کہیں کہیں لب ولہجہ کی درشتگی کے باوجود،عالمانہ تحلیل وتجزیہ حکیمانہ اور بہت ہی مدلل اور مؤثر ہے۔بقول ''عرض ناشر'' اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پہلی بار مغربی ادب اور اس کے تصورات سے مرعوب ہوئے بغیر نہایت وقار کے ساتھ پورے عالم ادب کے بنیادی تصورات کا ایک زبردست تنقیدی جائزہ لے کر ان کے پس منظر میں اصولی وفنی طور پر اقبال کے اعلیٰ مقام کی نشاندہی کی گئی ہے۔اس طرح یہ تصنیف نہ صرف اقبالیات بلکہ عام ادبیات کے تنقیدی مطالعہ کا ایک بالکل نیا،منفرد اور امتیازی انداز پیش کرتی ہے۔جس سے کلیم الدین

احمد کی تنقیدی لغزشیں اور مغربی انداز تنقید کی اصلیت آشکار ہوجاتی ہے۔

''اقبال کے ایک مطالعہ'' جناب پروفیسر کلیم الدین احمد کی ایک ایسی تصنیف ہے،جس میں انہوں نے اقبال کا مطالعہ اپنے مخصوص نقطہ نظر سے کیا ہے،اقبال کے اس مطالعہ میں ان کا وہی انداز نظر ہے،جناب کلیم الدین احمد کی یہ دونوں کتابیں ان کے تنقیدی انداز نظر کی ''شاہکار'' ہیں اور اب ان کا اقبال کا یہ مطالعہ تمام تر ان کے اپنے اسی ذاتی ذوق وذہن اور فکر ونظر کا آئینہ دار ہے۔اپنے ندوہ کے دور طالب علمی میں جب پہلی مرتبہ ان کی یہ دونوں کتابیں،جو ابھی نئی نئی شائع ہوئی تھیں اور جس سے اردو تنقید نگاری میں ایک ہلچل سی مچ گئی تھی،میں نے پڑھیں تو پہلا تاثر میرے ذہن میں جو پڑا وہ یہ تھا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ جنہیں اچھی اردو لکھنی بھی نہیں آتی اور وہ محمد حسین آزاد جیسے انشاء پرداز،صاحب گل رعنا،مولانا عبدالحئی جیسے نازک خیال ادیب اور ثانی شبلی مولانا عبدالسلام ندوی کے ''شعرالہند'' پر منہ آتے ہیں اور جن کی نگاہ میں اردو شاعری کی تاریخ میں کوئی شاعر پیدا نہیں ہوا۔میر سے اقبال تک اردو شاعری کے افق پر جو ستارے روشن ہیں،انہیں اس میں کوئی چمک دکھائی نہیں دیتی،حالاں کہ اپنا طالب علمانہ دور تھا،ویسے دبستان شبلی سے ذہنی وابستگی تھی،اردو شعر وادب کے تقریباً تمام اصناف مطالعہ سے گذر چکے تھے،سرسیّد،حالؔی،شبلؔی،محمد حسن اور نذیر احمد سے لے کر سید سلیمان ندوی،ابوالکلام آزاد،عبدالماجد دریابادی،نیاز فتح پوری،رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر عابد حسین وغیرہ کی اعلیٰ ادبیات اور معیاری نثر نگاری سے ذہن ودماغ لذت آشنا ہوچکا تھا۔

اردو شاعری میں میرؔ،غالبؔ اور اقبال کا کلام،میر حسن کی مثنوی،انیس ودبیر کے مرثیے سے لطف اندوزی کے ساتھ ان کے فکر وفن سے محظوظ ہونے کی صلاحیت اور بصیرت پیدا ہوچکی تھی،اردو شعریات وادبیات کے اس مطالعہ کے بعد جناب کلیم الدین احمد کی روکھی پھیکی بے مغز تنقید کا نہ صرف یہ کہ کوئی اچھا اثر ذہن پر نہیں پڑا بلکہ ان کے بارے میں جو رائے بنی تھی وہ رفتہ رفتہ شعر وادب اور اس کے وسیع مطالعہ کے بعد اس میں مزید پختگی پیدا ہوگئی اور ان کی ناقدانہ صلاحیت کے بارے میں کوئی خوش گمانی نہیں رہی اور پھر یہ پتا چلا کہ اپنی ریاست بہار کے یہ بزرگ نقاد،پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے استاذ ہیں اور انگریزی ادبیات سے آشنا تو ضرور ہیں لیکن مشرقی ادبیات کی لذت سے بیگانہ اور مغربی ذہن کے آئینہ ونمونہ ہیں۔اردو تنقید میں ان کا کارنامہ صرف اتنا ہے کہ آپ نے تنقیدی کتابیں لکھی ہیں۔مضامین اور مقالوں سے کام نہیں چلا ہے،جس کا اظہار انہوں نے آل احمد سرور اور دوسرے ناقدوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے اکثر فرمایا ہے،حالاں کہ جس زبان میں وہ لکھتے ہیں اس زبان کی ادبی خوبیوں اور نزاکتوں سے نابلد اور جس شعر وادب پر اظہار کیا ہے،اس کی روح،روایت اور اس کے تہذیبی پس منظر سے یکسر ناآشنا اور بیگانہ نظر آتے ہیں،ظاہر ہے ایسا شخص چاہے اپنے آپ کو ادب وفن کا ماہر سمجھ لے لیکن اس زبان

میں جس میں اس کے قلم کے کارنامے آرہے ہیں، اس کا کوئی وزن و وقار نہیں ہوسکتا۔یہی وجہ ہے کہ آج بھی اردو دنیا میں خواہ وہ جدید اردو تنقید ہو یا دوسرے علمی و ادبی دائرے اور زاویئے کلیم الدین احمد کے مرتبہ ومقام کا تعین مشکل ہے، دبستان عظیم آباد سے لے کر لکھنوٴ، علی گڑھ اور دہلی کے علمی و ادبی حلقوں تک میں، ان کی اردو کے ایک معتبر اور کامیاب ناقد کی حیثیت سے پذیرائی نہیں ہوسکی۔اس پس منظر میں جناب پروفیسر کلیم الدین احمد کی کتاب ''اقبال ۔۔۔ایک مطالعہ'' اقبال کے سلسلہ میں خاص نزاعی مطالعہ بن کر رہ گیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالمغنی کی کتاب ''اقبال اور عالمی ادب'' جو زیر تبصرہ ہے اور بظاہر جناب کلیم الدین احمد کی کتاب کا جواب نظر آتا ہے۔اس وقت دونوں کا تقابلی مطالعہ راقم کے پیش نظر ہے۔عبدالمغنی کی یہ کتاب عالمی ادب ،خصوصاانگریزی ادب کا بھر پور جائزہ اور اس کے مقابلہ میں اقبال کے مرتبہ ومقام پر ایک مستقل بحث ہے، جو بیک وقت ادب کے عالمی تصورات اور کلام اقبال کے فنی وفکری مضمرات کا احاطہ کرنے کے بجائے تمام تر معاندانہ انداز نظر اختیار کیا ہے۔انھون نے اردو تنقید میں بت پرستی کا رونا رویا ہے اور یہ الزام یہ ہے کہ غالب ،اقبال دو دیوتا بنادیئے گئے ہیں ۔اس حقیقت کے اعتراف کے باوجود کہ غالب اور اقبال اردو شاعری کے دومقبول ترین شاعر ہیں، جوفکر وفن کے بلند ترین معیار پر پورے اترتے ہیں، اس سلسلہ میں انگریزی شاعروں سے اقبال کا موازنہ ومقابلہ اور بھر پور جائزہ عبدالمغنی کی اس کتاب کا اہم موضوع ہے اور حق تو یہ ہے کہ انھوں نے اس موضوع کا حق ادا کردیا ہے۔چنانچہ اس سلسلہ میں مناسب ہے کہ دونوں کے نقادنظر پر ایک نگاہ ہم ڈالتے چلیں۔

جناب کلیم الدین احمد''اقبال۔۔۔ایک مطالعہ'' کے پیش لفظ میں فرماتے ہیں :

حقیقت یہ ہے کہ اردو تنقید کی ذہنیت میں بت پرستی کچھ اس طرح رچ بس گئی ہے کہ اس نے دو بڑے دیوتا بنالئے ہیں، غالبؔ اور اقبالؔ اور جہاں اس قسم کی ذہنیت نے جڑ پکڑ لی ہو، وہاں بے لاگ تنقید کا گذر نہیں ہوسکتا۔اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ ان دونوں شاعروں کو اتنا اچھالا گیا ہے اور اچھالا جارہا ہے۔ان کی شاعرانہ بزرگی سے متعلق ایسے Wild Assertions کئے جاتے ہیں کہ عقل انگشت بدنداں ہے کہ اسے کیا کہئے۔''

پروفیسر کلیم الدین احمد کے اس ناقدانہ بیان کی وضاحت میں ڈاکٹر عبدالمغنی اپنی کتاب ''اقبال اور عالمی ادب'' میں رقمطراز ہیں :

دنیا نے کبھی بھی غالبؔ اور ان کے کلام کو مقدس نہیں سمجھا، یہ ضرور ہے کہ غالب اردو کے ایک مقبول ترین شاعر ہیں اور ان کی شاعرانہ عظمت کے قائل اردو کے سبھی نقاد ہیں، سوا کلیم الدین احمد کی اکیلی ذات کے۔آخر اردو تنقید نے غالبؔ کی تعریف وتوصیف میں کتنا بڑا لٹریچر تخلیق کیا ہے کہ اس کی بناء پر

،معاملہ پرستش کی حد تک پہونچ گیا ہے۔کیا انگریزی تنقید نے شیکسپیئر کی مدح وثناء میں زمین وآسمان کے جو قلابے ملائے ہیں اور اس کی حمد ونعت میں جو ایک کتب خانہ تعمیر کر کے رکھ دیا ہے، اس کا دسواں حصہ بھی بیچارے غالبؔ کو میسر آیا ہے؟ ۔۔۔۔۔۔۔رہے اقبال تو ابھی ان کے فکر وفن کی تشریح وتوصیف میں اتنی اور ویسی تحسین آمیز کتابیں بھی نہیں لکھی گئی ہیں، جتنی اور جیسی ملٹن پر انگریزی میں پائی جاتی ہیں بلاشبہ اقبال پر اردو ادب ناز کرتا ہے، جیسے انگریزی ادب شیکسپیئر، اطالوی ادب دانتے پر اردو جرمن ادب گوٹٹے پر فخر کرتا ہے۔یہ بھی صحیح ہے کہ اقبال کی تعریف وتوصیف میں، سوا کلیم الدین احمد کے، اردو تنقید عام طور پر رطب اللسان ہے لیکن ابھی نہ تو اقبال کی فکر کی تشریح کا حق ادا ہوا ہے اور نہ فن کی قدر شناسی ہوسکی ہے۔اردو اور فارسی میں اقبال کی تخلیقات کا حجم اور وزن ہے، ابھی اس کے بہت تھوڑے حصہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

''اقبال۔۔۔۔ایک مطالعہ'' میں جناب کلیم الدین احمد کا انداز تنقید کیا ہے؟ آپ کی کتاب مندرجہ ذل اقتباسات سے اس کا صحیح اندازہ ہوسکے گا، فرماتے ہیں :

''میں نے کہا ہے کہ اقبال شاعر تھے، اچھے شاعر تھے اور وہ زیادی اچھے شاعر ہوسکتے تھے، اگر وہ شاعر ہونے پر قناعت کرتے اور پیغمبر بننے پر مصر نہ ہوتے، اس پیغمبری نے ان کی شاعری پر ایک کاری ضرب لگائی لیکن اس کاری ضرب کے بعد بھی ان کی شاعری باقی رہی اور یہ ان کی شاعری کی جان داری کا ثبوت ہے۔

میں نے اپنے مقالے میں کوشش کی ہے کہ اقبال کے شعری کائنات کا جائزہ لیا جائے ان کے فلسفہ کا نہیں، ان کے پیغام کا نہیں، ان کے خیالات کا محض خیالات کی حیثیت سے نہیں۔لیکن چوں کہ یہ چیزیں ان کی شاعری میں ایسی گھل مل گئی ہیں، اس لئے ان کا ذکر کبھی کبھی آہی گیا ہے لیکن ضمنی طور پر، مجھے ایسا لگتا ہے کہ اقبال ہمیں راہ نجات دکھانے میں اس قدر منہمک ہوجاتے ہیں، اس کام کو اس قدر اہم سمجھتے ہیں کہ اکثر شاعری کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ان متفرق خیالات کا جائزہ ڈاکٹر عبدالمغنی نے علیحدہ علیحدہ بڑی وضاحت سے لیا ہے، یہاں ان کی تفصیلات میں جانے کا موقع نہیں۔ان پریشاں خیالیوں سے ہٹ کر ، یہاں میں اُن کی کتاب سے صرف ایک اقتباس پیش کرتی ہوں جس سے جناب کلیم الدین احمد کے ان بیانات کی اصلیت اور حقیقت کی وضاحت ہوجاتی ہے، باقی ان بیانات میں جو ہجو یہ انداز اور ناقدرشناسی ہے وہ اہل علم وبصیرت خود محسوس کرلیں گے۔

جناب کلیم الدین احمد کو عالمی ادب کی اس معلوم ومعروف حقیقت کو لازملحوظ رکھنا چاہئے کہ فلسفہ، پیغام اور خیالات سے شخصی ونفسی طور پر جتنے بھی بیزار ہوں، جس چیز کو ادب عالی (Classics) کہا جاتا ہے وہ اکثر وبیشتر کسی نہ کسی دفلسفے، پیغام اور خیالات پر مبنی ہوتا ہے، بلکہ بیشتر شاہکار تخلیقات تو وہ ہیں جو مذہبیات سے جذبہ حاصل کر کے تصنیف کی گئی ہیں اور ان کا ماحصل کچھ اعلی اخلاقیات ہیں۔دانتے کا طربیہ

ISSN. 2582 - 3612

خداوندی (Divine Comedy) سراسر مسیحی دینیات واخلاقیات پر مشتمل ہے اور اس کا موضوع صریحا نجات ہے، جنت، دوزخ، ثواب اور عذاب، جزا اور سزا کے تصور ہی پر اس شعری ڈرامے کا پلاٹ مرتب ہوا ہے۔ گیٹے کا ''فاؤسٹ'' روحانی طاقت کے حصول اور استعمال کے موضوع پر ایک ایسی ادبی کوشش ہے جس کا انجام بھی روحانی اذیت پر ہوتا ہے اور اس کوشش اور اس کے انجام کے پیچھے ہدایتاً ایک فلسفہ ہے، جو عالم انسانیت کو ایک خاص پیغام دیتا ہے اور یہ پیغام چند نہایت سنجیدہ خیالات ہی نہیں، اخلاقیات پر مشتمل ہے، اس ڈرامے کا محرک ومقصود بھی نجات ہے، ملٹن کی Pradies Lost (فردوس گمشدہ) کیا ہے؟ اس کا عنوان ہی اشارہ کرتا ہے کہ اس میں الٰہیات، دینیات، اخلاقیات اور نجات کے سارے سبق موجود ہیں۔۔۔۔۔۔۔ جب عالمی اور مغربی ادبیات کے عظیم ترین شاہکاروں کا حال یہ ہے تو پھر اقبال کا فلسفہ وپیغام اور فکر نجات جناب کلیم الدین احمد کے لیے اس حد تک سوہان روح کیوں ہے کہ وہ اس کو اقبال کی شاعری پر ایک کاری ضرب تصور کرے ہیں اور یہ تک کہنے سے باز نہیں آتے کہ اقبال اکثر شاعری کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔

Dr. Abda Naz
D/o. Dabirul Islam
At/ P.o. Husaina
Via : Lakhminia
Begusarai - 851 211

ڈاکٹر ریحان احمد قادری

مولانا ابوالکلام آزاد بحیثیت صحافی

محی الدین ابوالکلام آزاد وہ شخصیت ہیں جو صدیوں میں پیدا ہوا کرتی ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی ہمہ گیر شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ وہ اگر مجاہد آزادی تھے تو ایک عالم دین بھی تھے۔ انہوں نے قرآن پاک، فقہ، علم الکلام، علم الحدیث پر غیر معمولی قدرت حاصل کی تھی۔ ایک عظیم خطیب، زبردست صحافی وعالی مرتبت مجتہد، عظیم دانشور، بلند پایہ مفکر، فلسفی اور جنگ آزادی کے عظیم قومی رہنما تھے۔

آپ نے ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں بہت اہم رول ادا کیا بلکہ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ مولانا آزاد کی آزادی کے لئے کی جانے والی جدوجہد کے ان گنت نقوش مہاتما گاندھی جی پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ آپ نے اس ملک وقوم کے لئے جو خدمات انجام دی ہیں وہ ہمیشہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ۱۱/ نومبر ۱۸۸۸ء کو عرب کے عظیم مقام مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے۔ عربی آپ کی مادری زبان تھی۔ آزاد کلکتہ ۱۸۹۵ء میں پہنچے تو ان کی عمر دو سال کی تھی۔ یہاں ان کی باقاعدہ تعلیم شروع ہوئی۔ انہیں حافظے اور ذہانت کی دولت سے اللہ تعالیٰ نے سرفراز کیا تھا۔ انہوں نے تیرہ چودہ برس کی عمر میں فقہ، حدیث، منطق اور ادبیات پر عبور حاصل کرلیا تھا۔ ۱۹۰۲ء تک آپ کی ابتدائی تعلیم مکمل ہوچکی تھی۔

آپ کی ابتدائی تعلیم مولوی محمد عمر، مولوی سعادت حسن وغیرہ سے حاصل کی۔ آزاد نے دس گیارہ برس کی عمر میں شعر گوئی کا آغاز کیا اور مولوی عبدالواحد کی تجویز پر آزاد تخلص رکھا۔ بعد میں نثر نگاری کی طرف توجہ کی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے قرآن وحدیث وفقہ کا گہرا مطالعہ کیا۔ مولانا کا عقیدہ تھا کہ قرآن ہماری زندگی کے ہر شعبے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ مولانا ادبی وسماجی وتاریخی اور سیاسی تحریروں میں قرآن کے حوالے موجود ہیں۔ رانچی قیام کے زمانے میں ترجمان القرآن ترتیب دیا اور فقہ اسلامی کی روشنی میں ''الصلوۃ والزکوۃ'' اور ''النکاح'' وغیرہ تصانیف مکمل کی۔ مولانا کی زندگی کا بڑا حصہ ادبی اور سیاسی میدان میں گزرا۔ انہوں نے بہت سارے رسالوں میں مضامین لکھے اور کئی ادبی رسالے شائع کئے۔ مولانا نے سب سے پہلا رسالہ ماہ نامہ ''نیرنگ عالم'' ۱۸۹۹ء میں جاری کیا۔ اس وقت مولانا کی عمر صرف گیارہ برس تھی۔ یہ رسالہ سات آٹھ مہینے جاری رہا بعد میں المصباح، احسن الاخبار ہفت روزہ پیغام، الجامعہ وغیرہ رسائل میں خدمت انجام دیں۔

۱۹۰۹ء میں ''لسان الصدق'' ماہنامہ رسالہ کا پہلا شمارہ کلکتہ سے شائع ہوا۔ اس کا اول مقصد اصلاح

ISSN. 2582 - 3612

معاشرت، دوسرا مقصد ترقی، تیسرا مقصد علمی ذوق کی اشاعت اور چوتھا مقصد تنقید یعنی اردو تصانیف کا منصفانہ جائزہ لینا۔ مولانا نے ۳۱/ جولائی ۱۹۰۶ء کو ہفت روزہ اخبار ''الہلال'' کا پہلا شمارہ شائع کیا۔ اس کا خاص مقصد ہندو اور مسلمان میں اتحاد پیدا کرنا تھا۔ الہلال مسلمانوں کی ملی غیرت، ایمانی حرارت اور مذہبی حمیت کا بڑا محاذ بن گیا۔ الہلال میں ادبی، علمی، سیاسی اور تاریخی مضامین شائع ہوتے تھے۔ سماجی وتہذیبی مسائل پر اظہار خیال ہوتا۔ جس نے اردو صحافت کو نیا راستہ دکھایا۔ الہلال ہندوستان کا پہلا اخبار تھا جس نے ہندوستانی مسلمانوں کو ان کے سیاسی وغیر سیاسی مقاصد کی تکمیل اور اپنے اعمال میں اتباع شریعت کی تلقین کے ساتھ ساتھ ادبی، علمی، سیاسی اور تاریخی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ انگریز حکومت نے جو اس وقت ہندوستان پر حکومت کرتا تھا اس نے الہلال پریس کو ضبط کرلیا تو مولانا نے ''البلاغ'' کے نام سے دوسرا اخبار جاری کیا۔ جس میں ادب، تاریخ، مذہب اور معاشرہ کے مسائل بیان کئے جاتے تھے۔ ابلاغ اخبار کو مذہبی تبلیغ کا ذریعہ بنایا گیا۔ جنگ آزادی کی طویل جدوجہد میں جو شعلہ بیان مقرر پیدا ہوئے ان میں مولانا کا نام سرفہرست ہے۔ مولانا ایک بے باک مقرر تھے، جب وہ کسی موضوع پر بات کرتے تھے تو ان کا ایک خاص پروقار اور پرجلال انداز ظاہر ہوتا تھا۔ میں آپ کی خدمت میں مولانا کی تقریر کا ایک حصہ حاضر خدمت کرتا ہوں۔ ''اسلام کی ایسے اقتدار کو جائز تسلیم نہیں کرتا۔ جو شخصی ہو یا چند تنخواہ دار آفیسروں کی بیوروکریسی ہو وہ آزادی اور جمہوریت کا ایک مکمل نظام ہے۔ جو لوح انسان کو اس کی چھینی ہوئی آزادی واپس دلانے کے لئے آیا ہے اور خدا کے سوا کسی انسان کو سزاوار نہیں کہ بندگان خدا کو اپنا محکوم اور غلام بنائے۔''

ڈاکٹر کیٹلر کے مطابق: میں نے آج تک ایسا مقرر دیکھا نہیں جس کی زبان میں مولانا کی زبان سے زیادہ مٹھاس ہو۔ میں نے جب بھی ان کی تقریر سنی ہے ہر بار محسوس کیا ہے کہ وہ کسی بھی موضوع پر بول رہے، زبان ان کے تابع ہوتی ہے۔ غالباً مولانا پہلے جلیل القدر مسلم رہنما تھے جنہوں نے اپنی زور قوت کے ساتھ ہندوستان کی متحدہ قومیت کا تصور پیش کیا اور اسے ہندوستان ملک کے عوام وخواص میں رائج وراسخ کرنے کے لئے اپنی تمام تر دینی، علمی اور استدلالی صلاحیتیں صرف کردیں۔ اور وہ اس طرح سیاست کے میدان میں اپنی مستقل مزاجی کے ساتھ قید وبند کی صعوبتوں کو برداشت کر کے حب الوطنی، یکجہتی کے اعلیٰ سے اعلی مثالیں پیش کیں۔ مولانا کے کارناموں میں ''غبار خاطر'' کو ایک اہم امتیازی مقام حاصل ہے۔ غبار خاطر مولانا کے اس خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے دوسری جنگ عظیم کی نظر بندی کے دوران مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کو لکھے۔ اس وقت مولانا احمد نگر (گجرات) کے قلعہ میں قید تھے۔ غبار خاطر میں جو خطوط شامل ہیں وہ خطوط نہیں بلکہ مختلف موضوع پر انشائیے ہیں۔ بڑی تعداد میں غبار خاطر کے خطوط نثری نظم کی تعریف پر پورے اترتے ہیں۔ غبار خاطر مولانا کے خطوط کا پہلا مجموعہ تھا جسے اجمل خان نے مرتب کر کے ۱۹۴۶ء میں شائع کیا۔ دوسرا مجموعہ کاروان خیال ہے جسے شاید خاں شروانی نے شائع کیا تھا۔ ان کے خطوط کا ایک اور مجموعہ برکات آزاد کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں مولانا سید سلیمان ندوی،

عبدالماجد دریابادی، نیاز فتح پوری، خواجہ حسن نظامی کے نام خط شامل ہیں۔

مولانا آزاد جنگ آزادی کے ایک عظیم سپوت ہی نہ تھے بلکہ ان کی شخصیت متنوع تھی۔ آپ نے صرف مسلمانوں کے لئے تعمیری سوچ وفکر رکھنے والے شعلہ بیان مقرر اور بیدار جید عالم دین ہی نہ تھے بلکہ انگریزوں کے خلاف لڑنے والے مجاہد آزادی کے لیے ایک حوصلہ مند سپہ سالار تھے۔ مولانا مسلمانوں کی نئی نسل کو قدیم تاریخ و تہذیب وتمدن سے روشناس کرانے والے مورخ بھی تھے اور کانگریس پارٹی کے لیے اندھیرے میں چراغ کی حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے زندگی کے آخری لمحے تک ملک وقوم کی خدمت کر کے ثابت کردیا کہ وہ ہندوستان کے سچے رہ نما ہیں۔ مولانا کی قومی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے گاندھی جی نے کہا تھا ''مولانا انڈین نیشنل کانگریس کے اعلیٰ ترین سردار ہیں اور ہندوستانی سیاست کا مطالعہ کرنے والے ہر ایک شخص کو چاہئے کہ وہ اس حقیقت کو جانے۔'' سیاست میں مولانا آزاد کا نظریہ خالص وطن پرستی اور ہندو مسلم اتحاد تھا۔ انہوں نے مذہب کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ مولانا نے سیاسی میدان میں قدم رکھا تھا تو کسی ذاتی مفاد یا نام ونمود کی خواہش کے لئے نہیں بلکہ ان کا خیال تھا کہ مسلمان جنگ آزادی کے مرکزی دھارے سے ذرا بھی ہٹتے ہیں تو اس سے ملک اور قوم کو نقصان ہوگا اور ملک میں نفرت کی دیوار کھڑی ہوجائے گی۔ انہیں تقریر میں وہ نہایت ہی جذباتی اور انقلابی تھے مگر ان کے سیاسی نظریات جذبات کی پیداوار نہیں تھے۔ مولانا کی شخصیت کا اعتراف کرتے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ ''میں سیاست کا طالب علم ہوں اور میں نے سیاست کی کتابیں ہندوستان میں سب سے زیادہ پڑھی ہیں۔ یوروپ کے دورے میں سیاست کا قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا اور میں سمجھتا ہوں کہ میں سیاست کے اعلیٰ ترین علم سے واقفیت حاصل کرلی ہے لیکن جب ہندوستان پہنچ کر مولانا آزاد سے باتیں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے بہت آگے ہیں۔''

طویل جدوجہد کے بعد جب ملک ہندوستان کو آزادی ملی تو ملک میں عبوری حکومت قائم ہوئی۔ ابتدا میں مولانا آزاد اس میں شریک نہیں تھے لیکن پنڈت جواہر لال نہرو کے اصرار پر حکومت میں شامل ہوئے اور ہندوستان کے پہلے وزارت تعلیم اور سائنسی تحقیقات کے قلمدان کی ذمہ داری بہ حسن وخوبی نبھائی۔ بقول مولانا آزاد ''وزارت تعلیم کی ذمہ داری سنبھالتے ہی میں نے پہلا فیصلہ جو لیا وہ یہ تھا کہ ہندوستان ملک میں اعلیٰ وفنی تعلیم کے حصول کے لیے سہولتیں فراہم کی جائیں تا کہ خود ہم اپنی ضرورتیں پوری کریں میں اس دن کا منتظر ہوں جب ہندوستان میں باہری ملک سے لوگ آکر سائنسی اور فنی تعلیم میں تربیت حاصل کریں۔''

ان مقاصد کی تکمیل کے لئے مولانا نے کئی اہم اور ٹھوس قدم اٹھائے چنانچہ کئی اداروں کا قیام عمل میں آیا۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو جی سی)، انڈین کونسل فار اگریکلچر اینڈ سائنٹفک ریسرچ، انڈیا کونسل فار میڈیکل ریسرچ، انڈین کونسل فار سائنس ریسرچ وغیرہ، سنٹرل کونسل فار انڈسٹریل ریسرچ ادارے کو متحرک بناتے ہوئے انہوں نے اس میں تحریک پیدا کیا اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس بنگلور کی توسیع و

ترقی کی، نشینل کونسل فار ٹکنیکل ایجوکیشن کے توسط سے ملک میں ٹکنیکل ایجوکشن کا جال بچھا دیا تاکہ ملک ترقی کرے۔ مولانا آزاد کا ایک اور بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے فنی (Comedy) تعلیم وتربیت کے لیے ۱۹۵۱ میں کھڑگ پور (بنگال) انسٹی ٹیوٹ آف ہائر ٹیکنالوجی کے قیام کو عمل میں لایا۔ مولانا آزاد آخری دم تک ملک کی اعلیٰ اور فنی تعلیم کے لئے ہمیشہ کوشاں وشانہ بہ شانہ رہے۔

مولانا آزاد کی اس کاوش کو دیکھ کر بالکل تازہ نظم جو جناب حسن نواب حسن، پٹنہ (بہار) نے یوم ولادت مولانا آزاد (۱۱ر نومبر ۲۰۱۹) کو انقلاب اخبار میں تحریر شائع ہوئی جسے آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں :

مرحبا کام بڑا کرکے دکھایا تم نے　　تیر کر پار کیا آگ کا دریا تم نے
کبھی طوفان سے کھیلے کبھی انگاروں سے　　کبھی موجوں کو بنا ڈالا کنارا تم نے
سنگ کو موم کیا خار کو گلزار کیا　　زد پہ طوفان کے چراغ حق کا جلایا تم نے
جو وطن چھوڑ کے آمادہ ہجرت تھے انہیں　　جذبہ حب وطن سے جگایا تم نے
اپنی تقریر میں کچھ درد کا اظہار کیا　　پھر بھی الزام کسی پر نہ لگایا تم نے
زخم غیروں نے تو کم، اپنوں نے کچھ زیادہ دیئے　　صبر اور ضبط سے فرض اپنا نبھایا تم نے
سیرت مصطفوی کے رہے پیرو ہر دم　　دشمنوں کا بھی کبھی دل نہ دکھایا ہم نے
تھے جو اولاد وطن حامی تقسیم وطن　　ان کے انجام کو آئینہ دکھایا تم نے
تم سے ہی باقی رہا امت مسلم کا وقار　　سب یہی حقدار برابر کے بتایا تم نے
ناؤ منجدھار میں آزادی کی جب الجھی تھی　　قومی یکجہتی کی حکمت سے نکالا تم نے

المختصر جدید ہندوستان میں ۱۹۴۷ سے ۱۹۵۷ء تک فنی تعلیم (Comey Education) کی سہولتوں اور ان سے استفادہ کنندگان کا جائزہ لیا۔ جو اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ مولانا کے دور وزارت میں اعلیٰ اور فنی تعلیم کے ارتقا کے لئے جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ رہتی دنیا تک ملک عزیز اور عوام اسے یاد رکھیں گے۔ نیز جدید ہندوستان کی تعمیر میں مولانا نے اہم کردار ادا کیا۔ عالم اسلام خصوصاً ہندوستان کی یہ روشن ترین شمع فروری ۱۹۵۸ء کو ۷۰ سال کی عمر میں گل ہوگئی اور دہلی کے پریڈ گراؤنڈ میں جامع مسجد اور لال قلعہ کے درمیان انہیں سپرد خاک کیا گیا۔

پھونک کر اپنے آشیانے کو　　بخش دی روشنی زمانے کو

Dr. Rehan Ahmad Quadri
Kashana E Faiz
Faiz Road
Moh. - Sarai Sattar Khan
P.o. Laheria Sarai, Darbhanga

ڈاکٹر راشدہ صدیقہ

شکیلہ اختر کی افسانہ نگاری

صوبہ بہار کی سرزمین اس معاملے میں خاص اہمیت رکھتی ہے کہ یہاں علمی اور ادبی فضا کو برقرار رکھنے میں خواتین نے بھی اپنی قلمی معاونت دی ہے۔ اردو شعر وادب کے علاوہ فکشن کے سلسلے سے بھی خواتین کی خدمات قابل ستائش رہی ہے۔ جہاں تک افسانوی ادب کی بات ہے تب یہ پہلو سامنے آتا ہے کہ شکیلہ اختر اس سلسلے سے خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ افسانوی ادب کے منظرنامے پر ان کی منفرد شناخت قائم ہے۔ آپ کا تعلق اس دور سے ہے جب عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، ہاجرہ مسرور اپنی فعالیت کا احساس کرانے میں کامیاب تھیں۔ شکیلہ اختر کا فنی اختصاص مذکورہ بالا خواتین افسانہ نگاروں سے بالکل جدا تھا۔ اس سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے :

> ''شکیلہ اختر کا دائرہ کار خاندانی معاملات اور معاشرتی موضوعات ہیں۔ اعلیٰ اور ادنیٰ متوسط طبقے کی گھریلو زندگی اور اس طبقے کے افراد کے باہمی معاملات کی پیچیدگیوں پر شکیلہ اختر کی نظر بڑی گہری ہے۔ وہ بہت باریک بینی کے ہمراہ مرد وزن کے تعلقات کی الجھنوں اور تہوں کا مشاہدہ اور مطالعہ کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں عام طور پر ان کی کہانیاں معمولی واقعات وحالات کے اندر چھپے ہوئے غیر معمولی جذبات واحساسات کا سراغ لگا لیتی ہیں، لیکن یہ مطالعہ حیات بہت صاف اور سیدھا اور فطری ہے۔................شکیلہ اختر کے طرز بیان میں سلاست سادگی اور روانی کا راز یہی ہے۔ وہ اپنی فطری حدود میں رہتے ہوئے پوری توجہ اپنے حقیقی موضوعات پر مرکوز رکھتی ہیں اور اسی مناسبت سے اپنے مطالعے کے نتائج بلا تکلف بالکل بے ساختہ انداز میں پیش کردیتی ہیں۔ اسی لئے شکیلہ اختر کے افسانوں کی اپیل دوسری خواتین افسانہ نگاروں کی بہ نسبت زیادہ عمومی اور ان افسانوں کا مطالعہ ہر طبقے کے پڑھنے والے زیادہ آسانی اور دلچسپی سے کرسکتے ہیں۔''
>
> (اردو فکشن میں خواتین کی خدمات، ڈاکٹر افسانہ خاتون، ص ۶۳)

اس طرح شکیلہ اختر اپنی انفرادیت کا لوہا منوانے میں کامیاب رہیں۔آپ کا سب سے پہلا افسانہ ''رحمت'' ۱۹۳۶ء میں رسالہ ''ادبِ لطیف'' میں شائع ہوا۔آپ کے کل چھ افسانوی مجموعے ''درپن''، ''آنکھ مچولی''، ''ڈائن''، ''آگ اور پتھر''، ''لہو کے مول'' اور ''آخری سلام'' ہیں۔آپ کے یہاں فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو آپ نے تمام فنی عناصر کی پیشکش پر خصوصی توجہ دی ہے۔ ماجرا سازی کردار نگاری فضا آفرینی پلاٹ سازی اسلوب بیان ہر اعتبار سے آپ کے افسانے قارئین کو متاثر کرتے ہیں۔

موضوعاتی اعتبار سے دیکھا جائے تو آپ نے مسلم متوسط گھرانے کی حقیقی تصویر پیش کرنے پر زیادہ توجہ دی۔جس طرح آپ کی کہانیوں میں گردوپیش کے حالات دیکھنے کو ملتے ہیں وہیں عورتوں کی نفسیات کی پیشکش میں بھی آپ کو دسترس حاصل ہے۔مختصر یہ کہ آپ کے یہاں داخلیت کو اہمیت حاصل ہے۔مختصر یہ کہ آپ نے گھریلو زندگی کے پیچ وخم کو بہت ہی سنجیدگی، سادگی اور سلاست کے ساتھ اپنی کہانیوں کا حصہ بنایا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب ہم ان کی کہانیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تب یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ ان کی کہانی کا پلاٹ کردار ماحول اور زبان سارا کچھ گھر کی چہار دیواری کے اندر کا ہے۔مختصر یہ کہ آپ انسانی زندگی خصوصی طور سے مسلم متوسط گھرانے کے مسائل کو افسانوی پیکر عطا کرنے میں مہارت رکھتی تھیں۔آپ نے عام افراد کے جذبات واحساسات کو اپنی کہانیوں میں جگہ دی۔اس سلسلے سے افسانہ ''ڈائن'' کا یہ اقتباس دیکھئے :

> ''بڑھیا کا منھ بے کسانہ طور پر پھٹ گیا اور اس کے سیاہ چہرے کی جھریوں میں چپچپاتے ہوئے آنسو پھیل گئے۔ بڑھیا نے اپنی لال لال آنکھوں سے گھور کر اپنی دیورانی کی حریص نظروں کو دیکھا جو ایک ٹک سے پلنگ پر دھرے ہوئے پیسوں کو تک رہی تھی۔ ای سوا گوروپیہ سے دن نہ کٹ جائی۔ گھر کے لوگوں نے ہزار جتن کئے کہ وہ کسی طرح سے پیسے لے لے، مگر بڑھیا کسی طرح سے بھی پیسہ چھونے کی روادار نہ ہوئی۔''

(افسانوی مجموعہ ''ڈائن'' شکیلہ اختر ص-۱۵)

عورتوں کی نفسیات کی عکاسی کے ساتھ ساتھ ان کی ذات بھی ان کی کہانیوں میں جلوہ نما نظر آتی ہے۔آپ کا فنی اختصاص کہا جائے گا کہ آپ نے اردو افسانے کو خواہ موضوع ہو یا فن نئے تجربے اور تکنیک سے ہم آہنگ کیا۔ یہ آپ کا ہنر ہی کہا جائے گا کہ آپ کی بیشتر کہانیوں کو پڑھ کر قارئین ان کی ذات کی موجودگی کا احساس کرنے لگتے ہیں۔اس سلسلے سے پروفیسر وہاب اشرفی فرماتے ہیں :

> ''شکیلہ اختر کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ اپنی ذات کے کرب کو وسعت دے

> کر ہمہ گیر بنا دینے کی بے پناہ صلاحیت رکھتی ہیں اس کی ایک مثال ان کا افسانہ آنکھ مچولی ہے۔ آٹو بایوگرافیکل زمرے کا یہ افسانہ شکیلہ اختر کی اپنی کہانی بھی ہے اور اس قماش کی دوسری نامراد عورتوں کی بھی۔ یہاں داخلیت کا احاطہ بہت وسیع ہو گیا ہے اور نامرادی کے احساسات ہمہ گیر بن گئے ہیں، لیکن جہاں اپنی ذات سے متعلق کوئی المیہ نہیں ہے وہاں بھی احساسات کی تیز آنچ محسوس کی جاسکتی ہے۔ پیاسی نگاہیں، آگ اور پتھر، ننگی آنکھیں، بھٹکی ہوئی منزل اور کئی دوسرے افسانے میرے مطالعے کو تقویت دیتے ہیں۔''

(تاریخ ادب اردو جلد سوم، وہاب اشرفی ص-۱۱۸۸)

مختصر یہ کہ شکیلہ اختر نے اپنی کہانیوں میں جہاں عورتوں کی نفسیات کو اہمیت دی وہیں بہار کے ماحول اور فضا کو بھی فوقیت عطا کرتی نظر آتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ آپ کی کہانیوں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اگر بہار کو جاننا ہے تو شکیلہ اختر کی کہانیوں کا مطالعہ کیا جائے۔

مذکورہ بالا اقتباس کے حوالے سے میں نے عورتوں کی نفسیات ان کی محرومی اور افسانہ نگار کے ذاتی کرب کی پیشکش افسانوں میں کس طرح ہوئی ہے اس ضمن میں مزید معلومات فراہم کرانے کی کوشش کی ہے، لیکن شکیلہ اختر کے افسانے جہاں احساسات وجذبات کی نمائندگی کرنے میں اپنی اہمیت درج کراتے ہیں وہیں آپ کے افسانے اس معاملے میں بھی قارئین کو اپنا گرویدہ بناتے ہیں کہ یہاں قصہ کی دلچسپی پلاٹ سیدھے سادے کردار جانے پہچانے اور مکالمے بھی سلیس ہوتے ہیں۔لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ آپ نے اپنی کہانیوں کے ذریعہ موضوعات اور اسلوب کے ساتھ ساتھ افسانوی فن کی پیشکش میں اپنی فنی ہنرمندی کی بہترین مثال پیش کی ہے۔آپ کی کہانیاں پڑھ کر ہم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ آپ کو فن پر گرفت حاصل ہے۔مختصر یہ کہ آپ معمولی واقعات کے سہارے افسانے کو ایک نہج دیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ معمولی واقعات بھی غیر معمولی بن جاتے ہیں۔آپ کا مشاہدہ گہرا ہے اور نگاہیں بھی گہری ہیں۔ایک افسانے کی کامیابی اس پہلو میں بھی ہوتی ہے کہ پڑھنے والے کی شروع سے آخر تک دلچسپی برقرار رہے اس معاملے میں بھی شکیلہ اختر کی کہانیاں سبقت لے جاتی ہیں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ ایک دردمند دل رکھتی ہیں جس باعث آپ نے اپنی کہانیوں میں مظلوم ومقہور طبقوں کو جگہ دی ہے۔اس پر اضافہ یہ کہ آپ ذات کے کرب کو ہمہ گیر بنانے میں بھی دسترس رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی کہانیوں کو ہم صرف افسانہ طرازی نہیں کہہ سکتے بلکہ آپ کی کہانیاں

معاشرے کی حقیقی تصویر ہے مختصر یہ کہ آپ کی کہانیوں میں مسلم متوسط گھرانے کے بے رنگ افراد اپنی تمام تر افسردگی کے ساتھ ابھرتے نظر آتے ہیں۔ اس پیشکش کے لئے شکیلہ اختر نے مقامی رنگ اور ماحول کے ساتھ ساتھ مقامی بولیوں کا سہارا بھی خوب لیا ہے۔

تمام باتوں کی روشنی میں کہا جائے گا کہ شکیلہ اختر کا عہد اردو افسانے کے تعلق سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ عصمت اور قرۃ العین حیدر کی موجودگی کے باوجود انہوں نے اپنی فنی ہنرمندی کا لوہا منوایا۔ میں اپنی بات پروفیسر وہاب اشرفی کے اس قول پر ختم کرنا چاہوں گی ملاحظہ کیجئے :

> ''اردو افسانہ کے مجموعی ارتقا کے لحاظ سے بھی اور بہار میں اردو افسانے کی بتدریج ترقی کے نقطہ نظر سے بھی شکیلہ اختر کے افسانے غیر معمولی امتیازات کے حامل ہیں۔.....................ان دونوں بڑی افسانہ نگاروں کے مابین خارجیت اور داخلیت کی دیوار حائل ہے۔ عصمت چغتائی اڑوس پڑوس کی کھڑکیوں میں جھانکتی ہیں تو شکیلہ اختر دلوں کو ٹٹولنا چاہتی ہیں .... پھر عصمت چغتائی ایک ترقی پسند موقف کے پالے میں اسیر ہیں جب کہ شکیلہ کے پاؤں میں کوئی بیڑی نہیں وہ ہرن کی طرح چوکڑیاں بھر سکتی ہیں۔''
>
> (بہار میں اردو افسانہ نگاری، پروفیسر وہاب اشرفی ص-۲۱-۲۰)

Dr. Rashdah Siddiqua
Imam Ali Lane
Barahpura
Bhagalpur - 822 001

شبنم مرزا

مناظر عاشق ہرگانوی کے تجربے، مشاہدے کا عصری عکس

''آنکھوں دیکھی'' کا مطالعہ بہت متاثر کن رہا۔ اس کے پڑھنے سے یقیناً ہر قاری اسے اپنی ''آنکھوں دیکھی''، ظلم و بربریت تسلیم کرنے پر مجبور ہوگا۔ بھاگلپور کی سچائیوں کو اس بیباکی اور جرأت سے Eye witness کے روپ میں منظر عام پر لانا یعنی Publish کرنا ہی ایک بہت بڑا Risk ہے۔ اس کتاب سے فساد کی سچّائیوں کو جاننے کے بعد یہ احساس ہوا کہ آج بھی لوگ سچ کی ہمّت رکھتے ہیں ورنہ ......! ایسی سچّائی پر ایک شعر یاد آیا۔

آج کے دَور میں سچ کا چہرہ
آگ میں جیسے پھول کھلا ہو !

''آنکھوں دیکھی'' بارود، شعلوں، انسانی چیخوں، خون اور لاشوں سے نکلی ہوئی ایک ایسی حقیقت ہے جو پڑھتے وقت ضمیر کو گھائل کرتی ہے۔ کبھی بَرچھی بھالوں سے، کبھی بارود اور شعلوں سے اور......اور کبھی ننگی سڑکوں پر دھڑا دھڑ کٹتے ہوئے بے قصور انسانی وجود سے جلا اور لٹا ہوا سرمایہ، ہزاروں بے گھر لوگ، معصوم بچّوں کے دہلتے ہوئے کلیجے، ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے روندے ہوئے سیندور (شاید آسمان بھی دہل گیا تبھی تو سورج بموں کے کالے دھوئیں میں جا چھپا!) انسان...... یا یہ آج کا انسان، چاند کا فاتح اے انسان تو ہاں تو......!

تو اُٹھا پہلے یہاں گرتے ہوئے انسان کو
بعد میں گرجا اُٹھا مسجد اُٹھا مندر اُٹھا !

''آنکھوں دیکھی'' کے سرورق کا بار بار جائزہ لینے یوں محسوس ہوا گویا فساد میں کٹی ہوئی لاشوں کو کفن پہنا کر اس سرورق میں دفن کر دیا گیا ہے۔ جہاں سفید کفن سے اب خون بَہہ رہا ہے۔ بہتا رہے گا، بہتا ہی رہے گا۔ ہزاروں سالوں تک، لاکھوں صدیوں تک اور اب دھیرے دھیرے خون کی یہ سرخی ہر قاری کے ضمیر کو رنگے گی، ہر ضمیر روئے گا اور ان شہیدوں کے قصوروں کو تلاش کرنے پر مجبور ہوگا۔ (لیکن افسوس......! صد افسوس ہزار افسوس وہ تو تمام بے گھر ہو گئے، بچھڑ گئے، کوئی اس گلی میں شہید ہوا۔ کوئی اس چوراہے پر جلا دیا گیا تو کوئی بم کے دھماکوں سے اُڑا دیا گیا۔ کیونکہ ان کے گناہ صرف یہ تھے کہ وہ بے قصور تھے!)

کتاب کی ابتدا میں ''قلم کے آنسو'' کے عنوان سے جو پس منظر قلم بند کیا گیا ہے وہ بار بار ذہن کو لفظی خنجروں سے زخمی کرتا رہتا ہے۔ تاایں کہ روح بھی زخمیدہ ہوکر، بچے ہوئے اس قافلے، ان لوگوں، کے متعلق سوچنے پر مجبور نہ ہو جائے......جنہوں نے اپنے آپ کو اس ''پل سراط'' سے گزارا اور بچ گئے۔ وہ یقیناً شہید ہوکر قیامت سے پہلے دوبارہ اپنی اپنی قبروں سے اُٹھائے گئے ہیں۔

کتاب کی ابتدائی نظم ''آدم برگزیدہ کے خالق'' نے بے حد متاثر کیا۔ اس معصوم نظم کو پڑھ کر یہ محسوس ہوا گویا خدائی طاقت نے اپنی فیض بشارت سے کسی ایک کی دعا ضرور سُن لی۔ تبھی باقی تمام لوگ بچا دیئے گئے۔ ویسے ہر نظم نے ذہن پر کچھ ایسے منظر اور تاثر نقش کئے ہیں جو سالوں اور صدیوں تک نقش در نقش اُبھرتے رہیں گے۔ اور انسان کو سوچنے پر مجبور کرتے رہیں گے :

''آنگن سے گُم ہیں سارے گیت/ پیلے پتّے میں سوئی ہے ہریالی/ بکھرے
ہیں سارے سپنے/ ٹھہر گئی ہیں/ دن کی ساری خوشیاں/ ڈر کر بھاگ رہا ہے
سورج/ اور چھُپا سہا سا چاند!/ املی/ آم اَمرود/ اور پھولوں کے پودوں میں
بھی/ انہیں پہلا سا روپ/ گونگا سا لگتا ہے کھلا آسمان/ دنگائی پھر آئیں
گے/ ایسا ہے انتظار!/ دیکھتے دیکھتے ٹہنیاں چڑیاں ہوگئیں/ چڑیا ہوا ہوگئی/
ہوا سمندر ہوگئی/ سمندر بادل ہوگیا/ بادل اس شہر کے قلب میں/ صفر بن گیا/
صفر میں رینگتے ہوئے ہم/ کھڑکی کھول کر/ جھانک رہے ہیں/ یہ ہم ہیں/ آج
کے ہم/ فسادی!

....

ہریالی یہاں دھوئیں اور راکھ کی شکل میں/ اُڑ رہی ہے!/ لوگ ایک دوسرے
کو/ کوشش کے باوجود نہیں پہچان پاتے/ کبھی کبھی تو جھنجھلا کر/ اپنے ہی منھ پر
تھپڑ مار لیتے ہیں/ مکّھیوں کی طرح بِھنبھناتے/ اور پاگلوں کی طرح چلّاتے
ہیں/ کچھ بھی نہیں رہ گیا ہے کہیں/ فساد کے بعد!

....

آج کچھ زیادہ اندھیرا ہے/ ہوا بوکھلائی ہوئی ہے/ کرن باغی ہوگئی ہے/ آنگن
کا درد بڑھ گیا ہے/ ہر طرف لاشیں بکھری پڑی ہیں/ کسی جسم پر کوئی چہرہ/
سلامت نہیں ہے!

مندرجہ ذیل صفحات کی نظمیں بھی بیحد متاثر کن ہیں :

''۱۳، ۱۸، ۴۹، ۵۷، ۶۸، ۷۸، ۷۹، ۸۴، ۸۸، ۸۹، ۹۱، ۹۲، ۹۵، ۹۹/ اور ۱۰۰

ان نظموں کو پڑھ کر بخوبی اَندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شاعری سے آگ کیسے لگائی جاتی ہے، خوف، ڈر اور ہَراس کو کیسے ختم کیا جاتا ہے اور بے ضمیر انسانوں کے ضمیر کو کیسے جگایا جاتا ہے۔ ان نظموں کا اگر اثر لیا جائے تو تاریخ کا رُخ موڑا جا سکتا ہے اور یک جہتی و بھائی چارگی کی نئی تاریخ مرتّب کی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے بھوگے ہوئے حالات کو احساس بنا کر، درد بنا کر، عہد بنا کر، ملک بنا کر اور قرض بنا کر ان نظموں کی شکل میں اقوام کے سامنے پیش کر دیا ہے کہ کہر آلود فضا اور فرقہ واریت کے عَفریت کو سمجھو اور اس سے بچنے کی کوشش کرو کیونکہ تخریبی قوتیں حالات کا، بے گناہوں کا اور ہنستے لوگوں کا استحصال کر کے انہیں قتل کر کے بھی اپنا اُلّو سیدھا کرتی ہیں۔ ایسا کچھ ہونے سے صرف چند کا بھلا ہوتا ہے۔ یہ چند لوگ ملک کے سنہرے خواب کو بکھیرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

دراصل ''آنکھوں دیکھی'' کے ذریعہ مناظر عاشق ہرگانوی فرقہ وارانہ فساد جیسے زندگی کے منفی پہلو کو نفی کر کے اثبات کی قوتوں کو عیاں کرنا چاہتے ہیں اور ہر طبقے اور ہر مذہب کے انسانوں کی نفسیاتی پَرتوں کو اُلٹتے پُلٹتے ہوئے ان کے اندر چھُپے ہوئے اس انسان کو برآمد کر لینا چاہتے ہیں جو عام نگاہوں کے سامنے بھی ہیں اور پوشیدہ بھی ہیں۔ یہ نظمیں صرف نظمیں ہی نہیں ہیں بلکہ تاریخ کا کرب ناک باب ہیں اور تجربے و مشاہدے کے عصری نقوش ہیں!

Shabnam Mirza
Flat no. 43, 2nd floor
Anuradha Housing Society
Near - Mohan Thearter
Malegaon (Nasik) 423 203

عبدالقادر

ادب اطفال اور روایت کی کچھ جھلکیاں

بچوں کا ادب تخلیق کرنا آسان نہیں بلکہ خاصا دشوار کام ہے۔ یہ کام وہی انجام دے سکتا ہے جو بچوں کی نفسیات سے بخوبی واقف ہو۔ ان کے مزاج، ان کی طبیعت، ان کے اذہان، ان کے شعور، ان کی دلچسپیاں، ان کی شوخیاں غرض تمام باتیں اس پر آئینہ ہوں۔ اسے اس بات کا بخوبی علم ہو کہ کس عمر کے لڑکے کیسی چیزوں کو کس زبان میں پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ بچوں کا ذہن عموماً کچا اور ناپختہ ہوتا ہے۔ ان کا شعور غیر ترقی یافتہ ہوتا ہے۔ ان کے ذہن میں چلبلا پن ہوتا ہے۔ وہ کسی ایک مسئلہ پر زیادہ دیر تک اپنی توجہ مرکوز نہیں رکھ سکتے۔ انھیں ایسی چیزیں زیادہ پسند ہوتی ہیں جو ہر لمحہ بدلتی رہتی ہیں۔ جن میں حرکت ہوتی ہے وہ اسے مزہ اور لطف لے کر پڑھتے ہیں۔ انھیں حیات و کائنات کے دقیق مسائل سے الجھن ہوتی ہے وہ انھیں ''سمجھ نہیں سکتے۔ وہ تو ایسی کہانیاں پسند کرتے ہیں جو ہلکی پھلکی اور قابل فہم ہوں۔ لیکن ساتھ ہی جن میں ان کے جذبات کو پیدا کرنے کی قوت بھی ہو جو ان کی خواہشات اور ہیجان کی تسکین کا باعث ہو بچے حیرت اور استعجاب میں ڈالنے والے واقعات میں غیر معمولی دلچسپی دکھاتے ہیں۔ انھیں ایسا ادب پسند ہوتا ہے جو اپنے اختتام پر طربیہ ہو۔ المیہ انجام انھیں پسند ہوتا ہے اور نہ ہی وہ اسے پڑھنا چاہتے ہیں۔ بچوں کے ادیبوں کے ساتھ ایک دشوار گزار مرحلہ ہوتا ہے۔ انھیں زبان و بیان کے معاملے میں بہت زیادہ محتاط رہنا پڑتا ہے۔ ادق اور غیر مانوس الفاظ بچوں کی دلچسپی میں رکاوٹ پیدا کر سکتے ہیں۔ بچوں کے ادب کے لیے ان میں زبان ویسی ہو جو آسان اور عام فہم ہو۔ الفاظ سیدھے سادے اور سامنے کے ہوں۔ زبان صاف اور ستھری ہو اس میں سلاست و روانی ہو۔ آسان زبان کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ ادبی سطح سے گری ہوئی ہو۔ بازاروں اور گھٹیا زبان ادب پیدا نہیں کر سکتی۔ بچوں کے ادیبوں اور شاعروں کے سامنے دوسرا مسئلہ درپیش ہوتا ہے کہ وہ کس قسم کے موضوعات کو پیش کریں موضوع یا خیال کی پیش کش میں انہیں بچوں کے پسند اور ناپسند کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ یہ عام مشاہدہ ہے کہ بچے اپنی ذات کو زیادہ جاننا چاہتے ہیں لہٰذا ادیبوں کو ایسے موضوعات کا انتخاب کرنا چاہیے جو بچوں کی ذاتیات سے زیادہ سے زیادہ تعلق رکھتے ہوں پھر ان کے ذہن کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ لہٰذا بچوں کے ادب کی تخلیق میں وہی فنکار یا ادیب کامیاب ہو سکتا ہے جو مذکورہ باتوں کو ملحوظ رکھے۔ اس ضمن میں منیر المحوی صدیقی رقم طراز ہیں :

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

''اس حقیقت سے کوئی انکار کر سکتا ہے کہ بچوں کے لیے لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بچوں کے ادب کے لیے قلم اٹھانے سے قبل بہت غور و فکر کے مراحل طے کرنے پڑتے ہیں۔ بچوں کے لیے لکھتے وقت مشکل اور غیر مانوس الفاظ تراکیب، تلمیحات اور استعارات سے گریز کرنا پڑتا ہے۔ زبان نہایت صاف ستھری، آسان اور عام فہم استعمال کرنی پڑتی ہے۔ عام فہم اور آسان اتنی نہیں کہ بازارو اور گھٹیا بن جائے۔ زبان میں سلاست ہو، روانی ہو، جمود اور سکوت نہ ہو، بچوں کی نفسیات کا گہرا مطالعہ لازمی ہے۔ بچوں کی ناپسند اور رغبت اور دلچسپی کو مدنظر رکھنا اور بچوں کے شعور اور ذہن و مزاج سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔ جن موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہو وہ خالص بچوں کی ذات اور ان کی نفسیات کے مطابق ہوں۔ بچوں کے معیار سے بلند و بالا خیالات اور مشکل الفاظ بے معنیٰ ثابت ہوتے ہیں۔ اس فن میں وہی شاعر اور ادیب کامیاب ہو سکتے ہیں جنھوں نے ان باتوں کو مدنظر رکھا اور بچوں کے لیے قلم اٹھایا۔''

(اقبال اور بچے : ص ۵۱)

مذکورہ بالا امور کی روشنی میں جب ہم اردو کے قدیم ادبی سرمائے پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں مایوسی ہوتی ہے۔ اردو میں بڑوں کے لیے جہاں شعر و ادب کا وقیع ذخیرہ ملتا ہے وہاں بچوں کے ادب میں خاصی چشم پوشی برتی گئی ہے۔ اگر اس ضمن میں اکا دکا کتابیں بھی نظر آتی ہیں تو وہ انتہائی ناقص اور بچوں کے ادب کے مقتضیات کی منافی ہیں نہ ان میں بچوں کی نفسیات کا خیال رکھا گیا ہے اور نہ ہی ان کی پسند و رغبت کا لحاظ۔ ان کتابوں کا مقصد صرف یہ ہے کہ بچوں کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کیا جائے۔ ان کو زبان سکھانی چاہیے۔ البتہ اس بات کا لحاظ ضرور رکھا گیا ہے کہ الفاظ اور اس کے معنی ایسے پیرائے میں پیش کیے جائیں کہ وہ بچوں کی زبان پر چڑھ جائے۔ نظم سے زیادہ موزوں اس مقصد کے لیے اور کوئی طریقہ نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ الفاظ اور اس کے معنیٰ کو موزوں کر دیا گیا تاکہ وہ جلد ہی بچوں کے ذہن نشیں ہو جائیں۔ ایسی کتابیں جو الفاظ کی فرہنگ پر مشتمل تھیں بچوں کے لیے قدیم نصاب کا کام بھی انجام دیتی تھیں۔

بچوں کے لیے لکھی جانے والی کتابوں میں ''خالق باری''، ''نصاب الصبیان''، ''منتخب الحکایات'' اور ''قادر نامہ'' وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف ادیبوں اور شاعروں نے اپنی نثری تخلیقات اور نظموں کے ذریعے ادب اطفال کو مالا مال کیا ہے۔

بچوں کے شعری ادب کی روایت اپنی کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے تشفی بخش ہے۔ چنانچہ امیر خسرو

ISSN. 2582 - 3612

سے لے کر آزادی ہند کے بعد شعرا سبھوں نے اس ذیل میں کاوشیں کی ہیں اور بچوں کے شعری ادب میں اپنی گرانقدر تخلیقات سے بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ لیکن اس کا دائرہ اتنا وسیع اور پھیلا ہوا ہے کہ ان کا احاطہ کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بچوں کے لیے بہت ساری کتابیں لکھی اور تصنیف کی گئی ہیں، ترجمے بھی ہوئے۔ دوسری زبانوں کے ادبیات سے استفادہ بھی کیا گیا ہے۔ بچوں کی فطرت، نفسیات اور ان کی پسند، معیار اور مزاج کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ بات لازمی طور پر کھٹکتی ہے کہ اردو میں کتابوں کی اشاعت کا معیار بہت پست ہے۔ ہندوستان ہی کی دوسری زبانوں کو لے لیجیے تو اردو زبان اور ان کا فرق واضح ہو جائے گا۔ اردو میں کتابیں جو شائع ہوتی ہیں ان کی چھپائی نہایت معمولی ہوتی ہے۔ کاغذ بھی اچھے استعمال نہیں کیے جاتے ہیں۔ گٹ اپ بھی عموماً بقدر اور بے جان ہوتا ہے۔ انجام کار یہ کتابیں مواد اور زبان کے اعتبار سے اچھے ہونے کے باوجود اپنی کشش اور جاذبیت کھو دیتی ہیں۔

اختصار کے ساتھ اگر کہا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بچوں کے لیے لکھنا ایک الگ آرٹ ہے۔ یہاں لکھتے وقت قلم کار کو خود بچہ بننا پڑتا ہے۔ بالغوں کے موضوعات اگر آسان زبان میں لکھ کر بچوں کے آگے ڈال دیے جائیں تو یہ بچوں کے ساتھ سخت ناانصافی ہوگی۔ بچوں کا ادب ایک خاص ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ جہاں بچوں کے اپنے حقوق ہوتے ہیں، اپنی دنیا ہوتی ہے مگر اکثر ایسا ادب تیار ہوتا رہا ہے کہ اس سے بچے جلد بالغ ذہن بن جائیں۔ آج کل بچوں سے ان کا معصوم بچپن اس بے دردی سے چھینا جا رہا ہے کہ ان کی فطرت کراہ اٹھی ہے۔ افسوس کہ معلومات میں اضافہ کرنے والے ادب کو ہی ارباب نظر نے ادب اطفال کے نعرے میں ڈال دیا ہے۔ ماں باپ اور بچوں کے لکھنے والوں کو ان باریکیوں کی جانب غور کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ تب کہیں بچوں کا صحیح ادب جنم لے سکے گا۔

Abdul Quadir
Research Scholar
Deptt. of Urdu
J. P. University
Chapra

محمد شبیر عالم

حنیف ترین کی نظم نگاری : اجمالی جائزہ

ان کا اصل نام حنیف شاہ خان ترین اور قلمی نام حنیف ترین ہے۔ ان کی پیدائش سنبھل ضلع مراد آباد میں ہوئی۔ ان کا تعلق میڈیکل سائنس سے رہا ہے۔ انہوں نے ڈائرکٹر پری وینٹو میڈیسن اور کوارنٹائن اسپیشلسٹ کی حیثیت سے اپنے فرائض کو انجام دیا، لیکن اردو زبان سے ان کا لگاؤ اس طرح رہا کہ ۱۹۸۵ء سے حال تک اردو کی خدمت میں سرگرم عمل ہیں۔ ان کے شعری مجموعے اس طرح ہیں :

> ''رباب صحرا (۱۹۹۲ء) کتابِ صحرا (۱۹۹۵ء) کشت غزل نما (۱۹۹۷ء) زمین لاپتہ رہی (۲۰۰۱ء) ابابیلیں نہیں آئیں (۲۰۰۳ء) روئے شمیم پہ فرحت بہتی رہتی ہے (۲۰۰۸ء) باغی سچے ہوتے ہیں (۲۰۰۹ء) پس منظر میں منظر بھیگا کرتے ہیں (۲۰۱۱ء) لالۂ صحرائی (۲۰۱۳ء) ستیہ میو جے تے (۲۰۱۷ء) اور دلت کو یتا جاگ اٹھی (۲۰۱۸ء)۔ ان کے شعری مجموعے اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ انہیں اردو شعر و ادب سے خاصی دلچسپی ہے۔''

اردو شاعری کے منظرنامے پر حنیف ترین ایک ایسا نام ہے جنہوں نے عالمی سطح پر اپنی منفرد شناخت بنائی ہے۔ ان کی نظموں میں جہاں موضوعات کا تنوع ہے وہیں آفاقی اور عالمی تناظر بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عالمی آفاقی مسائل پر جس انداز سے انہوں نے اپنے تخلیقی احساس کو اظہار کا پیرہن عطا کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ وہ اپنے داخلی کرب کی ترسیل ہر اس حساس انسان تک کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن کے دل میں سوز و گداز ہے۔ ان کی نظمیہ شاعری کا کینوس بہت ہی وسیع ہے۔ اپنی نظموں میں حنیف ترین نے ذہنی تبدیلیوں اور عالمی سطح پر ہونے والے ردعمل کو سمونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس کی خاص وجہ ہے کہ وہ اپنی نظموں میں دنیائے انسانیت کے حقیقی واقعات کو پیش کرنے پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان کی نظمیں جدید رجحانات اور روز افزوں بدلتے ہوئے حالات کا حسین امتزاج معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی نظموں میں تجربات کی کثرت مشاہدات کی شدت احساسات کی نزاکت اور خیالات کی ندرت دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ سوز و ساز امید و بیم اور خوشی و غم کی جھلکیاں بھی موجود ہیں۔ ان تمام خوبیوں کی بنا پر ہم کہیں گے کہ حنیف ترین اردو نظم کے زندہ رخشندہ اور پائندہ ترین سخن ور ہیں۔

ان کی نظم نگاری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کی نظموں میں بیداری کی کیفیت دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ اس لئے کہ زندگی کی حقیقت پر ان کی گہری نگاہ رہتی ہے۔ کیوں کہ یہ ایک حساس فنکار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں تازگی، وسعت، تنوع، تہہ داری اور حقیقت پسندی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کی نظمیں پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ پوری دنیا سانس لے رہی ہے۔ ان کی نظموں میں احتجاج کی کیفیت بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس احتجاج میں شدت اور تہہ داری بھی موجود اس کی خاص وجہ ہے کہ ان کا شعور کافی گہرا ہے۔ زمانے کے نشیب وفراز سے بھی یہ نظمیں ہمیں بہرہ ور کرتی ہیں۔ اور حالات حاضرہ پر غور وفکر کی دعوت دیتی ہیں، لیکن روشن مستقبل اور سنہرے خوابوں کی آگہی بھی دیتی ہیں۔

ان کی نظموں کے مطالعہ کے بعد یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ وہ انانیت کی پاسداری کی خاطر زیادہ متفکر نظر آتے ہیں۔ ویہی وجہ ہے کہ ان کی نظمیں دل کی آواز بن گئی ہیں وہ ظلم کو ختم کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر انسانیت زندہ ہے تو چاہئے کہ ظلم و بربریت کا اصلی چہرہ بے نقاب کرے۔ مختصر یہ کہ ان کی نظموں میں ظلم و بربریت پر اس طرح افسردگی کا اظہار ملتا ہے کہ پڑھنے والا بھی اس غم میں خود کو شریک کر لیتا ہے۔ اس کی خاص وجہ ہے کہ حنیف ترین کی نظموں میں پاکیزہ انسان دوستی اپنی تمام تر صداقتوں کے ساتھ موجود نظر آتی ہے۔ بین الاقوامی سیاست پر ان کی گہری نظر ہے اور اسی لئے ان کا ادبی کینوس وسیع ہے۔ ذہن کی وسعت ہر جگہ جلوہ نما رہتا ہے۔

جس طرح ان کی نظموں میں احساس کی شدت موجود ہوتی ہے وہ اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ وہ زندگی اور معاشرے سے جڑے ہر مسئلے کو نظموں کا حصہ بنانا خوب جانتے ہیں۔ ان کی نظمیہ شاعری کے سلسلے سے یہ بھی کہا جائے گا کہ ان کی نظموں میں فکر وفن کی بہترین آمیزش ہے۔ وہ جس طرح سے زمانے کی ناہمواریوں کو دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں بالکل اسی طرح اس کیفیت کو نظموں کا حصہ بناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پہلے مجموعے سے لے کر آخری مجموعے تک زبان و بیان کے ساتھ فکری بالیدگی اور وسعت نظر کی ارتقائی صورتیں صاف طور سے دکھائی دیتی ہیں۔ خواہ موضوعات کی پیش کش ہو یا اسلوب بیان دونوں اعتبار سے ان کی نظمیں اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کی نظمیں ہمیں زندگی جینے کا ہنر سکھاتی ہیں۔ اس سلسلے سے پروفیسر گوپی چند نارنگ کا خیال دیکھئے :

> ''جہاں تک حنیف ترین کی شاعری اور خصوصاً ان کی نظموں کا تعلق ہے تو یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ نظم نگار کی حیثیت سے ان کا مستقبل حوصلہ افزا ہے...... مجھے یہ کہنے میں کوئی تکلف نہیں کہ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں اور نظم کا کینوس غزل سے زیادہ وسیع ہے۔ حنیف ترین کی امیجری

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

> اور ان کے موضوعات میں تنوع ہے۔''
>
> (شعری مجموعہ 'کتابِ صحرا' حنیف ترین، ص۱۲-۱۱)

حنیف ترین کی نظموں کو جب ہم پڑھتے ہیں تب یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ ان کی تحریر کردہ چند رومانی نظموں میں بھی فکر اور ماضی کی نوحہ گری موجود ہے مطلب یہ کہ محبوب کی اداؤں کے ذکر کے ساتھ ساتھ تہذیب و ثقافت کی پاسداری پر بھی مزید روشنی ڈالتے ہیں۔ کیوں کہ محبوب کی اداؤں میں بھی فکر کا سرچشمہ لبریز رہتا ہے۔ ان کی نظمیہ شاعری کا اولین مقصد حالات سے بہرہ ور کرنا ہے اور اسی لئے ان کی نظمیں پڑھ کر جہاں ہم حالات سے باخبر ہوتے ہیں وہیں حالات کے تئیں فکر مند بھی ہوتے ہیں۔ ان کی نظم ''سچے باقی رہ جاتے ہیں'' خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس نظم میں حنیف ترین نے اپنے خیالات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ پڑھنے والا بھی سچ کی اہمیت کا قائل ہو جاتا ہے۔ آج صورتحال یہ ہے کہ مقصد کے آگے سچ اور جھوٹ کا فرق ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف قارئین کو رجوع کرانے کے لئے حنیف ترین نے یہ نظم تخلیق کی ہے۔ پوری نظم میں شاعر نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ہر وہ ایجاد اور عمل سچائیوں اور خوشیوں کے عین مطابق ہو۔ ایسا نہیں کہ ہمارا کوئی کارنامہ اور ایجاد خوں ریزی کا سبب بن جائے۔ مختصر میں ہم یہ کہیں گے کہ یہ نظم پوری عالم انسانی کے لئے سبق بھی دیتی ہے اور بہتر عمل کرنے کی دعوت بھی دیتی ہے۔ نظم کا آخری بند ملاحظہ کیجئے

یہ دنیا
یہ پیاری دنیا
شعلہ شعلہ ہو جائے گی!
اس سے پہلے آؤ لوگو!
ہم اچھوں کو تسلیم کریں
ہم بچوں کی تعظیم کریں
جب جھوٹ فنا ہو جاتا ہے
سچے باقی رہ جاتے ہیں!

نظم ''سوچ'' میں حنیف ترین نے سوچ کے کئی زاویے بیان کئے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ سوچ لہو کو پیئے گی، سر کے بالوں کو سفیدی عطا کرے گی، ماتھے پر پسینہ کی شکل میں آئے گی، یہ سوچ آنکھوں کی نمی پی کر بڑھے گی، یہ ارادوں میں پرورش پائے گی، آنکھوں کی نیندیں چھین لے گی، پلکوں کو جلن دے گی، بھری محفل میں یہ سوچ فرد کو تنہا چھوڑ دے گی اور یونہی زندگی میں ساتھ ساتھ چل کر یہ سوچ بالآخر کندن بن جائے گی۔

اس نظم کے ابتدائی اور درمیانی حصے میں سوچ کے منفی اثرات کو شاعر نے سلسلہ وار ڈھنگ سے

ISSN. 2582 - 3612

پیش کیا ہے، لیکن آخری دو شعر میں سوچ کی اہمیت پر مزید روشنی ڈالی ہے۔ ہمیں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ سوچ بھی ہمارے لئے کافی اہمیت رکھتی ہے۔ اس سلسلے سے نظم کا آخری دو شعر ملاحظہ کیجئے ؎

یونہی تا عمر تیرے ساتھ جب ہنس کر چلے گی — تو گونگی سوچ یہ کندن بنے گی
حیات نو کے ہر اک زاویے کو — کسی دن تجھ پہ یہ روشن کرے گی

اس نظم میں حنیف ترین نے بہت ہی کامیاب ڈھنگ سے سوچ کے ہر زاویے کو پیش کیا ہے۔ حنیف ترین نے جس طرح دنیا کا مشاہدہ کیا ہے اور اپنی نظموں کا حصہ بنایا ہے کہ قارئین ان کے جذبات واحساسات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا ہے۔ مختصر یہ کہ حنیف ترین کی نظمیں۔ ''سچے باقی رہ جاتے ہیں''، ''سوچ''، ''زہریلی ناگن''، ''عرفان''، ''ایسا کیوں ہوتا ہے'' اور ''باغی سچے ہوتے ہیں''۔

زمانے اور زندگی کی ابتری کا نوحہ بیان کرتی ہیں۔ بلکہ شاعر کے احساسات وجذبات نے کس طرح انہیں قلم کو جنبش دینے پر مجبور کر دیا ہے اس طرف بھی ہماری توجہ مبذول کراتی ہیں۔ یہ نظمیں حنیف ترین کے شعور احساس اور مشاہداتی قوت کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ وہ صرف واقعات کی تصویر نہیں اتارتے بلکہ ایک ایک لفظ کو واقعات کے تناظر میں سجانے اور پرونے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ ان کی فکری بالیدگی اور فنی شعور انہیں دوسرے شاعروں سے ممتاز کراتی ہیں۔ ان کی نظموں کو پڑھ کر بیک وقت یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ حنیف تو حقیقتاً ایک ڈاکٹر ہیں، لیکن ان کی نظمیں ان کی دوہری شخصیت کا پتہ دیتی ہیں۔ یہ بہت ہی مشکل مرحلہ ہے کہ پیشہ ورانہ زندگی علاج اور مرض سے متعلق ہو اور وہی شخص شعری منظرنامے پر اپنے قلم کے جادو سے قارئین کو مسحور بھی کرتا ہے۔ ساتھ ہی اپنے فکر اور احساس سے ایک بڑے طبقے کو قوم کی ابتر حالت پر یکسو ہو کر سوچنے پر مجبور بھی کرتا ہے۔ اس سلسلے سے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی فرماتے ہیں :

> ''حنیف ترین اپنی نظمیہ شاعری میں زندگی کا تازہ خون دوڑاتے ہیں اور زندگی کی ان گنت کشمکش الجھن اور پریشانی کو مسکراہٹ اور چبھن کی قندیل سے روشن کرتے ہیں۔''

(کتاب نما کا خصوصی شمارہ 'حنیف ترین فن اور شخصیت، ص ۹۲-۹۱)

تمام باتوں کی روشنی میں ہم یہ کہیں گے کہ حنیف کی نظمیں اپنی خاص اہمیت رکھتی ہیں جن میں شاعر نے جذبہ واحساس کے کسی نہ کسی تاثر کا اظہار نہایت فنکارانہ اجمال کے ساتھ کیا ہے۔

Md. Shabbir Alam
M. Phil. (Urdu)
B. R. A. Bihar University
Muzaffarpur - 842 001

کوثر ناز

عبدالمنّان طرزیؔ بحیثیت تاریخ نویس

پروفیسر عبدالمنّان طرزیؔ کی شخصیت عالمگیر شہرت ومقبولیت رکھتی ہے۔ ان کی شخصیت اس قدر تنوع رکھتی ہے کہ اسے ضبط تحریر میں لانا کسی کے لئے ایک دشوار امر ہوگا۔ ان کی شخصیت بیک وقت کثیر جہات رکھتی ہے ان کی الگ الگ جہت پر الگ الگ کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ وہ ایک غزل گو شاعر، نظم نگار، نعت گو، منظوم تذکرہ نگار، منظوم ناقد، مرثیہ نگار، وغیرہ ہیں۔ ان کی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے ہوئی۔ ان کی پہلی تصنیف ''لکیر'' ۱۹۷۲ء میں منظر عام پر آئی یہ کتاب موصوف کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جو انہیں بحیثیت غزل گو شاعر متعارف کراتا ہے۔ پھر اس کے بعد ایک لمبی خاموشی قائم ہوگئی پھر کالج سے سبدوشی (۲۰۰۰ء) کے بعد ''رفتگاں وقائماں'' ۲۰۰۱ء میں لکھی جو دربھنگہ ضلع کے ۵۳۴ صاحبان علم وفن پر منظوم تذکراتی تصنیف ہے۔ جسے عالم گیر شہرت ومقبولیت ملی۔ اس کے بعد موصوف بحیثیت منظوم تذکرہ نگار، اور ناقد ملک اور بیرون ملک سیمیناروں میں شرکت کرنے لگے اور منظوم مقالات پڑھنے لگے، مناظر نامہ ۲۰۰۲ء، پھر دستار طرح دار، طلع البدرُ علینا اور نارنگ زار ۲۰۰۳ء میں لکھ ڈالی اس طرح ان کی تخلیق کا دور شروع ہوا اور کم وبیش آج بھی جاری وساری ہے۔ ان کی چند کتابوں کے نام ''تعارف تبصرہ، تاریخ منظوم ۲۰۰۴ء منظوم جائزہ ۲۰۰۴ء منظوم سیرۃ الرسول ۲۰۰۵ء، دیوار میں ایک کھڑکی رہتی تھی، (ترجمہ ۲۰۰۵ء) شاہد جمیل ۲۰۰۶ء، آیات جنوں ۲۰۰۶ء آہنگ غزل ۲۰۰۷ء فنکار حق شعار ۲۰۰۷ء قامت ۲۰۰۸ء سودیدہ ۲۰۰۸ء دیدہ وران بہار جلد اول ۲۰۰۹ء، جلد دوم ۲۰۱۰ء سید سعادت علی خان: شخصیت اور شاعر ۲۰۰۹ء فکر رسا، ۲۰۱۰ء قد آورانِ (فارسی) ۲۰۱۰ء وغیرہ ہیں۔ ان کی ایک کتاب بیاض فکر رعنا ہے جو ۲۰۱۴ء میں منظر عام پر آئی جو موصوف کی دیگر کتابوں سے بالکل مختلف ہے جو ان کی ایک الگ جہت شخصیت کو واضح کرتی ہے۔ یہ ان کی تاریخ گوئی کے تعلق سے ایک کارآمد کتاب ہے۔ جیسا کہ اس کتاب کے نام سے واضح ہے کہ یہ کتاب ۱۴۳۴ھ میں لکھی گئی ہے اور ''بیاض فکر رعنا'' سے یہ تاریخ محسوب ہوتی ہے جس کا انگریزی یا عیسوی سال ۲۰۱۴ء ہوتا ہے۔

تاریخ گوئی ایک مشکل فن تصور کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن تاریخ گوئی کی روایت زمانہ قدیم سے ملتی ہے۔ تاریخی قطعات کے نمونے سب سے پہلے عربی زبان میں ملتے ہیں پھر یہ فن فارسی زبان میں پرورش پاتا ہے اور پھر فارسی سے اردو میں داخل ہوتا ہے۔ اردو میں تاریخ گوئی کی روایت بڑی مستحکم معلوم ہوتی ہے اور تقریباً تمام بڑے بڑے شاعروں نے قطعات تاریخ کہے ہیں اور اس فن کو فروغ دیا ہے۔ آج بھی بہار کے چند شعرا

ISSN. 2582 - 3612

اس فن میں خوب طبع آزمائی کر رہے ہیں۔اس تعلق سے ناوک حمزہ پوری، طلحہ رضوی برقؔ، عبدالمنّان طرزیؔ اور منصور عمر وغیرہ کے نام قابلِ احترام ہیں۔

تاریخ گوئی کا فن ابجدی قاعدے پر منحصر ہے۔اسے ''حسابِ جُمل'' بھی کہتے ہیں۔حساب جمل میں عربی حروف تہجی کے ۲۸/حروف سے آٹھ کلمات مرتب کئے گئے ہیں۔ جیسے ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت، ثخذ، اور ضظغ وغیرہ۔ پہلے تین کلمات ایک سے دس تک کے عدد دیتے ہیں پھر چوتھے اور پانچویں کلمے ۲۰ سے ۹۰/ کے عدد دیتے ہیں چھٹے ساتویں اور آٹھویں کلمات سو سے ایک ہزار تک کے اعداد کے لئے مقرر ہیں۔اس طرح تاریخی قطعات ابجد کے قاعدے سے لکھے جاتے ہیں۔

زمانہ قدیم سے یہ رواج رہا ہے کہ جب کسی کے گھر میں کوئی بچہ پیدا ہوتا تو اس کا نام اسی قاعدے سے رکھا جاتا کہ اس کے نام سے اس کی تاریخ پیدائش نکل آتی تھی۔اسی طرح مختلف مواقع جیسے شادی، بیاہ، تخت نشینی، عہدہ پانے، کسی کی موت ہونے، کتاب کی اشاعت ہونے وغیرہ تمام واقعات کو یادگار بنانے کے لئے قطعات تاریخ کہے جاتے تھے۔عبدالمنّان طرزیؔ نے بھی اپنی کتاب ''بیاض فکر رعنا'' میں ایک سو تیرہ شخصیات کی وفات پر قطعات تاریخ لکھے ہیں اس کے علاوہ ۳۸/ قطعات تاریخ مختلف مطبوعات کے تعلق سے کہے گئے ہیں۔اس کے علاوہ چھ شخصیات کے تعلق سے قطعات کہے گئے ہیں۔اس کے بعد چند شخصیات کے سفرِ حج، شعبہ صدر ہونے وغیرہ موضوعات پر قطعات کہے گئے ہیں۔اخیر میں چند لوگوں کی شادیات کے تعلق سے بھی قطعاتِ تاریخ درج ہیں۔ جو ان کی قادر الکلامی، اور زود گوئی کے آشکار ہیں یہ ان کی شخصیت کی ایک اور جہت پر روشنی ڈالتے ہیں۔مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند قطعات تاریخ بطور نمونہ پیش کر دئے جائیں جس سے موصوف کی اس فن پر مہارت اور فکر و تخیل کی خوبیاں واضح ہو جائیں اختر اور ینوی کی وفات پر۔

لیجئے پھر بے ثباتی زیست کی — زخم دل کو اور ہے اک دے گئی
غم زدہ اہلِ ادب کو کر گئی — اختر اورینوی کی موت بھی

۱۹۷۷ء

جمیل مظہریؔ کی وفات پر قطعہ تاریخ۔

ہے تیری نقش جمیل ایسی غضب — اور تری فکرِ جمیل، اتنی عجب
ڈھونڈ اپنے فلسفے کا تو سراغ — قید ہستی مظہریؔ پوری ہے اب

۱۹۸۰ء

سید اجتبیٰ حسین رضوی کی وفات پر۔

ناز اسلوب اِک اور فکر علی

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

دے گئے بھی ہمیں — حضرت اجتبیٰ

۱۶۷ + ۱۸۲۴=۱۹۹۱

قاضی عبدالودود کی وفات پر۔

شرم سار بود بھی ہے ہر وجود — ہے فنا سے آشنا ہر اک نمود
پاؤں بھی تحقیق اعلیٰ وہ کہاں — دے گئے جو قاضی عبدالودود

۸۹۳ + ۱۰۹۱=۱۹۸۴ء

مندرجہ بالا قطعاتِ تاریخ سے واضح ہے کہ دوسری تمام صنفوں کی طرح عبدالمنّان طرزیؔ کو تاریخ گوئی میں بھی مہارت حاصل ہے اکثر قطعات تاریخ کہتے وقت اشعار میں سلاست و روانی معدوم سی ہو جاتی ہے۔صرف لفظوں کے دروبست پر ہی شاعر کی تمام تر توجہ مرکوز ہوتی ہے اور شعر سے شعریت عنقا ہو جاتی ہے۔لیکن عبدالمنّان طرزیؔ کی قادر الکلامی ایسی ہے کہ اشعار میں الفاظ بھی برجستہ اور بلیغ ہو جاتے ہیں۔ جو انہیں تاریخ گوئی کے میدان میں بھی بلند و بالا رتبہ عطا کرتے ہیں۔اس سلسلے میں منصور عمر کا خیال ملاحظہ فرمائیں جو موصوف کی کتاب ''بیاضِ فکرِ رعنا'' میں عرض مرتب کے تحت درج ہے :

> ''طرزیؔ کی دلچسپی نظموں، غزلوں، منظوم مقالوں اور منظوم تبصروں کے علاوہ تاریخ گوئی سے بھی رہی ہے۔ چنانچہ اس صنف میں بھی وہ ید طولیٰ رکھتے ہیں......میں سمجھتا ہوں کہ ''بیاضِ فکرِ رعنا'' نہ صرف طرزی کی بلکہ فنِ تاریخ گوئی میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔''
>
> (بیاضِ فکر رعنا ص ۱۵۔اور۔۲۰)

عبدالمنّان طرزیؔ اردو ادب میں ایک ایسا نام ہے جو اپنی جملہ خوبیوں کی وجہ سے ہم عصروں میں محترم ہے۔انہوں نے اردو ادب کو جو تخلیقات دی ہیں ان میں بیشتر اضافے کا درجہ رکھتی ہیں۔منظوم تذکرہ نگاری، منظوم تنقید نگاری وغیرہ کے وہ بانی بھی ہیں اور خاتم بھی کیونکہ ان کے علاوہ ابھی تک ان کے اس طرزِ تحریر پر کوئی دوسرا شاعر طبع آزمائی نہیں کر سکا ہے۔تاریخ گوئی میں عبدالمنّان طرزیؔ کا نام بھی قدر و احترام سے لیا جاتا ہے۔اس فن پر بھی موصوف کو مہارت حاصل ہے۔اخیر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند اور نمونہ تاریخ پیش کر دوں جس سے موصوف کی فن پر مہارت ثابت ہو جاتے۔جس سے اردو کے ایک بڑے شاعر جون ایلیا کی تاریخ وفات یوں نکالی ہے۔

دیوانہ یہ کہتے ہوئے پیمانہ خالی کر گیا

ISSN. 2582 - 3612

اب خوش رہیں اہلِ سبو میخانے سے تو میں چلا
ہائے رخصت ہو گیا جون ایلیا بھی آج ہی

۱۴۹۵

رہنے کو دائم کہو آیا ہے کوئی کب بھلا

+۵۰۷=۲۰۰۲ء

موصوف نے اپنی بیٹی غزالہ انجم کی شادی کے دعوت نامے کا ایک تاریخی شعر۔

نجیب و غزالہ مبارک ہو شادی
طلب دیکھئے کیا حسیں داد لائی

+۲۹۹=۲۰۰۲ء

لختِ جگر خورشید اکرم کی شادی کا شعر۔

عدد ہم واہ کا جوڑیں اس میں
ہوا خورشید و نعمت کا ملن سعد

+۱۹۷۳=۱۹۸۵ء

ایک مشہور و معروف افسانہ نگار ہرچرن چاولہ کی وفات پر۔

واقف اسرارِ فن تھا اک ہمارے درمیاں — کون بتلائے بسائی آپ نے بستی کہاں
ہر چرن وہ چاولہ تھے خادم اردو زباں — عظمتِ افسانۂ اردو کے کہئے پاسباں

۲۰۰۱ء

واضح ہے کہ عبدالمنّان طرزیؔ کی شاعری اپنی تمام انفرادو امتیاز کی وجہ سے عالمگیر شہرت و مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ اردو شعری ادب میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ انہوں نے صنعت توشیح ۔ میں تھوڑی ترمیم کر کے ایک نئی صنعت ''صنعت حرفیہ'' کی ایجاد کی ہے۔ جس سے واضح ہے کہ موصوف کا ذہن تجدیدی ہے۔ وہ ہر وقت نئے افکار و نظریات کا سراغ تلاشتے رہتے ہیں۔ ان کی شعری صلاحیت بے مثل ہے ان کے یہ کارنامے انہیں شعری ادبؔ میں حیات جاوداں عطا کریں گے۔

Kausar Naz
Research Scholar
University Deptt. of Urdu
B. R. A. Bihar University
Muzaffarpur

محمد حنظلہ

حکیم مومن خاں مومنؔ : ایک منفرد قصیدہ نگار شاعر

حکیم مومن خان مومنؔ (۱۸۰۰ـ۱۸۵۱) اردو ادب میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں ۔ انہوں نے شاعری کی بیشتر صنفوں میں طبع آزمائی کی ہے انہوں نے غزل، نظم، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، واسوخت، قطعات اور معمیات وغیرہ میں اپنی جولان طبع کا ظاہرہ کیا ہے۔ انہوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے ان کے فارسی اشعار کی تعداد بھی کافی ہے۔ لیکن اردو ادب میں ان کی شہرت و مقبولیت غزل گوئی کی وجہ سے ہے۔ لیکن اس کا قطعی مطلب نہیں ہے کہ دیگر اصناف شعری کسی درجہ کے نہیں ہیں ۔ بلکہ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ انہوں نے تمام اصناف سخن میں ایک منفرد رنگ امتیاز قائم رکھا ہے جو انہیں تمام اصناف سخن میں ایک معتبر مقام دلاتا ہے خصوصاً غزل گوئی کے بعد ان کا سب سے بہترین شعری کارنامہ ان کی قصیدہ گوئی ہے۔ موصوف نے صرف نو قصیدے کہے ہیں۔ جن میں پانچ دینی قصائد ہیں جو چار خلفائے راشدین پر ہیں اور ایک حضرت حسنؓ کی شان میں ہے۔ دو غیر مذہبی قصیدے ہیں۔ ایک قصیدہ نواب وزیر الدولہ محمد وزیر خان والی ٹونک دوسرا راجا جیت سنگھ برادرِ مہاراجا پٹیالہ کی مدح میں ہے۔ ایک حمدیہ قصیدہ ہے ،ایک نعتیہ قصیدہ ہے۔

مومن خان مومنؔ کی قصیدہ نگاری ندرت فکر اور اسلوب بیان کی وجہ سے قدر و احترام کی حامل ہے۔ مومن کے قصائد میں خصوصاً تشبیب منفرد رنگ و آہنگ لئے ہوئے ہے۔ مذہبیت، حسن پرستی اور انا کے اشتراک سے موصوف نے ایک الگ دنیا تعمیر کی ہے جس کی مثالیں دیگر شعراء کے قصائد میں نہیں ملتیں ۔ مومنؔ کی تشبیب میں طعن و طنز اور بذلہ سنجی کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ مومن اپنی طنز کے نشتر سے نہایت گہری ضرب لگائے ہیں کہ انسان بے چین ہو جاتا ہے۔ مومنؔ کے قصائد میں اجزائے ترکیبی کا اہتمام نہایت حسن و خوبی سے ہوا ہے۔ ان کے قصائد روایت کا احترام بھی کرتے ہیں مضمون آفرینی، ندرت خیال، اسلوب بیان اور اسلوب بیان میں شان و شکوہ وغیرہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں ۔ چونکہ زیادہ تر قصائد مذہب اسلام سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے اخلاقی اعتبار سے ایثار و خلوص کے مرقع معلوم ہوتے ہیں۔ مومن کے قصائد کے سلسلے پروفیسر ضیا احمد بدایونی اپنے خیالات یوں بیان کرتے ہیں :

''مومن سے پہلے جس قدر شعراء گذرے ہیں قصیدے ہیں (بہ استثنائے

ISSN. 2582 - 3612

سودا) مومن کا کوئی ہم سر نہیں۔ اگر چہ پختگی اور روانی میں قصائد ذوق کا درجہ کہیں ارفع ہے۔ تاہم زور اور ندرت میں مومن کا جواب نہیں ہوسکتا۔''

(قصائد مومن (مقدمہ) پروفیسر ضیاء احمد بدایونی، ص۔ ظ)

پروفیسر ضیا احمد بدایونی کی رائے کو من وعن قبول نہیں کیا جا سکتا کیونکہ غالبؔ، انشاء وغیرہ شعراء کے قصائد مومن کے قصائد سے کئی اعتبار سے اعلی ہیں۔ چونکہ اس مضمون میں تفصیلی گفتگو کی گنجائش نہیں ہے اس لئے سرسری طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مومنؔ کے قصائد بھی لائق ستائش ہیں اور تغزلیت کے ساتھ اختراعی رنگ لئے ہوئے ہیں اس لئے قصیدہ نگاری کی روایت میں انہیں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔

مومنؔ کے قصائد کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مومنؔ بیک وقت عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے علمی اصلاحات اور صنائع بدائع کا ذخیرہ جمع کر دیا۔ اس سے مومن کی تبحر علمی کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ چونکہ مومن ماہر طب، ماہر ریاضی ونجوم کے علاوہ قرآن واحادیث کا گہرا علم رکھتے تھے اس لئے ان کے اشعار میں تمام موضوعات سے تعلق رکھنے والے اشعار کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ اسی وجہ کر ان کے قصائد میں پیچیدگی اور تکلف بھی پیدا ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر ظہیر احمد صدیقی ان کا دفاع کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں :

''اس میں کوئی شک نہیں کہ ان اشارات وتلمیحات اور علوم کی اصلاحات کے باعث مومن کے قصائد میں اغلاق پیدا ہو گیا۔ مگر اس میں ان کو خطاوار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ چونکہ قصیدہ کبھی عوام کی چیز نہیں رہا بلکہ خواص تک محدود رہا ہے۔ اس لئے خواص کو پر پیچ اور کٹھن وادیوں کو طے کرنا ان علمی مصطلحات کو سمجھنا اور ان بعید تلمیحات پر عبور حاصل کرنا چنداں مشکل نہیں۔ پھر یہ مشکل پسندی، خیال بندی، الفاظ کا جوش، بیان کا خروش، یہ سب قصیدہ کی جان ہیں۔ جو لوگ مومنؔ کے کلام پر ان علمی اصطلاحات کے باعث اعتراض کرتے ہیں ان کو یہ اعتراض مومن کے بجائے خود قصیدہ پر کرنا چاہئے۔ قصیدہ دوسری اصناف سخن کے برعکس ایک مختلف مزاج لیکر شاہانہ ہو گیا۔ یہی سبب ہے کہ قصیدہ میں طمطراق شان وشکوہ اور اظہار علمیت نہ ہو تو وہ لباس قصیدہ کے جسم پر کبھی چست نہ ہوگا۔''

(مومن شخصیت اور فن مصنفہ پرفیسر ظہیر احمد صدیقی، ص۔ ۲۱۶)

مندرجہ بالا مباحث اور حوالوں سے واضح ہے کہ مومن خان مومنؔ کی قصیدہ نگاری ایک امتیاز و

انفرد رکھتی ہے۔ انہیں بحیثیت قصیدہ نگار بھی ایک احسن مقام ومرتبہ حاصل ہے۔ مومن کے قصیدہ میں بھی غزلوں کی سی تغزلیت، زبان میں سلاست وچاشنی، محاورات کی صفائی اور بے ساختگی ایک الگ تاثر مرتب کرتے ہیں۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کے قصائد سے تشبیب کے چند اشعار نموناً پیش کر دئے جائیں تاکہ قصیدہ کے سلسلے میں ہوئی گفتگو اپنی دلیل حاصل کر سکے۔ ملاحظہ فرمائیں ؎

چمن میں نغمۂ بلبل ہے یوں طرب مانوس　　کہ جیسے صبح شبِ ہجر نالہائے خروس
ہے اس طرح فرخ انگیز کو کوئے قمری　　کہ جیسے فوج مظفر کو شور و غلغل کوس
نوائے طوطی شکر فشاں کی لذت سے　　سماع و رقص میں اہلِ مذاق جو طاؤس
غبار صحنِ چمن کیمیائے عیش و نشاط　　بہار لالہ و گل سیمیائے عرض سموس
صفا سے وہ در و دیوار باغ کا عالم　　کہ آشیانہ میں دشوار طائروں کو جلوس

ایک اور قصیدہ کی تشبیب ملاحظہ فرمائیں ؎

کوئی اس دور میں جئے کیونکر　　ملک الموت ہے ہر ایک بشر
دار خواہوں کے شور سے دیکھو　　چونکہ پڑتا ہے فتنۂ محشر
آئینہ نے بھی اس زمانے میں　　تیغ کے سے نکالے ہیں جو ہر
آتشِ لعل سینۂ جاں سوز　　آب نسیاں ہے ایک بد گوہر
جسکو دیکھو سو مایۂ بیدار　　کیا ہوا گر نہیں ہے یسٰمیں زر

اب مدحیہ اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

اے مسیحِ دم رواں پرور　　زندگی بخش دینِ پیغمبرؐ
گرمی التفات سے تیری　　خشک ہو عاصیوں کا دامن تر
ہے سراپا تو مہرۂ تر پاک　　تجکو کیا نیس مار سے ہو ضرر
ہے ترے خار جیب کا قصّہ　　شرِ یانِ حسود کو نشتر
تو وہ سلطان کہ بار گنہ کا تیری　　پشت کا شانہ ہے فلک منظر

اور اب آخری حصہ دعائیہ کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

مومنؔ اب کر دعا کہ سنتا ہے　　تیری تقریر گوش دل سے اثر
جب تلک گردشِ سپہری ہے　　انتسابِ حدوس نیکی و شر
تیرے احباب نیک بخت مدام　　تیرے اعدا ہمیشہ فال اختر
جب تک اس تیرہ خاک داں میں ہے　　کوئی گم کردہ رہ کوئی رہبر

ISSN. 2582 - 3612

تیرے حاسد ہوں غول صحرائی — تیرے پیرو ہو پیشوائے خضر

نیک خواہ اور خوبی دارین — بدسگال اب سے خوار تا محشر

قصائد مومنؔ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو قصیدہ نگاری میں مومنؔ کا مقام و مرتبہ بہت بلند نہیں لیکن بہت کم تر بھی نہیں ہے ۔ نیاز فتح پوری نے اپنے ایک مضمون میں قصیدہ نگار شاعروں کا سلسلہ سوداؔ، ذوقؔ، غالبؔ، پھر مومنؔ لکھا ہے۔اس سے بھی ظاہر ہے کہ مومن کی قصیدہ نگاری ایک مقام و مرتبہ رکھتی ہے آخری میں نیاز فتح پوری کے جملے پر اپنی بات ختم کر رہا ہوں۔ملاحظہ فرمائیں :

> ''بہر حال اس میں شک نہیں کہ فنی حیثیت سے مومنؔ کے قصائد بھی کم اہمیت نہیں رکھتے اور اگر ہم قصائد کے متغزلانہ حصوں کو بھی سامنے رکھیں جہاں وہ بے اختیارانہ ایک عاشق دلباز کی حیثیت سے سامنے آگیا ہے تو یہ اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔''

(مومن نمبر ''نگار'' پاکستان دسمبر ۱۹۶۴ء ص۔۲۴۱)

Md. Hanzala
Research Scholar
Deptt. of Urdu
L. N. Mithila University
Darbhanga

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

فیاض احمد

مہجور شمسی کی نظم نگاری : ایک جائزہ

اردو میں مہجور شمسی کی شہرت و مقبولیت ان کی غزل گوئی کی وجہ سے ہے۔لیکن انہوں نے نظمیں، قطعات اور رباعیات وغیرہ صنفوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ان کی نظموں کی تعداد بہت قلیل ہے۔اور ان نظموں میں چند نظمیں ایک عام متوسط ذہن و مزاج کی ترجمان نظر آتی ہیں۔ان کی نظمیں فنی اعتبار سے کم درجہ کی حامل نظر آتی ہیں۔انہوں نے نظموں کی تخلیق میں نہایت بے دلی سے کام لیا ہے۔نظم کے لئے ضروری اجزائے ترکیبی میں ابتدا، ارتقاء، انتہا اور اختتام ہوتے ہیں، ان مرحلوں سے گزرنے کے بعد ہی کوئی بھی نظم نظم کہلانے کی حق دار ہوتی ہے۔موصوف کی نظمیں متذکرہ بالا کسوٹی پر پورا نہیں اُترتی ہیں۔اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد اقبال وارث کا خیال ملاحظہ فرمائیں :

> ''اسی پس منظر میں مہجور شمسی کی نظموں کو دو واضح حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ایک خانہ تو ان نظموں کا ہے جس میں ارتقائے خیالی کی جگہ تکرار خیال ہے۔دوسرے خانوں کی نظموں میں ہیئت کا حسن بھی ہے اور ارتقائے خیال کا وصف بھی۔''

(مہجور شمسی کی شاعری، مصنفہ ڈاکٹر محمد اقبال وارث، ص ۱۰۹)

منقولہ بالا اقتباس سے واضح ہے کہ مہجور شمسی کی کچھ نظمیں ہیئتی اعتبار سے فنی تقاضوں کو پورا نہیں کرتیں۔مہجور شمسی نے جس دور میں شاعری کی ہے وہ دور ترقی پسندی کا دور تھا۔اس لئے ان کی نظموں میں ترقی پسند رجحانات بھی ابھر کر سامنے آتے ہیں۔اس کا یہ قطعی مطلب نہیں ہے کہ وہ بھی ترقی پسند تحریک کے علم بردار تھے۔ بلکہ انہوں نے ترقی پسند تحریک سے خود کو الگ رکھا ہے۔اور کبھی ایسا دعویٰ بھی نہیں کیا کہ وہ ترقی پسند تحریک کے علمبردار ہیں۔لیکن ان کے کلام پر ترقی پسندی کے رجحانات کہیں کہیں نمایاں نظر آتے ہیں۔انہوں نے جو نظمیں لکھی ہیں وہ جوش بیان اور انداز بیان میں دلکش اور پر اثر معلوم ہوتی ہیں۔انہوں نے اپنے مادر وطن پر کئی نظمیں لکھی ہیں۔ جو حب الوطنی کے جذبے سے سرشار و مملو ہیں۔انہیں اپنے وطن عزیز سے قلبی انسیت ہے۔اپنے وطن کے ذرے ذرّے سے انہیں محبت ہے جو ایک فطری جذبہ ہے۔ان جذبات کے اظہار میں وہ نہایت کامیاب و کامران نظر آتے ہیں۔اس سلسلے میں یوم آزادی ۱۵؍اگست کے تعلق سے لکھی گئی نظم جو غزل کی ہیئت میں ہے۔اس کے چند اشعار

ISSN. 2582 - 3612

ملاحظہ فرمائیں ؎

گر پڑی ٹوٹ کے زنجیر وطن آج کے دن — مل گئی فرصتِ تعمیرِ وطن آج کے دن
معنیٔ حرفِ وطن کون سمجھ سکتا ہے — کھل کے لکھ گئی تفسیر وطن آج کے دن
مردِ آزاد ہلا، ہل گئی ساری دنیا — دیکھ لی ہم نے یہ تاثیر وطن آج کے دن
آسماں گیر نہ ہوتا تھا، مگر ہو کے رہا — کامراں نالۂ شب گیر وطن آج کے دن

نظموں میں وطن پرستی کے خیالات بیشتر شاعروں نے رقم کئے ہیں۔قلی قطب شاہ سے لے کر اقبال اور چکبست وغیرہ نے اس قبیل کی لاجواب نظمیں لکھیں ہیں۔مہجور شمسی بھی اسی روایت سے خود کو جوڑنے کی کوشش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں حالانکہ اس موضوع پر بھی ان کی بہت کم نظمیں ہیں لیکن جو بھی نظمیں موصوف نے وطن پرستی کے تعلق سے لکھی ہیں ان میں کوئی امتیاز و انفرادیا ان کا مخصوص کوئی انداز بیان واضح نہیں ہوا ہے۔اس بات کا کوئی اقرار نہیں کر سکتا ہے کہ ان کلاموں میں موصوف کا جذبہ وطنی کسی دیگر شعراء سے کہیں کم ہے۔ان کے دل میں بھی وطن کے ذرّے ذرے سے بے انتہا عقیدت و محبت ہے۔انہیں وطن کی ندیاں، پہاڑیں، کھیت، کھلیان، چمن، ویرانہ اور آبادی سب سے گہرا انسلاک ہے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بہار کی ایک ندی پر بھی مکمل نظم لکھی ہے۔اس نظم کا عنوان ''کوئل ندی کے کنارے ایک شام کا تاثر'' ہے۔نظم کے ابتدائی اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

سرِ شام کوئل پہ بادل بھی چھائے — فضا بھی ہے آنکھوں میں کاجل لگائے
محبت کی تصویر سب کو دکھائے — اجالا گلے سے اندھیرا لگائے
ہوا کی وہ صر صر کہ دل گد گدائے — میری فکر مضطر کو جھولا جھولائے
ندی کی روانی وہ موجیں اٹھائے — کہ غم کا سمندر یہاں ڈوب جائے
سر شام کوئل پہ بادل کے سائے — یہ پردہ سے باہر کسے کھینچ لائے
دھندلکے کا گالوں پہ غازہ لگائے — ہواؤں کے شانہ سے گیسو لگائے

مہجور شمسی نے نظم نگاری کی صنف میں ایک اچھے شاعر کی طرح اپنے تصورات و خیالات کی ترجمانی کی ہے۔وطن کے متعلق روایتی انداز و اسلوب اختیار کیا ہے۔انہیں اپنی زبان پر ماہرانہ دسترس ہے۔روزمرہ کے الفاظ اور تراکیب کلاسیکی نوعیت کے ہیں۔محاورات اور الفاظ کی نشست و برخاست عمدہ ہیں۔جو قارئین کو متاثر بھی کرتے ہیں اور داد و تحسین بھی حاصل کرتے ہیں۔ان کے جذبات پاکیزہ ہیں اور حقیقت کے بالکل قریب معلوم ہوتے ہیں۔ان کے کلام میں عصری حسیت بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔انہیں منظر تراشی میں بھی مہارت حاصل ہے۔موصوف کی ایک نظم ''طلوعِ سحر'' کے تین بند ملاحظہ فرمائیں جس میں

موصوف نے صبح کا خوشنما منظر الفاظ کے پیکر میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس میں بہت حد تک کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔ملاحظہ فرمائیں ؎

کلیوں کے نازک سینوں پر شبنم کی روانی کیا کہئے
خورشید سحر کے پہلو میں گلشن کی جوانی کیا کہئے
کیا پھول کھلائے ہیں مل کر یہ آگ یہ پانی کیا کہئے

کلیوں کے تنگ قبا مسکی بھنورے مستی میں جھوم گئے
یہ کلیاں کھل کر پھول ہوئیں وہ سندر مکھڑا چوم گئے
کلیوں کا بچپن کیا کہئے، پھولوں کی جوانی کیا کہئے

اُبھری جوبن سر کا آنچل بکھرے موتی نکھرا منظر
چنچل چنچل، بیکل بیکل مست ہوا ہے گرم سفر
سوئے ارماں جاگ اٹھے کیا رت ہے کہانی کیا کہئے

مہجور شمسی کی نظموں میں فکری پہلو نہایت بالیدہ ہے۔انہیں اپنے جذبات و تصورات کو رقم کرنے میں مہارت حاصل ہے۔موصوف کی فکر تعمیری ہے۔وہ دنیا میں پیار و خلوص، ایثار و قربانی، وفاداری و ہمدردی کے پیروکار نظر آتے ہیں۔وہ صرف اپنی ترقی اور بلندی کے خواہاں نہیں ہیں بلکہ وہ عوام الناس کی فلاح و بہبود کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ملک اور قوم کی ترقی میں ہر ذات واحد کی ترقی کے وہ خواہاں ہیں اسی لئے اپنے افکار و نظریات کو اپنی ایک نظم ''پیام'' میں نہایت ہی موثر انداز میں بیان فرماتے ہیں۔یہ نظم بھی غزل کی ہیئت میں ہے۔خوف طوالت کی وجہ سے اس نظم کے ابتدائی اور اختتامی چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

جاں سپاری سے ہوئے لوح و قلم سرفراز — سرنگوں ہوتی ہے کب لوح و قلم یاد رہے
آہِ تعمیر میں تحریک دل و جاں ہی سہی — منزل عشق سے اکھڑیں نہ قدم یاد رہے
سخت مشکل ہے قدم راہ وفا میں رکھنا — سر پہ ٹوٹیں گے قیامت کے ستم یاد رہے
نگہہ فقر کی تلوار بدل دیتی ہے — ایک ہی وار میں تقدیرِ امم یاد رہے
بال و پر تنگ ہیں، محدود اگر ہے پرواز — طائرِ بام، عرب تا بہ عجم یاد رہے
ہم ہیں مہجور ہم آہنگ بہ آہنگ سرور — مختصر یہ کہ جمہور کا غم یاد رہے

الختصر یہ کہ مہجور شمسی کی نظم نگاری روایتی انداز و اسلوب رکھتی ہے اور اپنے افکار و تصورات کو نظموں کے پیرائے میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے جو فکری اور فنی دونوں اعتبار سے قابلِ قدر ہے۔انہوں نے کئی نظمیں قابلِ ستائش کہی ہیں جن میں ان کا فطری میلان انسان دوستی، اخوت و مروت، جاں بازی،

ISSN. 2582 - 3612

حوصلہ مندی اور اخلاقی نقطہ نظر واضح نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اہم نظم ''شاعر کی دعا'' بھی ہے۔ جس میں شاعر نے اپنے عزیز انور معین کو بے شمار دعاؤں سے نوازا ہے۔ اور اس کی زندگی خوب سے خوب تر ہو یہ دعا دی ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی موصوف کی نظم ''ماحول'' بھی ہے۔ اس نظم میں موصوف نے اپنی قادرالکلامی کا ثبوت دیا ہے۔ اور اپنے گرد کے ماحول کا ایک خوفناک اور درد انگیز نقشہ کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ اس نظم میں موصوف کا رجحان ترقی پسندانہ ہے۔ جس میں کسانوں اور محنت کشوں کا ذکر ہے۔ شاعر نے غریب کسانوں کی حرماں نصیبی کا ذکر کیا ہے۔ اسی نظم کے چند اشعار پر اپنی بات ختم کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں ۔

گلوں کے سائے میں آہن گلائے جاتے ہیں　　چمن کی آنکھوں میں کانٹے چبھائے جاتے ہیں
یہ خار و حسن کے شعلے نگلتے جاتے ہیں　　دمِ حباب سے پتھر پگھلتے جاتے ہیں
ہوا خزاں کی جو گلشن میں آ نکلتی ہے　　کلی کلی کی زباں سے دعا نکلتی ہے
کسان کھیت میں کرتا ہے بھوک کی کھیتی　　غذا کے منھ میں پڑی کسانوں کی ہڈّی

Faiyaz Ahmad
Research Scholar
University Deptt. of Urdu
B. R. A. Bihar University
Muzaffarpur - 842 001

حنا شبنم

رضا نقوی واہی کی مزاح نگاری : اجمالی جائزہ

یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ صوبہ بہار میں جس طرح دیگر اصناف کو وسعت عطا کرنے میں بہار کے اہل قلم و فنکاروں نے اپنی قلمی معاونت دی اسی طرح طنز و مزاح کی آبیاری میں بھی یہاں کے فنکار اپنی فعالیت کا احساس کرانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ صوبہ بہار میں طنز و مزاح ابتدا تا حال ایک کامیاب صنف کی حیثیت سے اپنی شناخت بنانے میں کامیاب رہی ہے۔ بہار میں اردو طنز و مزاح کو وسعت عطا کرنے میں کئی اہل قلم جوشش عظیم آبادی، شہناز عظیم آبادی، بیتاب عظیم آبادی، سریر کابری، بگٹبٹ عظیم آبادی، رضا نقوی واہی، مناظر عاشق ہرگانوی، انجم مانپوری، اشرف علی فغاں، مشہور عظیم آبادی، آفت گیاوی، یوسف سیوانی، مرزا کھونچ، ظفر کمالی، احمد جمال پاشا، اعجاز علی ارشد اور تمنا مظفر پوری کا نام خاص طور سے اہم ہے۔ مختصر یہ کہ مذکورہ تمام اہل قلم نے اپنی مزاحیہ تحریروں کے حوالے سے صرف ہنسنے ہنسانے کا مقصد قائم نہیں رکھا بلکہ سماجی ناہمواریوں اور نامساعد حالات کی پیش کش کا بھی مزاحیہ ادب کو بہترین ذریعہ بنایا۔

بہار کے معتبر و معروف مزاح نگاروں میں رضا نقوی واہی کی شناخت قائم ہے۔ آپ کی مزاحیہ نگارشات آپ کے نظریہ فکر کی بہترین عکاسی کرتی ہیں۔ آپ کی مزاحیہ نگاری کے سلسلے سے درج ذیل اقتباس دیکھئے :

> ''رضا نقوی واہی نے جب مزاحیہ شاعری شروع کی تو اردو میں ظریف لکھنوی، شوکت تھانوی، غلام احمد فرقت کاکوروی، مجید لاہوری اور تخلص بھوپالی اردو کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے بڑے نام تھے، لیکن واہی نے اپنی روش ان سب سے الگ نکالی۔ واہی نے مزاحیہ سے زیادہ طنزیہ شاعری کی اسی لئے ان کے طنز کے تیر بہت گہرائی تک جاتے ہیں۔ انہیں اپنی انفرادیت کا احساس تھا کیوں کہ انہوں نے ظریفانہ شاعری بہت سوچ سمجھ کر کی وہ خود ہی کہتے تھے کہ وہ مزاحیہ شاعری بہت سنجیدگی سے کرتے ہیں اور ان کی یہ سنجیدگی شاعری میں شروع سے آخر تک نظر آتی ہے۔ واہی کسی فرد کو

ISSN. 2582 - 3612

> نشانہ نہیں بناتے بلکہ سماج پر طنز کے تیر چلاتے ہیں وہ جزو کی نہیں کل کی بات کرتے ہیں اسی لئے واہی کی ظریفانہ شاعری کے تناظر بہت وسیع ہیں۔''
>
> (رضا نقوی واہی، رضوان احمد، ص-۲۵)

اس اقتباس کی روشنی میں کہا جائے گا کہ رضا نقوی واہی کا طنز ومزاح کو فروغ دینے میں اہم رول رہا ہے۔ اس کی خاص وجہ ہے کہ آپ نے طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کے تمام تقاضے کو اپنی تخلیقات میں ملحوظ خاطر رکھا۔ مثال کے طور پر زبان وبیان میں لفظیات کا استعمال لب ولہجہ میں شائستگی کلام کی بے ساختگی ایسی خوبیاں ہیں جو آپ کی مزاحیہ تحریروں کو جلا بخشتی ہیں۔ اس پر اضافہ یہ کہ اصلاح معاشرہ کا مقصد بھی آپ کے کلام کی اہمیت میں اضافہ کرتا ہے۔ اس سبب آپ کے کلام میں سیاسی، سماجی، معاشی، اخلاقی اور ادبی شعور بھی جلوہ نما ہے۔ آپ کے یہاں جس عصری مسائل کو پیش نظر رکھا گیا ان کا تعلق حقیقت میں عالمی منظرنامے سے جا ملتا ہے لہٰذا آپ کی تخلیقی نگارشات، آفاقیت کا احساس کراتی ہیں۔ فن اور موضوع دونوں اعتبار سے آپ کے مزاحیہ کلام قارئین کو گرویدہ بناتے ہیں۔

مختصر یہ کہ آپ کے مزاحیہ کلام میں جو طنز کی نشتریت ملتی ہے اس میں کسی طرح کا چبھن بھی محسوس نہیں ہوتا اس کی خاص وجہ ہے کہ آپ کڑوی سے کڑوی بات کو بھی بہت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی مزاحیہ شاعری آپ کے شخصی اوصاف طرز احساس انداز نظر نظریہ فکر اور تجربات کا بہترین آئینہ ہے۔ لہٰذا یہ بھی کہا جائے گا کہ آپ کو انسانی زندگی کے سارے حقائق کو شاعرانہ حسن کے ساتھ بیان کرنے پر قدرت حاصل ہے۔

آپ نے اپنی مزاحیہ شاعری کے وسیلے سے محقق نقاد، تبصرہ نگار، شاعر، ایڈیٹر، لیڈر، پروفیسر ماہر فن مشاعرہ کا مریڈ وغیرہ پر بہترین اظہار خیال کیا ہے۔ اسی سلسلے سے آپ کی تحریر کردہ نظمیں تحقیقی مقالہ برائے فروخت، پروفیسر نامہ، جدید عملی تنقید، پی ایچ ڈی، ایم ایل اے، عورتوں کا سال، انٹرویو، ماسٹر پلان، لیڈری کا نسخہ، رشوت، یو۔ این۔ او، مشاعرہ، عرض کاتب وغیرہ کافی اہمیت رکھتی ہیں۔

آپ کی ظریفانہ تحریر کے سلسلے سے اختر اورینوی فرماتے ہیں :

> ''واہی کی ظریفانہ شاعری کا تجزیاتی جائزہ لیتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے تجربات کا اظہار شاعرانہ طور پر ہوا ہے۔ ان کے حواس بیدار ہیں احساس ذکی جذبہ جاگا ہوا، مگر متوازن اور تخیل گہرا مشاہدہ اور زکاوت احساس کی مثالیں مختلف نظموں میں ملتی ہیں۔ واہی کی ہر اچھی نظم میں یہ صفت پائی جاتی ہے۔..........واہی کے فن میں جذبی ردعمل نمایاں ہے، لیکن ان کے یہاں

> جذبات کا فنکارانہ اظہار پایا جاتا ہے۔ اس کی مثالیں ان کی ہر کامیاب نظم میں ملتی ہیں۔ اس طرح اپنی ظرافت کو تخیل سے رنگین پرکار وسیع بلند یا عمیق بنا دیتے ہیں۔ ان کے یہاں معنی آفرینی بھی پائی جاتی ہے۔''
>
> (نشتر ومرہم، رضا نقوی واہی، ص-۱۳)

اس طرح اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ رضا نقوی واہی نے رنگارنگ موضوع پر طبع آزمائی کی یا یوں کہیں کہ آپ نے مذہب سیاست، معیشت ادب، تہذیب وغیرہ موضوعات پر تنقیدی نگاہ ڈالی اور قارئین کو ان ناہمواریوں سے آگاہ کیا جہاں تک ان کی نگاہیں جانے سے قاصر تھیں۔

مختصر یہ کہ رضا نقوی واہی کی مزاحیہ نگاری کا سرمایہ بہت وقیع ہے۔ اس کی خاص وجہ ہے کہ واہی کی دوررس نگاہیں پورے معاشرے پر تھیں۔ اس پر اضافہ یہ کہ وہ ایک حساس ذہن کے مالک بھی تھے۔ آپ انسانی نفسیات کا گہرا شعور بھی رکھتے ہیں۔ آپ اس بات کا احساس بھی رکھتے تھے کہ سماج کی ہر ناہمواریوں پر وہ قلم اٹھائیں اور یہی وجہ ہے کہ آپ کی تحریروں کے مطالعے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سماج کا کوئی گوشہ آپ کی تحریروں میں شامل ہونے سے نہیں بچ سکا ہے۔ لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ رضا نقوی واہی کی مزاحیہ تحریریں ادبی منظرنامے پر خاصے کی چیز تسلیم کی جاتی ہیں اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں۔

یہ بھی ایک اہم پہلو ہے کہ آپ کی تحریروں میں پھکڑپن اور قہقہہ کہیں نہیں ملتا بلکہ آپ نے بڑی ہی سنجیدگی کے ساتھ ہر ایک موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور قارئین کو زیر لب مسکرانے پر مجبور کیا ہے۔ اس سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے :

> ''انہوں نے اپنی تہذیب کی منتشر قدروں کو سمیٹ کر ایک ایسا نگارخانہ سجا دیا ہے جس میں آج کا انسان اپنے چہرے کے بگڑے ہوئے نقوش دیکھ کر ان کی کھوئی ہوئی آب وتاب کی بازیابی کی طرف مائل ہوسکتا ہے۔ اس لئے کہ واہی کی ہجویات کے منفی بیانات کے پیچھے مثبت اقدار حیات مضمر ہیں اور ان کی تنقید کا مقصد تعمیر ہے، تخریب نہیں۔ ان کا ذہن تشکیک و کلبیت کا شکار نہیں یقین واعتماد کا مایہ دار ہے ان کی جراحی فاسد، مادوں کے اخراج کے لئے ہے وہ مرض کا تجزیہ صحت کے لئے کرتے ہیں۔''
>
> (رضا نقوی واہی، آئینہ در آئینہ، ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ص-۱۷۳)

اسلوب بیان کے اعتبار سے بھی آپ کی مزاحیہ تحریریں اپنی مثال آپ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کی خاص وجہ ہے کہ آپ کی نظموں میں سیدھے سادے الفاظ کو شعور ذات اور ادراک حقائق کی بنیاد پر گنجینہ معنی کا طلسم

بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ یہ آپ کا فنی اختصاص کہا جائے گا۔ آپ کے اسلوب بیان کے سلسلے سے یہ بند دیکھئے۔

وہ مصدر الفاظ و جہاندار معانی
اقلیم ظرافت کا وہی اکبر ثانی
جو دیدہ صاحب نظراں میں ہوا محبوب
ہے شہد صفت جس کا نمک پارہ اسلوب

آپ کی ظرافت نگاری کے سلسلے سے میں اپنی بات ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے اس قول پر مکمل کرتی ہوں :

''واہی کے یہاں حساسیت اور Sensibility بہت زیادہ ہے۔ وہ نفسیاتی، سماجی، جذباتی، سیاسی، واقعاتی، داخلی، لمحات اور ہر داخلی لمحے کا مخصوص لہجہ (Tone) ماضی کو حال میں اور حال کو ماضی میں محسوس کرنے کا شدید جذبہ Myth اور بنیادی واقعات کو اپنے احساس اور تخیلی فکر ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ان کا احساس اور تخلیقی شعور پختہ ہو چکا ہے۔ یہی پختگی انہیں وجدانی کیفیت تخیل جذبہ اور واقعات کی آمیزش کے اظہار کا موقع دیتی ہے اور Psychic Experiences کے انعکاس کو ظاہر کرتی ہے۔ ان کی نظمیں تاثیر اور جاذبیت کے ساتھ بے ساختگی اور ندرت لئے ہوتی ہیں۔ شعر و اسلوب نگارش اور مخصوص لب و لہجہ ان کی نظموں کی پہچان ہے۔ بہت سے الفاظ اظہار کی قدر Values of expression کو سمجھاتے ہیں نظمیں کی تصویریت Picture quences اور فضا متاثر کرتی ہے اور ان کی نظموں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ان سے اقتباس پیدا کرنا بہت مشکل ہے۔ واہی کے ایک مصرع ایک شعر اور ایک نظم میں وہی تسلسل ایمائیت آمیزش تاثر جذبہ اور بندش ہوتی ہے جو غزل یا اس کے شعر میں پائی جاتی ہے۔''

(ادب نکھار (واہی نمبر)، ص ۱۰۵)

Hina Shabnam
Research Scholar
University Deptt. of Urdu
Magadh University
Bodh Gaya

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

محمد ارشد حسین

قومی یکجہتی اور اُردو

زبان اظہار خیال اور مواصلات کا بہترین اور عمدہ ذریعہ ہے۔ یہ ایک سماجی ضرورت ہے۔ زبان کی بنیاد پر ہی ہم حیوانی اور انسانی سماج میں امتیاز حاصل کرتے ہیں۔ انسان اشرف المخلوقات زبان کی بنیاد پر کہلاتا ہے۔ زبان خود اور خداشناسی کا بہترین وسیلہ ہے۔ ملک و قوم کی ترقی کا دارومدار زبانوں پر ہے۔ زبان سماج اور معاشرہ کے ترقی کی ضامن ہوتی ہے۔ قوم کی ذہنی تعمیر و ترقی میں زبانوں کا کلیدی رول ہوتا ہے۔ زبان تہذیب و ثقافت کی محافظ ہوتی ہے۔

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس میں مختلف مذاہب، تہذیب و زبانوں کے ماننے والے رہتے اور بستے ہیں۔ یہ ملک ہمہ لسانی، ہمہ مذہبی، ہمہ تہذیبی ملک ہے یہاں طرح طرح کے لوگ آباد ہیں ان کی تہذیب و مذاہب الگ الگ ہیں، کثرت میں وحدت یہاں کا شعار اور شیوہ ہے۔ گنگا جمنی تہذیب اس ملک کا وصف اور آن بان شان ہے۔ یہ شہید بھگت سنگھ کی زبان ہے، انقلاب زندہ باد کا نعرہ پہلے اسی زبان میں لگایا گیا اور جدوجہد آزادی میں اس زبان نے کلیدی رول ادا کیا۔ قومی یکجہتی یہاں کا اولین وصف ہے۔ قومی یکجہتی ایسی طاقت ہے جس میں تمام طرح کی ترقی مضمر و پوشیدہ ہے۔ یہ ایسی طاقت ہے جس سے ملک و قوم کا نام روشن ہوتا ہے اور پوری دنیا میں ہماری پہچان بنتی ہے۔ بغیر قومی یکجہتی کے ملک و قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ اس ملک کے جیسی مثال ملنا دنیاں میں مشکل ہے۔ یہ ایسا ملک ہے جہاں پر ہمہ اقسام کے لوگ رہتے ہیں جو ایک گلدستے کی طرح ہیں جس میں ہر قسم کے پھول موجود ہیں۔ اور اس گلدستے کی خوبصورتی اس وقت تک قائم رہے گی جب تک اس کے ہر پھول کی نگہداشت ہو۔ ہر قوم کو ترقی کا حق حاصل ہو۔ اردو زبان کی خمیر میں اتحاد و یکجہتی کوٹ کوٹ کر پیوست ہے۔ تقسیم سے پہلے اور بعد تک اردو ایک گلدستے کے مانند دنیا کے آگے سجی سجائی زبان کی طرح تھی مگر تقسیم کے بعد اس کی پنکھریاں مرجھانے لگیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ تقسیم سے جتنا نقصان ملک کا ہوا اس سے زیادہ اردو زبان و ادب کا ہوا۔ کیونکہ اردو آبادی کا ایک بڑا حصہ تقسیم ملک کی طرح بکھر گیا اور تا حال اردو اسکی سزا پا رہی ہے۔ ہندوستان میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں ان زبانوں میں اردو ایک آریائی زبان ہے اور یہ مغربی ہندی کی کھڑی بولی میں نکھر اور سنور کر ایک زبان کا روپ دھار لیتی ہے اور یہ دلی کے گرد و نواہ میں پیدا ہوئی اور ہندوستان میں اس کا جنم ہوا۔ یہاں پر پھلی پھولی نشو نما پائی اس کو سماج

ISSN. 2582 - 3612

کے تمام طبقہ نے گلے لگایا۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اور دیگر طبقات نے اس سے معاشرتی، سماجی اور مذہبی کام لئے ہیں۔ حضرت امیر خسرو سے لیکر آج تک تمام طبقات نے اس کی ترقی میں اہم اور کلیدی رول ادا کیا۔ یہ ہندوستان کے تمام فرقوں و قوموں کی زبان ہے۔ اس کے حروف میں تمام زبانوں کا عکس ملتا ہے۔ یہ ایک مخلوط زبان ہے جس میں سنسکرت، پراکرت، عربی، فارسی، ہندی اور دیگر ہندوستانی زبانوں کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ یہ زبان مختلف قوموں کے اختلاط وارتباط سے تشکیل پائی ہے اور اس کا ادب تخلیق کرنے میں تمام طبقات نے اہم اور کلیدی رول ادا کیا ہے۔ اس میں طبع آزمائی کرنے والوں میں پنڈت دیا شنکر نسیم، پنڈت برج نارائن، چکبست، پنڈت جگن ناتھ آزاد، گیان چند جین، گوپی چند نارنگ، کالی داس گپتا، مالک رام، ماسٹر رام چندر، درگا پرساد سمبل، وغیرہ نے اس زبان کو تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے فروغ عطا کیا اور زبان و ادب کو مالا مال کیا۔ ہندوستان کے طول وعریض میں آج بھی جس کا ڈنکا بج رہا ہے۔

سر تیج بہادر سپرو نے کہا تھا کہ اردو مشترکہ تہذیب کا سب سے بڑا سرمایہ ہے، یعنی ہماری سنسکرتی کی ساجھی دولت ہے، اور یہی ساجھی دولت ملک کے تقسیم ہوتے ہی بعض سیاسی کرتب بازوں کو ڈسنے لگی وہ اپنے مقصد کے لئے کبھی اسے مسلمانوں کی زبان کبھی غیر ملکی زبان کا نام دینے لگے، کبھی اس کو ختم کرنے کے منصوبے بنائے گئے تو کبھی ملک سے نکالنے کے، یہ کتنے غضب کی بات ہے کہ ہم اپنے اتنے بڑے تہذیبی سرمایہ کو، اتنی بڑی قومی دولت کو جس سے حرف حرف لیکر ہمارے بزرگوں نے اپنا بنایا ہم خود اسے مٹانے کی بات کرتے ہیں۔

اردو زبان تو قومی یکجہتی کی علامت ہے، اس نے قوموں میں اتحاد پیدا کیا، رواداری کا سبق سکھایا، انسان وانسانیت کی بقاء وفروغ کا رول ادا کرتی رہی۔ چنانچہ حالی نے کہا کہ :

فرشتوں سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

انسانیت اور انسانی قدروں کی ترجمانی وعکاسی میں یہ زبان پیش پیش رہی۔ اردو محبت کی زبان ہے، دلوں کو جوڑنے کی زبان ہے۔ مختلف فرقوں و تہذیبوں کو آپس میں جوڑتی ہے۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی نے اپنی اردو تخلیقات میں قومی یکجہتی کے تصورات کو عام کیا اور کئی تخلیقات نظم و نثر میں انہوں نے رواداری کے جذبوں کو عام کیا۔

شمالی ہند میں نظیر اکبر آبادی نے اپنی شاعری میں ہندوستان کی ہر چیز کو پیش کیا ہے۔ عوامی احساسات و جذبات کو شاعری کا موضوع بنایا ہے اور ہندوستانی تہذیب وتمدن کے ہر جز کو اجاگر کیا ہے۔ انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کو اولین ترجیح دی ہے۔ ان کی شاعری اور نظمیں قومی یکجہتی کا نمونہ ہیں۔ وہ اسلام

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

کے ساتھ ساتھ ہندو مذہب کا بھی احترام کرتے تھے۔ انہوں نے اذان دی تو سنکھ بھی پھونکا، شب برات میں مہتابیاں چھوڑیں تو دیوالی میں چراغ بھی روشن کیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور پیر وولیوں کی شان میں نظمیں لکھیں تو شری کرشن، مہادیو اور بابا نانک کو خراج عقیدت بھی پیش کیا۔ عید، بقرعید، شب برات کے ساتھ ساتھ ان کے لئے ہولی، دیوالی، راکھی ان کے اپنے تہوار تھے۔ ان سب تہواروں کو انہوں نے اپنی شاعری میں یاد رکھا۔

ہاں یہ ایک الگ بات ہے کہ نظیر کی شاعری کا لب ولہجہ ایک زمانے تک پس وپیش کا شکار رہا کیونکہ وہ شاعری کی زبان سے الگ ایک عوامی زبان کے پابند تھے۔ لیکن سچائی کے چشمہ سے دیکھیں تو نظیر اکبر آبادی نے گاؤں دیہات میں بولی جانے والی زبان میں مختلف موضوعات پر قوم کے فرزندوں کو قومی یکجہتی کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ آدمی ہی کرتے ہیں سب کار دل پذیر
یاں آدمی مرید ہے اور آدمی ہی پیر
اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر
اور سب میں جو برا ہے سو ہے وہ بھی آمی
(آدمی نامہ)

اس طرح جنوبی ہند میں محمد قلی قطب شاہ نے اپنی شاعری کے ذریعہ قومی یکجہتی کے تصور کو عام کرنے کی کوشش کی۔ اس نے ہندو مسلم اتحاد ویکجہتی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اس کی کئی نظمیں مشترکہ قدروں کی مظہر ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ ایسا شاعر تھا جس نے ہندوستان کے ہر ریتی رواج، تہوار کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ اس طرح اردو کے کئی ہندو، مسلم، سکھ شاعر نے اپنی شاعری کے ذریعہ قومی ایکتا اور قومی اکھنڈتا کو فروغ دیا۔

بیسویں صدی کی ابتداء سے تو اردو نظموں میں حب الوطنی کے باقاعدہ ترانے گائے جانے لگے۔ اقبال، جوش، فیض، چکبست، جمیل مظہری کن کن کا نام لیا جائے۔ خاص کر بعض تاریخ سے بے بہرہ لوگ اقبال کو ملک کے بٹوارے اور پاکستان بنانے کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں لیکن اقبال کی شاعری کو اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ بھلا وہ کون سنگ دل ہے جو لتا منگیسکر کی جادو بھری آواز میں۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی ، یہ گلستاں ہمارا

سنے اور وطن کی محبت میں اس کے دل کی دھڑکن بے قابو نہ ہو جائے۔ وہ اقبال ہی تھے جنہوں

ISSN. 2582 - 3612

نے قومی یکجہتی کا یہ محبت بھرا پیغام سنایا ۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یقیناً یہ شعر موجودہ سماج میں ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا مگر اس کے شیدا نہیں رہے ۔صرف اقبال ہی نہیں اردو کے تقریباً تمام بڑے شاعروں نے وطن سے محبت اور اس کی تہذیب وثقافت پر بے شمار اشعار کہے ہیں ۔جن میں نظیرا کبرآبادی ،امیر مینائی اور کلیم عاجز کا نام بھی عزت واحترام سے لینے کے لائق ہے۔ اور اردو غزل تو ہے ہی سراپا الفت ومحبت ،انسان دوستی ،مذہبی رواداری ،سیکولرزم ،جمہوری اورتہذیبی قدروں کی امین ،ترجمان اور پاسبان ۔

امیر مینائی کا درد دیکھئے کہ ۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہیں

کلیم عاجز نے پیغام دیا کہ ۔

اپنا یہ کام ہے کہ جلاتے چلو چراغ
رستے میں خواہ دوست یا دشمن کا گھر ملے

بلا شبہ اردو محبت کی زبان ہے ،قومی یکجہتی اور انسان دوستی کی زبان ہے جو ہمیشہ سے دلوں کو جوڑنے کا کام کرتی رہی ۔اردو زبان نے قومی یکجہتی پر جتنا زور دیا ہے شاید دوسری زبانوں میں دیکھنے کو نہ ملے ۔
الغرض ہندو، مسلم ،سکھ ،عیسائی سبھوں نے اردو زبان کو اپنا کر اردو زبان وادب میں ایسے شاہکار نظمیں ،غزلیں اور افسانے لکھے ہیں جس کے ذریعہ انہوں نے یہاں کے ماحول اور سماج کو رواداری کی قدروں سے ہم آہنگ کیا ،قومی یکجہتی کے فروغ میں اردو زبان حرکیاتی اور اہم کردار نبھاتی رہی ہے اس لئے اس زبان کے تحفظ اور بقاء کی ذمہ داری تمام طبقات پر عائد ہوتی ہے کیونکہ اردو زبان کا تحفظ گنگا جمنی تہذیب کا تحفظ ہے ،مشترکہ قدروں کا تحفظ ہے ،اردو جتنی ترقی کرے گی اتنا ہی ہندوستانی قوم وملت مضبوط وتوانا ہوگی ۔

Md. Arshad Hussain
Research Scholar
L.N.Mithila University
Darbhanga
Mob: 9097533942

غلام مصطفٰے

اُردو صحافت پر ایک طائرانہ نظر

میں یہ عرض کرتا چلوں کہ صحافت لفظ صحیفہ سے نکلا ہے ۔جس کے لغوی معنی کتاب یا رسالہ کے ہوتے ہیں ۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ تازہ خبریں حالات حاضرہ پر تبصرہ اور مختلف قسم کے مضامین جمع کر کے انہیں معین وقت میں شائع کرنے کا عمل بھی صحافت کہلاتا ہے ۔صحافت کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ صحافت کے ذریعہ شب وروز کے حالات کی عکاسی بھی ہوتی ہے ۔اسی لئے اسے آگاہی کا نام بھی دیا گیا ہے ۔اس کی خاص وجہ ہے کہ صحافت میں واقعات کی عکاسی کے ساتھ اس پر تبصرہ بھی کیا جاتا ہے ۔اس طرح اردو صحافت کا تعلق انسانی زندگی سے کافی گہرا ہے ۔ جہاں تک اس کے ارتقائی سفر کی بات ہے تو ابتدا تا حال اس کی اہمیت وافادیت قائم رہی ہے اور امید ہے کہ آئندہ وقتوں میں بھی قائم رہے گی ۔اس کی خاص وجہ ہے کہ اردو صحافت زندگی اور معاشرے کے سارے رموز ونکات سے گہری وابستگی رکھتی ہے ۔ہم اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اردو زبان جس طرح عروج کے زینے طے کرتی رہی اسی طرح اردو صحافت بھی اپنی اہمیت کا لوہا منوانے میں کامیابی حاصل کرتی گئی ۔اس سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے :

> ''اردو صحافت کی ممتاز حیثیت اور تمام دیسی زبانوں کی صحافت پر برتری اس کا خلوص ایثار ہے اسے ہمیشہ ہی مثبت مشق ومقصد کے لئے استعمال کیا گیا ۔اس جدوجہد میں اردو کے اخبار نویسوں نے مادی راحت سے قطع تعلق کر کے فقرو تنگدستی قید وبند ،طعن وملامت کو اپنایا اور حکومت کے شکنجوں میں دبے رہنے کے باوجود صحافت کے چراغ کی لو بڑھاتے رہے ۔شاذ ونادر افراد کے سوا کسی نے اسے ذاتی مفاد تجارتی انداز سے نہیں چلایا............ چھاپہ خانوں کی ایجاد کے بعد اردو صحافت کا بھی طلوع وفروغ ہوا جام جہاں نما پہلا طویل العمر اخبار تھا جس کی زبان اودھ کی عام بول چال تھی ۔اس کی پالیسی بہت واضح نہیں تھی پھر بھی اس کی آزاد تحریروں کے باعث ۱۸۲۳ء کا پہلا پریس آرڈ ینینس اسی پر لاگو کیا گیا ۔۱۸۵۷ء سے پہلے کئی اردو اخبار نکلتے تھے مگر اس میں سب سے بااثر ونامور بااعتماد وعمدہ اخبار دہلی اردو اخبار تھا جس کی بنیادی خصوصیت تعلیم کی زبردست حمایت تھی ۔معاشرتی بے لاگ سیاسی خبروں کے علاوہ غالب مومن

ذوق اور بہادر شاہ ظفر کے کلام کی اشاعت ہوتی اور کبھی کبھی زبان و محاورات کی بحث بھی چھڑ جاتی تھی۔ اس اخبار کے ایڈیٹر مشہور مجاہد آزادی مولانا محمد باقر تھے جنہیں انگریزوں کی مخالفت و جہاد آزادی ۱۸۵۷ء کی حمایت کے جرم میں پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ اس عہد میں سید لاخبار خیر خواہ ہند سراج الاخبار صدر الاخبار اسعد الاخبار باغ و بہار آفتاب ہند بھی تھے۔''

(ہندوستانی اخبار نویسی، عتیق صدیقی، ص-۵۱)

اس طرح یہ کہا جائے گا کہ اردو صحافت نے آزادی کے بعد سے آج تک ملک و ملت کی صحیح اور کار آمد رہنمائی کرنے میں اپنا اہم رول ادا کیا ہے۔ اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں۔

یہ بھی ایک مسلم حقیقت ہے کہ اردو صحافت نے جنگ آزادی میں مجاہدانہ رول ادا کیا ہے۔ اسی لئے یہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ اردو صحافت اور جنگ آزادی میں چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی سے لے کر ۱۹۴۷ء تک اردو صحافت نے آزادی کی جدو جہد میں جس طرح اہم رول ادا کیا اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جب ہم اردو صحافت کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ انگریزوں کے خلاف تحریک اور جدو جہد آزادی کو فروغ دینے میں اردو صحافت کی خاص اہمیت رہی ہے۔

میں یہ بھی عرض کرتا ہوں کہ اردو صحافت میں جس اخبار کو ابتدا کا شرف حاصل ہوا وہ منشی سدا سکھ لال کا ''جام جہاں نما'' کلکتہ ہے۔ اس طرح ۱۸۲۲ء میں اس کی اشاعت ہوتی ہے اور اردو صحافت کا آغاز ہوتا ہے۔

اردو صحافت کی آبیاری میں ''اودھ اخبار کا نام'' خاصا اہم ہے۔ اس بات سے ہم باخبر ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد اردو صحافت کا دور عہد زریں تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس طرح ''اودھ اخبار'' کی اہمیت صاف طور سے عیاں ہو جاتی ہے۔ اسے ہم غیر فرقہ وارانہ اخبار بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس میں مدیر اعلیٰ منشی نول کشور قومی و بین الاقوامی خبروں کے ساتھ ہر قسم کے معاشرتی موضوع کی اشاعت پر خصوصی توجہ دیا کرتے تھے۔ اس اخبار کی اہمیت میں اس وقت اور اضافہ ہو جاتا ہے جب اس کے مدیر اعلیٰ پنڈت رتن ناتھ سرشار ہوتے ہیں اور انہوں نے جب قسط وار ''فسانہ آزاد'' کی اشاعت پر خصوصی توجہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا میں یہ اخبار ہفت روزہ تھا بعد میں روزنامہ ہو گیا۔

''تہذیب الاخلاق'' بھی اردو صحافت کی فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا۔ سر سید احمد خاں نے انگلستان سے واپسی کے بعد ۱۸۷۰ء میں ''تہذیب الاخلاق'' شائع کیا۔ جسے انگریزی میں ''دی محمڈن سوشل ریفارمر'' کا نام دیا گیا۔ اس کی اشاعت کا واحد مقصد سر سید احمد خاں کے آگے یہ تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو مغربی تہذیب و ثقافت کی اہمیت و افادیت سے بہرہ ور کیا جائے۔ ''تہذیب الاخلاق'' سے سر سید کے علاوہ مولانا الطاف حسین حالی، نذیر احمد، وحید الدین سلیم، منشی ذکاء اللہ، محسن الملک وغیرہ اہم ادیب بھی منسلک

تھے۔ اسی طرح ۱۸۹۰ء میں ڈاکٹر مکند لال نے ایک ماہنامہ ''تاریخ بغاوت ہند'' آگرہ سے نکالا۔ اس میں کانپور کی جنگ آزادی کے مفصل حالات کو پیش کرنے پر ڈاکٹر مکند لال نے خصوصی توجہ دی۔

۱۹۰۳ء میں حسرت موہانی نے ''اردو معلیٰ'' نکالا۔ اس میں شائع شدہ مضامین خصوصی طور سے ادبی ہوا کرتے تھے، لیکن انگریزوں نے اس کی شدید مخالفت کی اور حسرت موہانی کی قید و بند کی سزا بھی جھیلنی پڑی، لیکن انہوں نے عزم و حوصلے کے ساتھ ۱۹۴۲ء تک اس کی اشاعت کی۔

۱۹۰۷ء میں ''سوراجیہ'' الٰہ آباد سے شائع ہونے لگا۔ یہ ہفت روزہ اخبار تھا اس کے پہلے مدیر اعلیٰ شانتی نرائن بھٹنا گر تھے۔ اس طرح یہ اخبار اپنے وقت کا سب سے باغی اخبار تھا یہی وجہ ہے کہ شانتی نرائن بھٹنا گر کے ساتھ بعد کے ایڈیٹروں کو بھی قید و بند کی سزا جھیلنی پڑی۔

۱۹۱۲ء میں مولانا محمد علی جوہر نے ''ہمدرد'' نام سے ایک اخبار نکالا جس میں انہوں نے مسلمانوں کو آزادی کی تحریک میں شامل ہونے پر غور و فکر کی دعوت دی۔ اسی طریقہ کار پر شائع ہونے والا ایک اخبار ''زمیندار'' بھی ہے جسے ظفر علی خاں نے شائع کیا۔ اس میں ظفر علی خاں نے اپنی جرأت مندی کا ثبوت دیتے ہوئے انگریزی حکومت کی مخالفت کی۔ آپ کے جذبہ حب الوطنی کا جائزہ اس شعر سے لے سکتے ہیں۔

جب امرتسر میں ہم پر گولیاں آئیں تو ہم سمجھے
کہ بوندیں ہیں یہ اہل ہند کے خونِ تمنا کی

۱۹۱۹ء میں مہاشہ کرشن نے ''پرتاپ'' نکالا۔ اس اخبار کی اہمیت اس سلسلے سے بھی ہے کہ اس زمانے میں مہاتما گاندھی ستیہ گرہ کر رہے تھے۔ اس طرح یہ اخبار تحریک آزادی کا نقیب بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مہاشہ کرشن کئی بار گرفتار بھی کئے گئے۔ مذکورہ اخباروں کے علاوہ اجالا، ہندوستان، آفتاب، جمہوریت، اقبال، انقلاب، زمانہ، الہلال، ایشیا، نئی دنیا، کلیم، شاعر، ریاست کا نام بھی اہم ہے۔

تمام باتوں کی روشنی میں یہ کہا جائے گا کہ اردو صحافت کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح زمانے کی ناہمواریوں اور زندگی کے متعدد مسائل کی پیشکش میں اردو اخبارات و رسائل نے اہم رول ادا کیا اسی طرح آزادی ہند میں بھی اس نے اپنی فعالیت کا احساس دلایا۔ آج بھی اردو صحافت اپنی ذمہ داری بخوبی نبھا رہی ہے جس کی اہمیت سے انکار کی گنجائش نہیں۔ لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ جس طرح اردو زبان و ادب کی اہمیت کے ہم دلدادہ ہیں اسی طرح اردو صحافت کی اہمیت سے بھی ہم خاصا متاثر ہوتے ہیں۔

Ghulam Mustafa
Research Scholar
University Deptt. of Urdu
Magadh University, Bodh Gaya

بی۔ اِلہام فاطمہ

اُردو میں خط کی معنویت

خط میں روح اپنا اظہار کرتی ہے۔اور خط خارجی مظہر کی حیثیت سے نمائندگی بھی کرتا ہے۔ایک طرح سے یہ حسی اور مادی وجود رکھتا ہے۔

اکیسویں صدی میں خط کی اہمیت کم ہوگئی ہے۔موبائل نے خیریت اور مصروفیت کی جانکاری اپنے اندر سمیٹ لی ہے۔اب خط لکھنے کی دردسری لینے کی فرصت کم لوگوں کو ہے۔اور خط کا انتظار تو جیسے ختم ہی ہوگیا ہے۔کہا جاتا تھا کہ خط سے آدھی ملاقات ہوجاتی ہے۔ایسا اس لئے کہا گیا کہ باتیں پڑھی جاتی تھیں۔ اب موبائل سے سُنی جاتی ہیں۔ بلکہ آمنے سامنے دیکھنے کا عمل بھی شروع ہوگیا ہے۔اس طرح پوری ملاقات ہوجاتی ہے۔اس پریکٹیکل کو دماغی آنکھ کا نام دیا جاسکتا ہے۔

بہت پہلے اردو میں مقفیٰ و مسجع نثر کا رواج تھا اور یہ رنگ خطوں میں بھی پایا جاتا تھا۔مثلاً اگر کوئی لڑکا اپنے والد کو خط لکھتا تھا تو اس کا انداز یوں ہوتا تھا :

''جناب قبلہ وکعبہ معزز ومکرم والد صاحب محترم مدظلہ العالیٰ۔''

آگے کا جملہ دیکھئے :

''کوشش خادمانہ ہے کہ بعد نہایت ادب سے عرض پرواز ہوں کہ آپ کی غلامی میں حاضر ہونا چاہتا تھا۔مگر..........۔''

درج بالا دو سطروں میں صرف ''والد صاحب'' ہی سے اصل مطلب نکلتا تھا۔

وقت گذرنے کے ساتھ سادگی آتی گئی اور غالبؔ نے تو انداز ہی بدل دیا۔تب سے سادگی اور بے تکلفی نے مقام بنالیا۔غالبؔ نے تو خود کہا ہے کہ مَیں خط نہیں لکھتا بلکہ باتیں کرتا ہوں۔ حالانکہ غالبؔ اپنے اُردو خطوط کے بارے میں زیادہ پُر اُمید نہیں تھے۔منشی شیونرائن نے ان کے اردو خطوط کو چھاپنے کی اجازت چاہی تو جواب میں انہوں نے کہا :

''اُردو خطوط جو آپ چھاپا چاہتے ہیں۔یہ زائد بات ہے۔کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا۔ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔اس کی شہرت میری سخنوری کے منافی ہے۔اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔خلاصہ یہ کہ اس کا چھاپنا میرے خلاف طبع ہے۔''

جبکہ سچائی یہ ہے کہ غالبؔ کے اردو خطوط نے اردو نثر کو نیا موڑ دیا ہے۔

دیگر قلم کاروں کے خطوط میں ''پہلے کے خطوط (قاضی عبدالغفار)'' ''غبار خاطر'' (ابوالکلام آزاد)'' زیرلب (صفیہ اختر)'' علامہ اقبالؔ کے خطوط اور شبلیؔ نعمانی کے خطوط عطیہ فیضی کے نام خاص طور سے اہم ہیں۔

صفیہ اختر کے خطوط جاں نثار اختر کے نام ہیں جن میں مشرقی عورتوں کی پوری روح نظر آتی ہے۔المناک حُسن بھرے ان خطوط کے بارے میں کرشن چندر لکھتے ہیں :

''صفیہ کے خط پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ عورت مرد کے بازوؤں کی زینت ہی نہیں بلکہ اس کا بازو بھی ہے۔''

اقبالؔ کے خطوط عطیہ فیضی کے نام بھی ہیں جن میں بہت سی شخصیت شناس باتیں ہیں۔اندرونی کش مکش ہے اور ذہنی الجھن بھی ہے۔ایک خط میں ان کا ایک جملہ خودداری کا دامن چھوڑتا نظر آتا ہے۔وہ رقم طراز ہیں :

''بدقسمتی ایک وفادار کتّے کی طرح میرا پیچھا کررہی ہے۔''

شبلیؔ کے خط بھی عطیہ فیضی کے نام ہیں۔نازک، حسین، خوبصورت رازوں کی تفصیل ان میں ہے۔

خط کی اہمیت اس لئے بھی اہم ہے کہ ان کی مدد سے نفسیاتی طور پر شخصیت سے واقفیت ہوجاتی ہے۔خط کسی انداز اور کسی حالت میں کیوں نہ لکھا جائے ذہن کا کوئی نہ کوئی گوشہ سامنے آجاتا ہے۔انسانی فطرت کو سمجھنے کے لئے خط بہت بڑا ذریعہ ہے۔

خط لکھنے اور لکھنے والوں کی نفسیات الگ الگ ہوتی ہے۔مثلاً جو شخص جتنا زیادہ خوبصورت اور صفائی سے خط لکھنے کا عادی ہوگا وہ زندگی میں حسین طریقہ سے رکھ رکھاؤ کا قائل ہوگا۔

بعض لوگ خط لکھتے وقت ضروری نہیں سمجھتے کہ کاغذ اچھا ہو۔ان کا مقصد صرف بیان کرنے سے ہوتا ہے۔ایسے لوگوں کو زندگی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی، وہ عملی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔

اکثر لوگ خط لکھتے وقت تاریخ دینا یا جگہ کا نام لکھنا بھول جاتے ہیں۔یہ لوگ زندگی میں بھاگ دوڑ کے قائل ہوتے ہیں۔

کئی لوگ خط جمع کرنے کے عادی ہوتے ہیں اور محفوظ بھی رکھتے ہیں۔ایسے اشخاص کو ماضی عزیز ہوتا ہے۔

ISSN. 2582 - 3612

کچھ لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ خط کو لفاف سے نکال کر پڑھنے کے بعد فوراً چاک کر دیتے ہیں۔ ان کے بارے میں عام قیاس یہ ہے کہ وہ رحم دل کم ہوتے ہیں بلکہ ابن الوقت ہوتے ہیں۔

اصل میں خط لکھنا بھی ایک فن ہے۔ ویسے بھی ہر کام کرنے کے لئے سلیقہ چاہئے۔

اُردو میں خط کے ذریعہ افسانے لکھے جاتے رہے ہیں۔ ذکی انور نے اس کی پہل کی تھی خط کے ذریعہ ناول لکھنے کا پہلا تجربہ مناظر عاشق ہرگانوی نے کیا ہے۔ ان کا ضخیم ناول ''شبنمی لمس کے بعد'' چرچا میں رہا ہے۔

اردو میں اشعار بھی خطوط سے منسوب ہیں۔ اکثر شوہر اپنی بیوی کو، نوجوان اپنی محبوبہ کو اور دوست ایک دوسرے کو شوخ خطوط لکھا کرتے تھے۔ دو ایک مثال دیکھئے :

چلا چل لفافے کبوتر کی چال
ہوگی محبت تو دیں گے جواب
آنے میں کوئی عذر ہے گر آپ کو یہاں
خط کو لکھا کرو مہ تاباں ! کبھی کبھی

اردو شعراء اور افسانہ نگاروں کی زندگی کی لہریں اکثر خطوط کی بدولت گھٹتی بڑھتی رہی ہے۔ اگر کسی نے ان کے مضمون، افسانہ یا شاعری کی تعریف لکھ دی تو ان کی تحریر کی لہروں میں سرعت آجاتی ہے۔ اسی لئے بیشتر اخبار و رسائل میں خط کا کالم ضرور ہوتا ہے۔

کبھی کبھی خط سے غلط فہمی یا ناراضگی بھی سامنے آتی ہے۔ ایسا تب ہوتا ہے جب ایک ہی وقت میں بیوی اور ماں کو خط لکھا جائے اور پتہ لکھتے وقت بے خیالی سامنے آجائے۔ ماں کا خط بیوی کو مل جائے اور اس میں لکھا ہو :

''مجھے بھی وہ دن یاد ہے جب آپ مجھے گود میں اٹھا کر پیار کرتی تھیں۔''

اور بیوی کا خط ماں تک پہنچ جائے اور اس میں لکھا ہو :

''اس برفانی ٹھنڈک میں تمہاری یاد بہت آرہی ہے۔ کاش تم میرے پاس ہوتیں اور ہم دونوں ایک ہی لحاف میں ہوتے۔''

خط بظاہر کاغذ کا ٹکڑا ہوتا ہے لیکن ان میں ٹھوس حقیقتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔

B. ILHAM FATIMA
Reseach Scholar
Department of Urdu
T. M. Bhagalpur University
Bhagalpur

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

محمد امام الدین امامؔ

جمیل اختر شفیقؔ کی شاعری : ایک مطالعہ

گزشتہ ایک دہائی میں نئی نسل کے جن شعراء نے شعری افق پر اپنے وجود کا احساس دلایا اور جن کے کلام نے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی ان میں جدید لب ولہجہ کے شاعر، ادیب، شعلہ بیان خطیب اور مشہور ناظم جمیل اختر شفیقؔ کا نام سرِ فہرست ہے۔ آپ کا تعلق بہار کے ضلع (سیتا مڑھی) سے ہے۔ آپ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ وہ اپنے ہم عصروں میں منفرد آواز، بے باک طرز ادا کے سبب دور سے ہی پہچان لئے جاتے ہیں،۔ اس کے لئے بڑی فنی ریاضت، پیشہ ورانہ انہماک، حساس شعور، بے پناہ ذہانت اور فکری بالیدگی لازمی ہے۔ اللہ نے ان ساری خصوصیات سے انہیں نوازا ہے۔ جناب شفیقؔ صاحب ہندوستان کے بڑے بڑے جلسوں اور مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں۔ پچھلے دنوں حکومت بہار کے محکمۂ اُردو ڈائریکٹریٹ سے منظور ہو کر ان کا شعری مجموعہ ''دھوپ کا مسافر'' پورے آب وتاب کے ساتھ منظرِ عام پر آیا جو ادبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا ہے۔ آپ کی تخلیقات ریڈیو اور ٹی۔ وی، چینلوں پر کثرت سے نشر ہوتی رہتی ہیں۔ ان کی نعت وحمد و دیگر تخلیقات اکثر I Plus TV ممبئی کے توسط سے پوری دنیا میں سُنی جاتی ہیں۔ ابھی حالیہ دنوں میں برطانیہ میں Radio XL BIRMINGHAM سے جناب عاطف مسعود صاحب (پاکستان) نے متواتر آپ کی کئی غزلیں نشر کیں۔ جو دنیا کے مختلف حصوں میں سنی گئیں۔ جب آپ ترنم کے ساتھ اپنا کلام پیش کرتے ہیں تو یہ کہنا پڑتا ہے

اُس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو

موصوف کی شاعری سادہ، سلیس اور آسان زبان میں ہوتی ہے۔ جو عام قاری بھی بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔ اُن کی غزلوں میں خود اعتمادی کا سبق ملتا ہے۔ موصوف اپنے معاشرے پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ شفیقؔ صاحب اپنی شاعری میں سماج میں موجود ظلم، زیادتی، غربت، استحصال کی سچّی عکاسی کرتے ہیں۔ آپ کی شاعری فنّی اور فکری دونوں اعتبار سے قابلِ قدر ہے۔ ان کی یہی خصوصیت انہیں اپنے معاصر شعراء سے اُنہیں منفرد وممتاز کرتی ہے۔ ان کے بارے میں معروف عالم دین، محقق، مفسر، مصنف، شاعر، ادیب و عالمی شہرت یافتہ خطیب علامہ جلال الدین قاسمی کا یہ اقتباس قابلِ غور ہے۔ ملاحظہ ہو :

ISSN. 2582 - 3612

''جمیل اختر شفیق اپنے پورے مجموعۂ کلام میں زندگی کی سچائیوں کی پیکر تراشی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے حسب مقدرت اخلاق وحکم کے مضامینِ عالیہ کو شعری قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے، کہیں صبائے بصیرت وآگہی کی مشک فشانی ہے تو کہیں نسیمِ فکر سلیم کی لخلخہ سائی تو کہیں شوخیِ جذبہ وفکر کی ہنگامہ آرائی ہے، ان کا یہی انداز ان کی شاعری کو سند اعتبار بخشتا ہے۔ ہر مجموعۂ کلام میں فنی اسقام کا درآنا ایک فطری امر ہے مگر ان تمام کے علی الرغم جمیل اختر شفیق کی شاعری کا اندازہ ہمہ شاعروں سے انہیں الگ ایک شناخت عطا کرتا ہے۔''

(''دھوپ کا مسافر'' ص، فلیپ)

علامہ جلال الدین صاحب کی اس بات کی میں بھی تائید کرتا ہوں۔ واقعی ان کی شاعری زندگی کی سچائیوں کی عکاسی کرتی ہے۔ جمیل اختر شفیق کی شاعری خوداعتمادی، کے ساتھ زندگی کے سرد وگرم کا مقابلہ کرنے اور آگے بڑھتے رہنے کی تعلیم دیتی ہے۔ چند اشعار پیش کرنا چاہوں گا تاکہ میرے دعووں کی تصدیق ہو سکے۔

روز گھٹ گھٹ کے یہ جینا کوئی جینا ہے شفیق
زندگی ایسی جیو تم کہ زمانہ ڈھونڈھے

دشمنوں کی دشمنی ناکام کرتے جایئے
یاد رکھیں لوگ ، ایسا کام کرتے جایئے

اب کوئی موسیٰ نہیں کہ ہو تجلی کا ظہور
بے سبب ہم دیکھتے ہیں کوہ سینا کی طرف

درج بالا اشعار سے قارئین کو یہ احساس ہوگیا ہوگا کہ واقعی ان کی شاعری کامیاب زندگی کے فلسفے سے کتنی قریب ہے۔ شفیق صاحب کی شاعری کے بارے میں اردو ادب کے عالمی شہرت یافتہ ادیب و شاعر جناب پروفیسر عبدالمنان طرزی کی منظوم رائے بھی دیکھیں۔

نام ہے ان کا جمیل اختر ، تخلص ہے شفیق
معتبر استاد ہیں تو آپ شاعر ہیں لئیق
اُن کا اسلوبِ سخن بھی اِس قدر ہے پاک باز
ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملتی ہیں چشمِ نیم باز

ہوں تخیل کہ تصور ، ہیں طہارت آشنا
گرچہ مشکل ہے غزل میں ایسی پاکیزہ فضا
اُن کی غزلیں در حقیقت ہیں محبت کا سبق
زندگی میں اُن کی غزلیں پیدا کرتی ہیں رمق
ہے شفیق خوش نوا کے حق میں طرزی کی دعا
دین و دنیا میں خدا سے پائیں اعلیٰ مرتبہ

(''دیدہ ورانِ بہار'' مصنفہ پروفیسر عبدالمنان طرزی، صفحہ ۱۴۷/ ۱۴۸)

پروفیسر طرزی صاحب نے بجا فرمایا ہے کہ واقعی ان کی غزلوں میں حسن وعشق، چشم نیم باز، لب ورخسار کی جھلک کم دکھائی دیتی ہے۔ ان ہی وجوہات کے سبب وہ بڑی تیزی سے میدان سخن میں فتوحات کے جھنڈے گاڑتے چلے جارہے ہیں۔ ساتھ ہی ان کی شہرت ومقبولیت کا گراف بتدریج بڑھتا چلا جارہا ہے۔ آپ لوگوں کے چہروں کو پڑھنے کا بخوبی ہنر جانتے ہیں۔ جمیل اختر شفیق اپنی خداداد صلاحیتوں کو عملی جامہ پہنا کر انسانوں کی فلاح و بہبود کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاعری آپ کے رگ وپے میں رچی بسی ہوئی ہے، شیخ محمد ابراہیم ذوق کے لفظوں میں یہ کہوں کہ۔

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوق
اولاد سے تو بس یہی دو پشت چار پشت

یہ ان کا وہ کارنامہ ہے جو ان کے بعد بھی اس دنیا میں یادگارِ شفیق کے نام سے زندۂ جاوید رہے گا (انشاءاللہ)۔ ابھی تو ان کو بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔ یوں تو ہر شاعر زندگی اور زمانے کو ہی اپنی شاعری کا محور اور موضوع بناتا ہے۔ جمیل اختر شفیق نے بھی عصری زندگی اور اس کو درپیش مسائل ومصائب کا بہت تعمق نظر سے مطالعہ ومشاہدہ کیا ہے۔ اس لئے ان کے یہاں بھی موجودہ عہد کی پریشانیاں اور پیچیدگیاں حساس طبع دلوں کو جھنجھوڑتی نظر آتی ہیں۔ میں یہاں اُردو دنیا کے مشہور ومعروف ناظم وشاعر انور جلال پوری کا ایک اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ ہماری درج بالا باتوں کی تصدیق ہوجائے :

''وہ ''جمیل اختر شفیق'' اپنے شعروں میں ہمارے درمیان کی غربت، استحصال، ظلم وزیادتی کی ایسی سچی تصویر کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں کہ سماج کا منظر نامہ شاعری بن کر ہمیں دعوت فکر دیتا ہے۔ ان کی شاعری رنگین جذبات کی ترجمانی نہیں بلکہ سماج کے چہرے پر جو خراشیں ہی ان کی ترجمان بن کر سامنے آتی ہے۔'' (دھوپ کا مسافر، داہنا فلیپ)

خوف طوالت درپیش ہے اس وجہ سے میں ان کے کچھ اشعار پیش کر کے اپنی بات ختم کروں گا۔

یہ کبھی مت دیکھیے کہ کس نے کیا تنقید کی
خامُشی سے صرف اپنا کام کرتے جائیے

ترے ساتھ رہ کے بھی کیا ملا وہی روز و شب کی اذیتیں
میں غموں کا ایسا لفاف ہوں جو پڑا ہوا ہے کُھلا نہیں

میری خود دار طبیعت کا تقاضا ہے الگ
کیسے یہ سر کسی کم ظرف کا شانہ ڈھونڈے

ذرا سی چوک پہ ساری روایت چھین لیتی ہے
نئی تہذیب بچوں سے شرافت چھین لیتی ہے

بغیر رب کی مشیت کے کچھ نہیں ہوتا
وہ میرے قتل کی سازش فضول کرتا ہے

کوئی زخموں کی کہانی تو نہیں سنتا ہے
میری شہرت پہ مگر سب کی نظر ہوتی ہے

مذکورہ اشعار کے علاوہ ایسے ڈھیروں اشعار ان کے مجموعۂ کلام میں موجود ہیں۔ جنھیں پڑھ کر ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ حاصلِ گفتگو یہ کہ ان کی ہر غزل ہی نہیں بلکہ ہر شعر ان کا بولتا ہوا نظر آتا ہے اور اس بولی میں بڑی حلاوت، نفاست، طہارت، تازگی، تابندگی اور پائندگی شدت سے پائی جاتی ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

Md. Imamuddin Imam
S/o. Md. Salahuddin
Vill. Damodari (Panapur Haveli)
P.o. Bishundattpur
Muzaffarpur - 843 113

فارم IV دیکھئے ضابطہ نمبر : 8

سہ ماہی ''ساغرِ اَدب'' (اُردو) مظفرپور (بہار)

Quarterly SAGHAR-E-ADAB (URDU) MUZAFFARPUR (BIHAR)

۱ مقامِ اشاعت : مظفرپور (بہار) — Muzaffarpur (Bihar)

۲ وقفۂ اشاعت : سہ ماہی — Quarterly

۳ طابع کا نام : **کہکشاں یاسمین** — Kahkashan Yasmin

قومیت : ہندوستانی — Indian

پتہ : Husaina House, Zakaria Colony, Moh.-Sadpura, P.O. - Ramna Muzaffarpur - 842 002 (Bihar)

۴ مقامِ طباعت : انڈین آرٹس آفسیٹ پریس، پٹنہ

۵ پبلشر کا نام : کہکشاں یاسمین — Kahkashan Yasmin

قومیت : ہندوستانی — Indian

پتہ : حُسینا ہاؤس، زکریا کالونی، محلّہ سعد پورہ، پوسٹ۔ رَمنہ، مظفرپور (بہار)

۶ ایڈیٹر (اعزازی) : **ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر** — Dr. Syed Alay Zafar

قومیت : ہندوستانی — Indian

پتہ : Associate Professor, University Deptt. of Urdu B.R.A.Bihar University, Muzaffarpur (Bihar)

میں کہکشاں یاسمین، ایڈیٹر پرنٹر، پبلشر و پروپرائٹریس سہ ماہی ''ساغرِ اَدب'' یہ اعلان کرتی ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق صحیح اور درست ہیں۔

۵؍فروری ۲۰۲۰ء   کہکشاں یاسمین

''ساغرِ اَدبْ'' کا تیسرا شمارہ

آپ کی نظر میں

☆ عزیز گرامی قدر پروفیسر سیّد آلِ ظفر صاحب

سلامت رہیے۔

''ساغرِ اَدبْ'' کا تیسرا شمارہ نظر نواز ہوا۔ آپ کا اِدارتی سفر خوب سے خوب تر کی طرف جاری ہے۔ ربِ تبارک وتعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ آپ کا یہ سفر کامیابی کے بعد کامرانی کی طرف جاری رہے۔ شعر وادب کی پیش رفت میں کوئی منزلِ آخر نہیں ہوتی۔ اِس بار تو نئے موضوعات اور آپ کی بزم میں رونق بڑھانے والے نئے، آپ کی بزم کے اعتبار سے نئے، لیکن پُرانے اہلِ قلم کی شرکت وشمولیت نے ''ساغرِ اَدبْ'' کو وقیع وگراں مایہ بنا دیا ہے۔ قاضی عبدالودود پر ڈاکٹر سیّد شاہد اقبال اور کلیم الدین احمد پر ڈاکٹر تسنیم فاطمہ کے مضامین اچھی چیزیں ہیں۔ قاضی صاحب کے متعلق جو کچھ سپردِ قلم کیا گیا ہے، وہ واقعتاً ویسے ہی تھے۔ مضمون بہت عمدہ ہے اور سات صفحات میں موضوع کا احاطہ کرنے کی کامیاب کوشش ہے۔ البتہ ڈاکٹر تسنیم فاطمہ کا مضمون اچھا ہونے کے باوجود کچھ اور تفصیل چاہتا تھا۔ کلیم الدین احمد جیسی شخصیت پر جو لکھا گیا ہے اس سے، موضوع کا حق ادا نہیں ہوا ہے۔ پھر بھی اچھا مضمون ہے۔ اور مَیں دیگر اچھے مضامین سے پہلے ان دونوں عنوانات کا ذکر اس لئے کر رہا ہوں کہ ہماری ریاست بہار کے عہدِ زرّیں کے یہ دو اہم ستون تھے۔ جو بالترتیب تحقیق اور تنقید کی الگ الگ صنفوں میں اِستناد وامتیاز کے مراتب پر فائز تھے۔ بلقیس فاطمہ، شین مظفر پوری کے حوالے سے کسی فرضی شخصیت کا نام تھا یا کچھ اور بات تھی، اسے ''پردۂ زنگاری'' کے معشوق سے تعبیر کر کے پروفیسر منظر اعجاز نے بے حد معلوماتی اور وقیع مضمون لکھ کر شمارے کی شان بڑھائی ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی پر ڈاکٹر عبدالوحید کا مضمون، ٹیپو سلطان کو علامہ اقبالؔ کا خراجِ عقیدت کے عنوان سے ڈاکٹر غالب مصطفےٰ صدیقی کا مضمون بھی بہت عمدہ ہے۔ لیکن ٹیپو سلطان کے مقبرے پر جو فارسی قطعہ تاریخ کندہ ہے اس کے بارے میں بھی اظہار خیال کرنا چاہئے تھا کہ یہ اشعار کس کے ہیں۔ جس کا آخری مصرع مجھے یاد ہے ع

نورِ اِسلام و دیں ز دنیا رفت

بہرصورت مضامین کا تنوع اِن مذکورہ عنوانات سے بھی ظاہر ہے اور دیگر مضامین سے بھی جن کا حوالہ دینا اپنے تاثراتی مضمون کو طول دینا ہے۔

شاد عارفی، غیاث احمد گدی، اردو ناول اور شفق، پریم چند کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ، پرویز شاہدی کی غزلیہ شاعری، ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی کا نظریۂ تحقیق، سوداؔ کی قصیدہ نگاری اور منٹو کی افسانہ نگاری، فنونِ لطیفہ کے مظاہر اور عورت اِن سب کا تذکرہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ جو عنوانات میں لکھ رہا ہوں اِن میں کوئی پسند یا ترجیح کی ترتیب نہیں ہے۔ عجلت میں وقت کی کمی کے باعث ممکن ہے کہ جن ناموں کو پہلے لینا چاہئے تھا وہ کہیں بعد میں آ گئے ہوں۔ مقصود

صرف یہ ہے کہ یہ پورا شمارہ فارسی کے اس شعر کا مظہر ہے ؎

ز فرق تا بقدم ہر کُجا کہ مَیں نِگرم
کرشمۂ دامنِ دل می کشد کہ جاں ایں جاست

مکتوبات کے کالم میں جن دوستوں اور عزیزوں نے خاکسار کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا ہے، مَیں ان کا ممنون ہوں۔ ایک بات اپنے مکتوب کے بارے میں پھر کہتا ہوں کہ سَہو کا نمونہ اسی سہو کی نشاندہی کے دوران سامنے آ گیا ہے۔ مَیں نے دو ترکیبیں دین ودنیا اور دین وَ دنیا لکھ کر بتایا تھا کہ ایک عربی تلفظ ہے اور ایک اردو اور فارسی۔ شاید مَیں نے یہ غلط لکھ دیا تھا کہ واو عطف ضرورتِ شعری سے ضم ہو جاتا ہے، بلکہ نہیں، وہ تو اردو اور فارسی میں ہمیشہ ضم ہو جاتا ہے۔ ضرورتِ شعری کے تحت تو مولانا حالیؔ کے مسدس کا ایک شعر بلکہ ایک مصرع اِس پر شاہد عادل ہے۔ آپ پورا بند یاد کیجئے ؎

کسی نے یہ سقراط سے جا کے پوچھا
کہ نعمت ہے دنیا میں سب سے بڑی کیا
کہا عقل جس سے ملے دین و دنیا
کہا گر نہ ہو اس میں سے بہرہ
کہا اہم پھر سب سے علم و ہنر ہے
کہ جو باعثِ افتخار بشر ہے

دعا گو

نجم الہدیٰ، مظفر پور

☆ عزیز گرامی سلام ورحمت

''ساغرِ ادبْ'' کا شمارہ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۹ء موصول ہوا۔ شکریہ۔ حسب توقع بہت ہی پُر مغز اور گراں قدر ہے۔ آپ بڑی آسانی سے اچھے اچھے مضامین حاصل کر لیتے ہیں اور قلم کار حضرات بھی آپ کا تعاون کر رہے ہیں۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے۔ مبارک باد۔ پروفیسر منظر اعجاز کے مضمون کا عنوان ''بلقیس فاطمہ کے پردۂ زرنگاری کا معشوق'' میں کمپوزنگ کی غلطی ہوگئی۔ لفظ ''زنگاری'' صحیح ہے ''زرنگاری'' نہیں۔ ریسرچ اسکالرز کی سرپرستی آپ جس محبت اور فراخدلی سے کر رہے ہیں اردو کے مُدیرانِ رسائل میں یہ آپ کا امتیازی وصف ہے۔ ع

ترے جنوں کا خدا اصلہ دراز کرے

پروفیسر فاروق احمد صدیقی، مظفر پور

☆ دربھنگہ آلِ ظفر صاحب!

۳۰/جنوری ۲۰۲۰ء عزیز محترم السلام علیکم

''ساغرِ ادبْ'' کے شمارہ ۳/ سے جُرعہ کشی کا موقع ملا۔ سبحان اللہ۔ ظفر مندی تو آپ کے نام کا حصہ ہے۔ مبارک ہو۔ جمالیاتی صحافت کا بہتر نمونہ ہے۔ سلیقہ، شعور، ڈھب، ڈھنگ اور لوٗر جیسے مترادفات تو آپ ہی کے نام محفوظ ہیں۔ معنوی حیثیت سے بھی آپ کی یہ کاوِشِ نقشِ احسن ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، میں اپنی آنکھوں سے پوری طرح

ISSN. 2582 - 3612

کام لینے سے قاصر ہوں۔ ابتدائی تین مقالے پڑھ سکا ہوں۔ تینوں ہی بڑے معلوماتی، وقیع اور مفید مقالے ہیں۔ میری طرف سے پروفیسر منظر اعجاز، ڈاکٹر سیّد احمد قادری اور ڈاکٹر سیّد شاہد اقبال صاحبان کو مبارک بادیاں۔ تأثراتِ مختصر کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

آپ کا
طرزیؔ، دربھنگہ

☆ کرم فرما آلِ ظفر صاحب!

اکتالیس مضامین کا تیسرا جاذب نظر شمارہ بصیرت افروزی کی دعوت دیتا ہے۔ مختلف خیال رکھنے والوں کے یہ تنقیدی مضامین لفظ و معنی کو متعدد قائم بالذات حیثیت عطا کرتے ہیں۔ ان مضامین میں شخصیت کی آمیزش ہے اور ادبی و تنقیدی اظہار کی قوت بھی ہے۔ اگر چہ بعض مضامین تفصیل چاہتے ہیں لیکن وہ بھی موجودگی کو نشان زد کرتے ہیں۔ ہر شمارہ ۲۰۸ صفحات میں نکالنا آپ کا فعال عمل ہے جس کی داد دینی ہی پڑتی ہے۔ اردو زبان کے تحفظ و بقا کے لئے یہ ایک طرح سے تشکیل و تعمیر ہے جس میں اساسِ ادب کا جذبہ موجزن ہے۔ مبارک باد

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

☆ محترمی سیّد آلِ ظفر صاحب! سلام مسنون

اللہ کرے، ہم دونوں بخیر رہیں۔ آمین

''ساغرِ ادبْ'' کا تیسرا شمارہ ڈاکٹر جلال اصغر فریدیؔ کے توسط سے موصول ہوا۔ شمارہ اچھا ہے۔ اللہ آپ کی محنت کو کامیاب کرے اور میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔ ہوسکا تو آپ کے لئے بھی کام کروں گا۔

آپ کا خیر اندیش
پروفیسر خورشید سمیع، مظفر پور

☆ سلام و مسنون

سہ ماہی رسالہ ''ساغرِ ادبْ'' موصول ہوا

ماشاء اللہ ٹائٹل سے لے کر سبھی مضامین بہتر ہیں۔ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ گذشتہ شمارے کے مقابلے میں یہ شمارہ اور بہتر ہے۔ مضمون نگار کے کئی مضامین بے حد پسند آئے۔ یہ آپ کی ہنرمندی کی دلیل ہے۔ ابھی تمام مضامین کو میں پڑھ نہیں پائی ہوں۔ جہاں دیکھا ہے وہ بہت خوب ہیں۔ اُمید ہے کہ آئندہ بھی اس معیار کو برقرار رکھا جائے گا۔

نیک خواہشات کے ساتھ
پروفیسر قمر جہاں، بھاگلپور

☆ جناب سیّد آلِ ظفر صاحب

تسلیمات!

ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ کے رسالہ ''ساغرِ ادبْ'' کا تیسرا شمارہ موصول ہوا ہے اور میں نے اس خوبصورت شمارہ کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا ہے، متنوع شمارہ ہے۔ آپ نے میرا خط بھی شاملِ اشاعت کیا ہے۔ خطوط کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا

ہے کہ آپ کا رسالہ مقبول و معروف ہو رہا ہے اور لوگوں کی پذیرائی اسے مل رہی ہے۔ آپ کے اداریہ نے متاثر کیا۔ فیض احمد فیضؔ کا حوالہ بھی خوب دیا آپ نے۔ اس مرتبہ آپ نے ریسرچ اسکالرز کے ڈھیر سارے مضامین شامل کئے ہیں۔ کاش آپ کے رسالہ میں شعری حصہ بھی شامل ہوتا اور کتابوں پر تبصرے بھی شائع کئے جاتے۔ یہ میری خواہش ہے۔ آپ سے شکایت یا مشورہ نہیں۔ میری بہت بہت مبارک باد قبول فرمائیں۔

آپ کا اپنا
ڈاکٹر جمال اُویسی، دربھنگہ

☆ بھائی ڈاکٹر آلِ ظفر!

ساغرِ ادبْ کا تیسرا شمارہ اپنی تمام آب و تاب کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ بلا شبہ آپ کا جرنل ادب کے باطنی صلاحیت کو پیش کر کے ایک اہم مقام فراہم کرنے کی غیر معمولی ذمے داری ادا کر رہا ہے۔

مشمولات کے کچھ مضامین کافی کارآمد ہیں۔ ڈاکٹر سیّد احمد قادری اور پروفیسر منظر اعجاز کے مضامین کے ساتھ تاثرات بھی اہمیتوں کے حامل ہیں۔ میری دعا ہے کہ آپ کا جرنل اسی طرح ترقی پذیر رہے۔

نیک تمنّاؤ کے ساتھ، آپ کا
ڈاکٹر مظہر کبریا، چھپرہ

☆ محترمی جناب مدیر صاحب

رسالہ سہ ماہی ''ساغرِ ادبْ'' مظفر پور تسلیمات!

آپ موصوف کا ارسال کردہ رسالہ ''ساغرِ ادبْ'' کے باہم مورخہ یکم جنوری ۲۰۲۰ء کا نوازش نامہ موصول ہوا۔ بلا شبہ معاصر دور میں کسی اردو کا رسالہ جاری رکھنا پہاڑوں کو کاٹ کر جوئے شیر نکالنے سے کم نہیں ہے۔ عہد حاضر میں اس کی شدید ضرورت بھی ہے کیونکہ نسلِ نَو سے زبان اُردو بہت دور ہوتی جارہی ہے۔ آپ کی عظیم کاوش کی ستائش و پذیرائی اخلاقی فرض ہے۔

دعا گو
سیّد محمد شرف، بہار شریف

☆ گرامی قدر ایڈیٹر پروفیسر سیّد آلِ ظفر صاحب، تسلیمات!

''ساغرِ ادبْ'' کا تیسرا تازہ شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ رسالہ نے محدود وقت و وسائل کے باوجود اردو کے جدید رسالوں میں اپنی ایک الگ پہچان بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جہاں ایک طرف سنجیدہ تحقیق و تنقید اور شعر و ادب کو ملحوظ رکھا گیا ہے وہیں دوسری طرف ریسرچ اسکالرز کی ذہنی و علمی آبیاری کے لئے ''ساغرِ ادبْ'' نے خصوصی گوشہ مختص کر کے ایک نئی تاریخ رقم کی ہے۔

میں دل کی گہرائی سے رسالہ کی لمبی عمر کے لئے دعا گو ہوں۔ مشہور و معروف ادیب پروفیسر سیّد آلِ ظفر کی نگرانی نے ''ساغرِ ادبْ'' کو ایک معیاری اور باوقار رسالہ بنانے میں اپنا خونِ جگر صرف کیا ہے۔ میں ذاتی طور پر ان سے واقف ہوں۔

ISSN. 2582 - 3612

رسالے کی جاذبیت، کاغذ، کم قیمت بھی اس بات کی ضمانت وعلامت ہے کہ اس دور کشاکش میں اتنا خوبصورت ودلکش رسالہ نکالنا بہت بڑی بات ہے۔

اُردو کا خادم

ڈاکٹر جلال اصغر فریدی، مظفر پور

☆ اُمید کہ سہ ماہی ساغرِ ادب کے اراکین مع الخیر ہونگے

ڈاکٹر سیّد محمد حبّان الحق کے معرفت آپ کا عنایت نامہ ''ساغر ادب'' شمارہ نمبر۳ ملا۔ شکریہ۔ سہ ماہی ''ساغرِ ادب'' ہر اعتبار سے کافی دلکش اور دیدہ زیب ہی نہیں ہے بلکہ سنجیدہ ادب ومطالعہ کا متقاضی ہے۔ اراکین ساغرِ ادب کی ہمت اور جذبہ وخلوص کو میرا سلام !

آپ نے نئے اور پُرانے لکھنے والوں کو ''ساغرِ ادب'' کا حصہ بنایا جو اردو ادب کی ترویج واشاعت میں خوش آئند بات ہے۔ مستزاد یہ کہ ساغرِ ادب میں ریسرچ اسکالرز کو بھی شامل اشاعت کر کے آپ نے ادب میں تخلیقیت کی راہ ہموار کر دی ہے، جو آپ کی مدیرانہ صلاحیت، فہم وادراک اور مطالعہ ادب کا خاصہ لگتا ہے۔ مادّیت پرستی اور معاشی و اقتصادی بحران کے اس دور میں کسی ادبی رسالے کا ایک خاص سج دھج کے ساتھ متواتر منظر عام پر آنا بڑے ہی دل گردے اور جگر کاوی کا عمل ہے۔ خدا آپ کے اور ''ساغرِ ادب'' کے اراکین کے حوصلوں کو برقرار اور ثابت قدم رکھے۔ اس امید کہ ساتھ کے ساغرِ ادب پابندی سے نکلتا رہے اور ہر شمارہ قارئین کی آنکھوں کو خیرہ کرتا رہے۔ آمین۔

میری باتوں سے آپ متفق ہوں یا نہ ہوں پھر بھی میں کہنا چاہوں گا کہ ''ساغرِ ادب'' کا منشا کے ساتھ ہر شمارہ میں ایک مضمون ''اردو ادب ماضی، حال اور مستقبل کے آئینے میں'' ہو تو نئے لکھنے والوں کو اردو شعر وادب کی راہ ہموار کرنے میں بہت آسانی ہوگی۔ ماضی میں شعر وادب پر لکھے گئے مضامین کا کچھ اقتباس بھی دینے کی زحمت گوارہ کریں ساتھ ہی آپ اپنے اداریہ میں سبھی تخلیق کار کی تخلیقی بصیرت و بصارت پر چند جملوں میں بے خوف تبصرہ کریں۔ اداریہ کا بھرپور حق ادا ہوگا۔

اردو کی بگڑتی ہوئی حالت اور تحفّظ وبقا کا رونا رونے سے بہتر ہے کہ ہم اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دینے پر زور دیں اور اردو کے اخبارات ورسائل مانگ کر پڑھنے کے بجائے خرید کر پڑھیں تا کہ اردو اخبارات ورسائل نکالنے والوں کی مالی معاونت ہو سکے اور اس طرح اردو کا مستقبل بہتر ہو۔

کسی بھی رسالہ میں لکھے گئے کچھ مضامین پر اپنی رائے دینا اور باقی مضامین کو سرے سے چھوڑ دینا مَیں دل شکنی کے مترادف مانتا ہوں۔ میرا ماننا ہے کہ کوئی بھی فنکار اپنی رسوائی کبھی نہیں چاہتا بلکہ وہ خوب سے خوب تر کی تلاش وجستجو پیش کرنا اپنا ادبی منصب سمجھتا ہے۔ صحیح راہ دکھانے والوں کو تسلیم بھی کرتا ہے۔ انسان کی کوشش چھوٹی ہو یا بڑی بہر حال محنت کا ہی حصہ ہوتی ہے۔ ادب میں ایسی کوشش کرنے والا مبارکباد کا مستحق ہے۔ اس تناظر میں ''ساغرِ ادب'' کے سبھی تخلیق کار بہتر مستقبل کا پیش خیمہ ہیں ؎

ادب کے ساگر میں ہے ساغرِ ادب روشن
خدا کرے کہ جنونِ ظفرؔ کمال کرے

نوٹ ۱؎ سیّد آلِ ظفر، مدیر اعزازی

خیر اندیش

خلیل الرحمٰن قاسمی، مظفر پور

☆ مکرمی جناب آلِ ظفر صاحب۔۔۔السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہٗ

''ساغرِ ادبُ'' کا تیسرا سہ ماہی شمارہ (اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۹ء) موصول ہوا۔ یقین جانئے بے ساختہ زبان سے نکلنے والا میری جانب سے مبارک باد قبول کرنے کی زحمت گوارہ کریں۔ یہ شمارہ جس میں حمد اور نعت پاک کے بعد تمام رشحات قلم معیاری ہیں، قابلِ تعریف ہیں۔ ''ساغرِ ادب'' کے تازہ شماروں میں تمام نثری وشعری تخلیقات نہ صرف قابلِ ذکر ہیں بلکہ اردو صحافت کی تاریخ میں قیمتی سرمایہ اور آنے والی نسلوں کے لئے مشعلِ راہ بھی۔

اللہ کرے زور قلم اور صحافت اور زیادہ

محفوظ عارفؔ، مظفر پور

☆ کرم فرما ڈاکٹر سید آلِ ظفر صاحب

السلام علیکم

آپ کا سہ ماہی رسالہ ''ساغر ادب'' اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۹ء ملا۔ اس کا میں احسان مند ہوں۔ آپ نے بڑی محنت اور جانفشانی سے ایک بڑا ادبی کام کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ رسالہ کی ابتدا آپ نے حمد ونعت سے کی ہے۔ حمد ونعت کے اشعار کافی متاثر کن ہیں۔ پھر اس رسالے میں ہندوستان کے تمام ادبی ذوق رکھنے والوں کے مضامین شائع کئے ہیں۔ میں نے صرف چند مضامین کو چھوڑ کر تمام کو پڑھ لیا ہے۔ جن میں سب سے پہلے پروفیسر عبدالمنان طرزی صاحب کا منظوم تاثر ہے۔ منظوم تاثر کا ایک شعر نے مجھے کافی متاثر کیا ہے جسے میں یہاں درج کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں ؎

ساغرِ ادب کا بادہ خمار آگیں
محبوب کا سراپا جیسے قرار آگیں

ڈاکٹر سید احمد قادری، ڈاکٹر احسان عالم، ڈاکٹر سید شاہد اقبال، ڈاکٹر غالب مصطفٰی صدیقی، ڈاکٹر محمد سمیع الدین، ڈاکٹر وصی احمد شمشاد اور ڈاکٹر بدر محمدی کے مضامین توجہ طلب ہیں۔ ان حضرات کے مضامین نے مجھے کافی متاثر کیا۔

رسالہ کے آخری حصہ میں شامل دانشوروں کے تاثرات بھی عمدہ اور معلوم افزا ہیں۔

اس دور میں جبکہ اردو اخبارات کو پڑھنا لوگ کراہیت سمجھتے ہیں آپ نے اردو رسالہ کی اشاعت کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کار خیر میں کامیابی عطا فرمائے۔

فقط والسلام

ڈاکٹر ریحان احمد قادری، دربھنگہ

ISSN. 2582 - 3612